نام کتاب : خطرات کے بادل
مؤلف : سیدرکن الدین اصدق چشتی
طباعت اوّل : ۲۰۱۲ء
تعداد : ۱۱۰۰ (گیارہ سو)
تزئین : محمد ابوطلحہ، دانشکدہ، دریاپور، سبزی باغ، پٹنہ۔۴
کمپوزنگ : محمد نظام الدین اصدقی عظیم آبادی
ناشر : مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف، پکی تالاب، بہار شریف۔۸۰۳۱۰۱(نالندہ)
صفحات : ۴۳۲
قیمت : -/300 (تین سو روپئے)

ملنے کے پتے :

سیدشاہ رکن الدین اصدق چشتی

آستانہ چشتی چمن پیر بیگھہ شریف، پوسٹ رسیسہ ضلع نالندہ (بہار)

سیدنورالدین اصدق مصباحی

مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف، محلّہ پکی تالاب، بہار شریف، نالندہ (بہار)

سیدسیف الدین اصدق فیض

ڈائرکٹر تحریک پیغام اسلام امام حسینی مسجد، ذاکرنگر جمشید پور

مکتبہ نعیمیہ، ۴۲۳-مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔۶

مولاناضمیرالدین اصدقی

مدرسہ اصدقیہ مخدوم شعیب۔محلّہ کریم باغ، اسٹیشن روڈ، شیخ پورہ (بہار)

انتساب

جماعت اہل سنت کی اس نامور شخصیت کے نام

جس کا ستارۂ اقبال

نصف صدی تک افق ہند پر جگمگا رہا تھا

جس کے دم قدم سے

سیاسی محاذ پر بھی اہل سنت کو تقویت حاصل تھی

یعنی

قائد ملت حضرت مولانا سید شاہ اسرار الحق شاہجہاں پوری رحمۃ اللہ علیہ

سابق صدر آل انڈیا مسلم متحدہ محاذ، کوٹہ راجستھان

جن کی رہنمائی نے

مجھے حضور حافظ ملت کی آغوش تربیت میں پہونچایا

اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر ہمیشہ رحمتوں کے پھول برسائے

العبدالراجی

سیدرکن الدین اصدق چشتی غفرلہٗ

یکم رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ

فہرست

حصہ اول —— دیباچہ

باب اوّل ——

باب دوم ——

خاتمہ —— ہمارے چند معروضات

حصہ دوم ——

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اُفق ہندو پاک پر اٹھنے والے بلاخیز طوفانوں کے سنگین
نتائج سے خبر دار کرنے والی ایک تہلکہ خیز کتاب

خطرات کے بادل

بادل گرجے بجلی تڑپے، دھک سے کلیجہ ہو جائے
بن میں گھٹا کی بھیانک صورت، کیسی کالی کالی ہے

از: سید رکن الدین اصدق چشتی

ناشر: مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف
حبیب خان پکی تالاب، بہار شریف، نالندہ (بہار)

فرمان نبوی

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم يكون فى آخر الزمان دجالون كذابون ياتونكم من الاحاديث بما لم تسمعوا انتم ولا آ باء كم فا يا كم و ايّا هم لا َيضلّو نكم ولا يفتنو نكم .

(رواه مسلم)

ترجمہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے رویت ہے، انہوں نے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے کہ آخر زمانے میں کچھ جھوٹے دجال پیدا ہونگے۔ وہ تمہارے سامنے حدیثیں پیش کریں گے جنہیں نہ تم نے سنی ہوں گی اور نہ تمہارے باپ دادا نے سنی ہوں گی۔ لہٰذا تم ان سے بچو اور ان کو خود سے دور رکھو۔ تاکہ وہ تمہیں گمراہ نہ کرسکیں اور تم کو فتنے میں مبتلا نہ کردیں۔

اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں نقل فرمایا ہے۔

ارشاد رسول

عن عبد الله بن عمر قال قال رسو ل الله صلى الله عليه وسلم ليا تين على امتى كما اتىٰ علىٰ بنى اسرائيل خذوا ن لنعل بالنعل، حتىٰ ان كان منهم من اتٰى امه علا نيةً ، لكان فى امتى من يصنع ذالک و ان بنى اسرائيل تفرقت على ثنتين و سبعين ملةً و تفترق امتى علىٰ ثلٰثٍ و سبعين ملةً كلهم فى النار الا ملةً واحدةً قالوا من هو يا رسول الله قال ما انا عليه و اصحابى . (رواه الترمذى)

ترجمہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بے شک ایسا ہی زمانہ ہماری امت پر بھی آئے گا۔ جیسا زمانہ بنی اسرائیل پر آچکا ہے۔ اس وقت تم آپس میں ملکر رہنا یہاں تک کہ اگر ان میں کوئی اپنی ماں کے ساتھ کھلی بدسلوکی کرچکا ہے تو بلاشبہ میری امت کے لوگ بھی ایسا ہی کریں گے۔ بے شک بنی اسرائیل بہتّر فرقوں میں بٹ گئے اور ہماری امت بھی تہتّر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ سوائے ایک کے کل جہنمی ہوجائے گی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا، یا رسول اللہ! ناجی فرقہ کون سا ہوگا؟ آقا نے ارشاد فرمایا میرے اور میرے اصحاب کے طریقے پر چلنے والا فرقہ نجات یافتہ ہوگا۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے اپنی صحیح میں نقل فرمایا

مصنف کا ایک مختصر تعارف

سید سیف الدین اصدق چشتی
ڈائرکٹر —— تحریک پیغام اسلام، جمشید پور

اللہ ورسول کے احکام وفرامین، محبت واطاعت اور پیروی وفرماں برداری کی طرف بلانے اور پہنچانے کو ”دعوت وتبلیغ“ کہتے ہیں۔ جس کا حکم قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ صوفیاے کاملین، علماے ربانین اور راسخ الاعتقاد مومنین کی جماعت اس فریضے کو ہر دور میں اپنے زمانے کے اعتبار سے انجام دیتی رہی ہے۔

ابی وشیخی حضرت علامہ الحاج سید شاہ رکن الدین اصدق چشتی، قادری قبلہ دامت برکاتہم العالیہ کی زیر نظر تحریر بھی اسی فریضے کا ایک حصہ ہے۔ جس میں اللہ ورسول کا حکم، صحابہ کے طریقے اور سلف صالحین کی راہ دکھا کر ان کے نقش قدم پر چلنے، بیدار کرنے اور جھنجھوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قبلہ حضور والد گرامی کی شخصیت اہل علم کے نزدیک محتاج تعارف نہیں۔ آپ قطب عالم حضور سیدنا خواجہ شاہ قیام اصدق الصادقی فخری نظامی چشتی (المتوفی: ۱۳۰۱ھ / ۱۸۷۴ء) کے عظیم علمی وروحانی خانوادے میں ۱۹۴۳ء بمقام چشتی چمن پیر بیگھ شریف نالندہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۰ء تک مدرسہ انوار العلوم گیا میں متوسطات تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۱ء میں مبارک پور پہنچ کر حافظ ملت حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث مبارک پوری علیہ الرحمہ کے زمرۂ خاص میں شامل ہوئے اور شرح جامی سے دورۂ حدیث تک تعلیم مکمل کر کے ۱۹۶۶ء میں سند فراغت سے نوازے گیے۔
آپ کی شخصیت گونا گوں اوصاف عالیہ کی حامل ہے۔ ایک باوقار عالم اور خطیب اسلام کی حیثیت سے ہندوستان کے طول وعرض میں برسوں اپنی معرکۂ آرا تقریروں سے امت کی زلف برہم سنوارنے میں کوشاں رہے۔ تحائف اصدقیہ، بے نقاب چہرے، تاریخ ہجرت، خطرات کے بادل، حیات اصدق، آئینہ مخدوم جہاں وغیرہ جیسی مقبول عام وخاص کتابوں کے مصنف، ان گنت علمی، فکری اور اصلاحی مضامین کے محرر، ماضی میں پندرہ روزہ اخبار ”رفاقت پٹنہ“ کے ایڈیٹر اور ۱۹۹۵ء سے نکلنے والے ماہنامہ جام شہود کلکتہ اور اب شہر مخدوم جہاں بہار شریف سے نکلنے والے اسی ”سہ ماہی“ رسالے کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ مدرسہ شرفیہ رفیع گنج اورنگ آباد، ادارۂ شرعیہ پٹنہ، مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف بہار شریف، مدرسہ اصدقیہ شہودیہ پیر بیگھ شریف نالندہ، مدرسہ اصدقیہ مخدوم شعیب شیخ پورہ کے علاوہ متعدد مساجد، مدارس اور تنظیموں کے فروغ وارتقا میں ان کا خون جگر شامل ہے اور وہ ان کی دینی، ملی اور جماعتی سرگرمیوں کے گواہ ہیں۔

ان سب کے ساتھ اپنے بزرگوں اور خانقاہی روایات کے امین اور ملک کے مختلف صوبوں میں پھیلے ہوئے ہزار ہا افراد کے مرجع عقیدت اور شیخ طریقت ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو قطعی مبالغہ نہ ہوگا کہ ”خانقاہ اصدقیہ“ سے متعارف ایک تہائی آبادی

اسے آپ کی ذات وخدمات کے توسط سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ جہد مسلسل اور عمل پیہم آپ کی زندگی کا خاصہ ہے۔ دین وسنیت اور قوم وملت کے فلاح و بہبود کے لیے آپ ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں۔ ہدایت ورہنمائی کے باب میں جہاں آپ کی تحریر گلاب کی پنکھڑی ہے وہیں اصلاح مفاسد میں آپ کا قلم نشتر کی حیثیت رکھتا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی حقیقت کی عکاس ہے۔ حالیہ چند سالوں سے جو ملک کا حال ہوتا جا رہا ہے اور نئی نسل جس فکری بے راہ روی کا شکار ہو رہی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی افادیت کے پیش نظر کافی دنوں سے اس کی دوبارہ اشاعت کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کیوں کہ آپ کی تحریر میں معنویت کے ساتھ ساتھ جو روانی، سلاست اور حسن وکشش ہے وہ خال خال اہل قلم کے یہاں نظر آتی ہے۔ اکابرین جہاں اس کے معترف ہیں وہیں اصاغرین مداح نظر آتے ہیں۔

بحر العلوم حضرت مفتی عبد المنان صاحب اعظمی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں۔:

''برسوں پہلے ان کی ایک کتاب ''تاریخ ہجرت'' جو انھوں نے مجھے دی تھی، پڑھنے کے بعد زبان وبیان کی خوبی کے ساتھ، جس بات نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا وہ مفہوم وعبارت کی باہمی مناسبت تھی جس کو بلاغت کہا جاتا ہے۔ اور یہ کتاب ''خطرات کے بادل'' تو ڈاکٹر اقبال کی تصویر درد ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہماری قوم کی بیماری، احساس درد کی منزل سے کوسوں دور بڑھ گئی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے

بھی تو نہیں رہا جا سکتا۔ حضرت حافظ شیرازی کہتے ہیں۔

نورا تیز تر می زن، چوں ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں، چوں محمل را گراں بینی

(رائے گرامی خطرات کے بادل)

معروف ادیب، شاعر اور صاحب خانقاہ حضرت پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برق دانا پوری لکھتے ہیں:

''مولانا رکن الدین اصدق ایک صوفی منش، ولی نژاد، عالم دین اور مقبول ومعروف مقرر شیریں بیان ہیں۔ ایسا کم دیکھا گیا ہے کہ کوئی شخص بیک وقت تحریر وتقریر دونوں پر یکساں قدرت رکھتا ہو۔ موصوف کو اللہ نے یہ کمال دیا ہے کہ وہ تاریخی واقعات سیر ومغازی کے صحیح اور مستند ماخذ کی روشنی میں دلچسپ و دل پذیر انداز میں لکھتے اور بیان فرماتے ہیں۔

دل چو صافی شد حقیقت را شناسا می شود
از صفا آئینہ منظور نظرہا می شود!

مئے توحید کی سرمستی اور حب رسول وآل رسول کی سرشاری جو انھیں ورثے میں ملی ہے، ہر قدم اشہب قلم کو آگہی وباخبری کے ساتھ مہمیز کرتی ہے۔ مطالعہ کی وسعت، فکر ونظر کی رفعت، تحقیق وتنقیح کی قدرت، ذہن رسا کی جودت، جذب دروں

کی حدّت، حق گوئی وحق شناسی کی فطرت، بطلان باطل کی شدت،
عرفانی کیفیت، روحانی حلاوت اور زبان وبیان واسلوب وادا کی
جدت تاریخی ادب و احترام کے ساتھ دیکھنی ہوتو ''تاریخ
ہجرت'' کا مطالعہ کریں۔ یہاں پر میری اس مقفیٰ عبارت کو شاعری
کا نام نہ دیں بلکہ اس تاریخی کتاب کی عبارت ومشمولات کو اپنی
میزان علم وعقل پر تولیں اور دیکھیں کہ میرے دعوے کی کیسی مبرہن
دلیلیں سامنے آتی ہیں''۔ (مقدمہ تاریخ ہجرت)

ماہر مخدومیات حضرت مولانا سید شاہ علی ارشد بلخی الفردوسی بہار شریف لکھتے ہیں:

''حضرت (خواجہ قیام اصدق چشتی) پر یہ کام تو بہت
پہلے ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ''قرعۂ فال'' تو اس شخصیت کے نام نکلنا
تھا جو بیک وقت عالم دین بھی ہے اور صوفی بھی۔ دین حق کا
محافظ بھی ہے اور راہ حق کا مجاہد بھی۔ صاحب عزیمت بھی ہے اور
رہبر طریقت بھی۔ جو ہوسنا کیوں کی وادی سے نکل کر جام
شریعت اور سندان عشق سے کھیلنا جانتا ہے۔ میری مراد اس
کتاب کے مؤلف اخی محترم حضرت مولانا سید شاہ رکن الدین
اصدق چشتی صاحب زاد اللہ محبتہٗ سے ہے۔ جو خانوادۂ
اصدقیہ کے چشم وچراغ اور ''چشتی چمن'' کے گل سرسبد ہیں''۔

(تاثر حیات اصدق ص۲۸)

اصاغرین میں مولانا محمد شاکر رضا مصباحی پی، ایچ، ڈی اسکالر، ایم فل۔
یونیورسیٹی حیدرآباد لکھتے ہیں:

''مولانا سید رکن الدین اصدق، حضور حافظ ملت کے
عزیز شاگرد اور معروف کالم نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں بلا کی
شگفتگی، جرأت اور بے باکی ملتی ہے۔ ان کی مشہور تصنیفات
ہیں: ''بے نقاب چہرے، خطرات کے بادل، تاریخ ہجرت،
حیات اصدق اور آئینۂ مخدوم جہاں''۔

(ماہنامہ اشرفیہ، اپریل ۲۰۱۳ء)

مولائے کریم اپنے حبیب پاک ﷺ کے طفیل قبلہ حضور والد گرامی کا سایۂ
عاطفت ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔ آمین۔

چشم اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
بزم ہستی کو ابھی باقی ہے ضرورت تیری

دوسرا ایڈیشن

یہ کتاب ’’خطرات کے بادل‘‘ مالی منفعت کو سامنے رکھ کر تجارتی نقطۂ نظر سے لکھی جانے والی کوئی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ سوادِ اعظم کی ملکی سطح پر گرتی ہوئی ساکھ اور اہل سنت و جماعت کی بڑھتی ہوئی زبوں حالی کو دیکھ کر میرے دل پر چوکے پہ چوکے لگتے رہے۔ اغیار کی جانب سے ہماری مساجد، ہمارے مدارس حتیٰ کہ ہماری خانقاہوں پہ یلغار کی کوشش دن بدن تیز ہوتی دیکھ کر اور اپنی جماعت کے نامور علماء، چوٹی کے مقررین اور بلند بام خانقاہوں کے مشائخ کرام کو سامان راحت میں مگن پا کر میرے دل کے درد نے مزید شدت اختیار کرلیا۔ اور اسی سیمابی کیفیت میں قلبی واردات نوک قلم سے صفحۂ قرطاس پر اترتے چلے گئے اور تلخ حقیقتوں کا ایک مرقع تیار ہوگیا۔ اور اپنے خوابیدہ جوانوں کو بیدار کرنے کے لئے میں نے اس کا نام ’’خطرات کے بادل‘‘ رکھ دیا۔

اس کی اشاعت عام ہو اور حساس دلوں تک زیادہ سے زیادہ یہ کتاب پہونچ سکے۔ اس خیال سے میں نے یہ کتاب اپنے برادر مخلص حضرت الحاج سید محمد تقی اللہ اشرفی المدنی کی نذر کردی کہ اسے چھپوا کر مفت تقسیم فرمائیں۔ انہوں نے میری اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے قبول فرمایا اور مکتبہ نعیمیہ جامع مسجد دہلی سے اس کتاب کی اشاعت کرائی۔ کتاب کو امید سے کہیں زیادہ قبول عام حاصل ہوا۔ اور چند ہی ماہ میں دو

ہزار کتابیں ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں۔ اور ملک کی مختلف ریاستوں سے کتاب کے لئے تقاضا بڑھتا گیا۔ ان تقاضوں سے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوا۔ ہاں! جذبات سے مغلوب ہو کر لرزتے قلم سے میں نے یہ کتاب لکھی تھی لہٰذا اتنا خیال ضرور آیا کہ ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقت پرواز، مگر رکھتی ہے

تاخیر کی وجوہات: اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بہت پہلے منظر عام پر آچکا ہوتا۔ مگر پے در پے کئی وجوہات سامنے آتی گئیں۔ پہلی وجہ تو ہمارے چند احباب کا یہ تقاضا بنا کہ اس کتاب کو پڑھ کر کچھ تشنگی رہ جاتی ہے۔ کتاب میں کچھ مزید تفصیلات کے اضافے کی ضرورت ہے۔ تاکہ جماعتی غفلت کا خمار دور کرنے میں کتاب زیادہ معاون ثابت ہو۔ چنانچہ میں نے ان کی خواہشات کی قدر کرتے ہوئے اسی نوع کے اپنے گیارہ قیمتی مقالوں کو شامل کتاب کر کے باقاعدہ اسے کتاب کا دوسرا حصہ بنا دیا ہے۔ جس سے کتاب کا حجم دوگنا سے بھی سوا ہوگیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کتاب کی افادیت بھی دوبالا ہو گئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہماری جماعت کے فرزندوں کے قلب وسینہ کے خاکستر میں احساس کی معمولی سی چنگاری بھی باقی ہوگی تو اسے سلگ اٹھنے میں انشاء اللہ دیر نہیں لگے گی۔

دوسری وجہ میرے مخلص و کرم فرما جناب ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی پروفیسر مسلم یونیورسیٹی علی گڈھ بنے۔ انہوں نے مجھے روکے رکھا کہ کتاب ’’خطرات کے بادل‘‘ نہایت مفید عام کتاب ہے۔ دوسرے ایڈیشن کی اشاعت میں جلدی نہ کیجئے۔ میں

اس کتاب پر ایک مبسوط تبصرہ لکھنے جا رہا ہوں۔جس کا شامل کتاب ہونا ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ دھمکی بھی دیتے رہے کہ میرے تبصرہ کو بغیر کسی حذف واضافہ من وعن شامل کرنا ہے۔وقت گذرتا گیا اور انتظار کی گھڑیاں دراز ہوتی گئیں۔سالوں کے بعد کتاب کا دوسرا ایڈیشن پوری سج دھج کے ساتھ پریس کی دہلیز پر پہونچ رہا ہے۔مگر اب تک میری نگاہ ڈاکٹر چشتی کی راہ دیکھ رہی ہے ؎

توڑا تھا ایک شخص نے، عہد وفا کبھی
اب خوف کھا رہے ہیں ہر اک آدمی سے ہم

تیسری وجہ جناب محمد ضیاء نعیمی مالک مکتبہ نعیمیہ دہلی بنے۔ان کی طرف سے پہلے تو دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کا مطالبہ ہوا مذکورہ بالا وجوہات کے سبب میں فی الفور اشاعت سے معذور رہا۔تو انہوں نے پورے ملک سے کتاب کے مطالبات کے باعث حق اشاعت طلب کیا اور جب میں نے اضافہ شدہ سارے مسودات ان کے سپرد کر دیا۔ تو اپنے فرزند کی طویل علالت کے سبب پورے سال اپنی تحویل میں رکھ کر سارے کاغذات بہ حفاظت واپس کر دیا۔اور طبع شدہ کتابیں جام پڑ جانے اور سرمایہ منجمد ہو جانے کا عذر پیش کیا۔بہر کیف ان ہی وجوہات کے سبب کتاب کا دوسرا ایڈیشن آنے میں دیر ہوئی۔مولائے کائنات علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں ’’**عرفت ربی بفسخ العزائم**‘‘ اپنے ارادے ٹوٹ جانے سے مجھے اپنے رب کی مشیت کا عرفان حاصل ہوا۔

’’دیر آید درست آید‘‘ کا مقولہ بھی یہاں بایں معنیٰ صادق آتا ہے کہ اگر ان ہی دنوں دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آ جاتا تو بہت سارے قیمتی مشمولات کتاب کا حصہ

بننے سے رہ جاتے۔اور بعد میں ان کی عدم شمولیت رہ رہ کر کمی کا احساس دلاتی۔اسی لئے کہا گیا ہے’’مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ‘‘ ڈاکٹر سید شاہ حسین الحق شہودی صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسیٹی گیا،علم وادب کی دنیا میں ایک جانی پہچانی شخصیت کا نام ہے۔آپ کا تبصرہ شامل کتاب کیا جا رہا ہے۔اگر چہ یہ مختصر ہے مگر جامع اور پر مغز ہے۔

ابھی حالیہ دنوں میں دوبئی،شارجہ اور ابوظہبی کے تبلیغی دورے پر میں گیا ہوا تھا۔ جناب سید ظفر صادق اصدقی صاحب نے بتایا کہ کچھ پاکستانی احباب نے ’’خطرات کے بادل‘‘ کی دس عدد فوٹو کاپیاں کرا کر لوگوں میں تقسیم کی ہیں۔اور مزید پچاس کاپیوں کا وہ مجھ سے مطالبہ کر رہے ہیں۔کتاب میرے ساتھ نہیں تھی۔ چونکہ ریکارڈ کاپی کے سوا میری تحویل میں بھی کوئی کتاب بچی نہیں ہے۔لہٰذا وعدہ فردا پر ٹال آیا ہوں۔

المختصر یہ کہ مسلمانان ہند کی طرح ہمارے پاکستانی بھائی بھی زمانے کی اس ستم ظریفی کا کرب محسوس کر رہے ہیں اور کتاب کی افادیت کا اندازہ کر کے اس کی اشاعت میں کوشاں بھی ہیں۔کیونکہ پاکستان میں بھی پیشہ ور مقررین کی کمی نہیں ہے۔اور’’نہ خود خورد نہ کسے دہد‘‘ کی ڈگر پر چلنے والے وہاں بھی تھوڑے نہیں ہیں۔ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ خود کچھ کرنا نہیں چاہتے اور کرنے والوں کو چلنے دینا نہیں چاہتے۔ایسے ہی افراد سواد اعظم کی راہ میں کانٹا بچھانے میں لگے ہیں۔انہیں تعمیر سے نہیں،تخریب سے دلچسپی ہے۔یہ نادان دوست دانا دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہیں مگر ؎

ان آبلوں سے پاؤں کے، گھبرا گیا تھا میں

جی خوش ہوا ہے راہ کو، پُر خار دیکھ کر

دوستو! تم نے اگر دشمن کے نشانے کا اندازہ لگا کر بروقت دفاعی اقدام نہ کیا تو تمہارے یہ سارے کھوکھلے نعرے ہوا میں فائرنگ ثابت ہونگے۔ کوئی بھی مسلک صرف نعروں کے بل پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خواب غفلت سے بیدار ہو کر دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھو۔ سنی وقف بورڈ میں تم نہیں ہو۔ مدرسہ اکزامیشن بورڈ میں تم نہیں ہو۔ اردو اکیڈمیوں میں تم نہیں ہو۔ حج کمیٹیوں میں تم نہیں ہو۔ بورڈ کے مدارس میں تم نہیں ہو۔ جہاں ہو وہاں سے بھی ہٹائے جا رہے ہو اور جہاں جانے کی کوشش کرتے ہو، وہاں کے دروازے تم پر بند دکھائی دیتے ہیں۔

للہ! اسلامی جلسہ گاہوں کو ڈرامے کا اسٹیج نہ بناؤ۔ پیٹ کے ایندھن کی خاطر ملی مفاد کا سودا نہ کرو۔ جھوٹی شہرت کمانے کے لئے جماعت کی آبرو کو نیلام پر نہ چڑھاؤ۔ اپنوں کے خلاف زور آزمائی کو اپنی وقار کا مسئلہ نہ بناؤ۔ بڑے بڑے ناموروں کو زمین کھا گئی۔ جو ملت کے لئے کچھ کر گذرے بس ان ہی کا نام زندہ ہے۔ اگر تم بھی زندہ قوموں کی صف میں زندہ رہنا چاہتے ہو تو امت کی بقاء کے لئے اپنی فانی زندگی میں کچھ کر دکھاؤ۔

اس کتاب کے مندرجات کی روشنی میں ملت کے نوجوان ہوش کے ناخن لیں۔ اپنے دلوں میں جماعت کا درد پیدا کریں۔ خود احتسابی کی راہ اپنا کر اپنی پسپائی کا راز معلوم کریں اور جماعت کی رگوں میں خون فراہم کرنے کے لئے آگے آئیں۔ ہواؤں کا رخ پھیر دینے کے لئے ایثار و قربانی کا مجسمہ بن کر میدان عمل میں اتر جائیں۔

فرد قائم ،ربط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں

موج دریا میں ہے ، اور بیرون دریا کچھ نہیں

☆☆☆

تبصرہ

از- ڈاکٹر سید شاہ حسین الحق شہودی، صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی گیا

تصوف اور صوفی خانوادوں کے ضمن میں خانوادہ اصدقیہ محتاج تعارف نہیں ہے۔ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی فخری شاخ بنگال، بہار اور جھارکھنڈ میں اسی خانوادہ اصدقیہ صادقیہ کے ذریعہ برگ و بار لائی۔ گزشتہ پونے دوسو سال سے یہ خانوادہ اور اس سے منسلک و متعلق حضرات لگا تار علم وادب اور مذہب و تصوف کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں۔ نتیجتاً تادم تحریر اصدقی خانقاہیں اپنی اپنی بساط بھر مصروف عمل ہیں۔ اصدقی مصنفین کی کم از کم ڈیڑھ سو مطبوعہ کتابیں موجود ہیں اور حضرت صادق علی شاہ، حضرت محبّ اللہ بخاری، داتا مسکین علی شاہ، حضرت مولانا فرید الدین اصدقی، حضرت علامہ باقر الاصدقی پیر بیگھوی، حضرت فخر الدین حسین سخن دہلوی، حضرت مولانا پروفیسر سلیمان اشرف بہاری، حضرت مولانا انوار الحق شہودی، حضرت مولانا احتشام الدین فریدی، ڈاکٹر عین تابش اور ڈاکٹر زین رامش جیسے مشاہیر علم وادب اس خانوادے کے

چشم و چراغ ہیں۔

مولانا رکن الدین اصدق صاحب بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں۔ مولانا رکن الدین اصدق بھی آج کی تاریخ میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ وہ خانوادہ اصدقیہ کے ایک قابل فخر فرزند ہیں۔ اہل سنت و جماعت کے علماء میں استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ بہار شریف سے ممبئی تک ان کی خطابت کا ڈنکا بجتا ہے۔ ''جام شہود'' کے ذریعہ مذہبی صحافت کے صفحات پر ان کا دست خط نمایاں ہے۔ صلاحیت قابل رشک ہے کہ مدراسہ اصدقیہ مخدوم شرف کو مرکزی ادارہ کی حیثیت عطا کر کے اس کی نگرانی میں مزید نصف درجن تعلیمی ادارے قائم کر ڈالے۔ اور ان سب کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی لگا تار جاری ہے۔ متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں تازہ تر کتاب ''خطرات کے بادل'' ہے۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ ہندوستان سے سعودی عرب تک پھیلے ہوئے نجدی الخیال مسلمانوں کے احمقانہ خیالات اور علاحدگی پسندانہ اعمال (Secterian activities) کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اسے ''احتساب دیگراں'' کے عنوان سے بھی معنون کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا حصہ صوفی اور حنفی مسلک کے حامل عام و خواص کی غلط فہمیوں اور غلط کاریوں کا لیکھا جوکھا پیش کرتا ہے اسے احتساب دلبراں یا حساب دوستاں کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے۔

مولانا عالم بھی ہیں اور صوفی بھی اس لئے میرے خیال میں پہلا حصہ فقیہانہ ہے (فقیہ ہمیشہ دوسروں کے بارے میں رائے دیتا ہے) دوسرا حصہ صوفیانہ ہے

(صوفی احتساب نفس اوراحتساب خانہ وخانوادہ کا قائل رہتا ہے)۔ایمانداری سے اگرغورکیاجائےتواعتراف کرناہوگااس وقت امت کوفقیہانہ اورصوفیانہ دونوں رویوں کی ضرورت ہے۔بلکہ تصوف پسند ہونے کے ناطے میرا تو یقین ہے کہ ہر دور میں فقیہ (شریعت)تصوف (طریقت) کے بغیر ادھوری ہے۔ظاہر کی اصلاح کا کوئی معنی ہی نہیں بنتا جب تک اندر کی اصلاح نہ ہوجائے۔

حضرت مولانا رکن الدین اصدق صاحب کا اسلوب خطیبانہ بلند آہنگ ہونے کے باوجود رواں دواں اور بیان کی پیچیدگی سے پاک رہتا ہے۔''خطرات کے بادل''میں بھی یہ حسن بیان مصروف عمل ہے۔مولانا کے بیانیہ کا دوسرا خاص عنصر برمحل اشعار کا استعمال ہوتا ہے۔اردوادب میں اس خصوصیت کے سب سے بڑے حامل مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔مولانا رکن الدین اصدق صاحب کم ازکم اس باب میں مولانا ابوالکلام آزاد کے متبع ہیں۔ذاتی طور پرمیرے لئے یہ خوش ہونے والی بات ہے۔

آخری بات : یہ دور نشرواشاعت ،میڈیا اور پروپیگنڈے کا دور ہے۔دوسری طرف ہماری نوجوان نسل جوآج کی اس مسابقتی دنیا(Competative World) میں عصری تعلیم حاصل کرنے پرمجبور ہے۔اسے ضرورت ہے کہ ایسی کتابوں کے ذریعہ صحیح صورت حال سے باخبرکیاجائے اورصحیح رویوں سے روشناس کرایاجائے۔

ملی مسائل کے ضمن میں لکھی گئی کتابوں کو جب بھی یاد کیا جائے گا تو ''خطرات کے بادل''اس لحاظ سے نمایاں رہے گی کہ اس میں امت کے امراض کا ذکر بھی ہے،امت کو درپیش مسائل پر بھی نگاہ کی گئی ہے اوراپنے انداز سے ان مسائل کا حل دریافت کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

☆☆☆

تأثر

از-مفتی ولی محمد رضوی-خطیب جامع مسجد باسنی ضلع ناگورشریف

امیر سنی تبلیغی جماعت راجستھان

قلم کی قوت ہر دور میں مسلم رہی ہے اوراس قوت سے اصلاحی انقلاب بھی لایا جاتا ہےاورکسی قسم کا فتنہ بھی جگایا جاسکتا ہے۔اس قسم کی مثالوں سے اہل علم باخبر ہیں۔

سعید وطیب روحیں ملت کی اصلاح میں کوشاں رہتی ہیں ان کے شب وروز اسی فکر میں مصروف رہتے ہیں اور وہ اپنے طیب وطاہر فکروشعور کے موتی بکھیرتے رہے ہیں بحمدہ اہلسنت وجماعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سنجیدہ فکر،فکر انگیز تحریر وتصنیف والے حضرات کثیر تعداد میں موجود ہیں اور وہ گاہ بگاہ اپنی نگارشات قلم کے جوہر ظاہر کرتے رہتے ہیں۔انہیں زندہ دل بیدار مغز فکر صالح کی حامل شخصیت شیخ طریقت حضرت علامہ سید شاہ رکن الدین اصدق صاحب مدیر اعلیٰ سہ ماہی جام شہود دام ظلہ العالی کی ہے۔جنہوں نے کئی ایک تالیفات سے ایک نئی فکر کا آغاز کیا ہے راقم سے دیرینہ تعلقات ہیں بڑی شفقت وعنایت فرماتے ہیں اورآل راجستھان سنی تبلیغی جماعت کے سرپرست ودعا گو بزرگ ہیں۔

ابھی ابھی آپ کی تازہ تصنیف ''خطرات کے بادل''نامی گرامی کتاب کا مطالعہ کیا گیا جودھڑکتے دل کی آواز ہے۔دردمند دل کا سوز وگداز ہے،بےقرارروح

کی آواز ہے،ملت کی اصلاح میں تدبر وتفکر کے موتی ہیں جونوک قلم سے ابل پڑے ہیں۔ چندعنوانات آپ نے قائم کئے ہیں اپنی نفیس آراء پیش کیں ، ہمارے مشائخ ،علماء، خطباءوائمہ مساجدوغیرہ سے دردمندانہ اپیل کیاہےاور ہماری کاہلی اورکوتاہی سے سنیت کو جونقصان ہورہاہےاس کا برابرآپ نے مشاہداتی جائزہ لیاہےاور جماعت اہلسنت سے ہمدرردانہ طریقہ احسن سے آپ نے بیدار ہونے اور کچھ کرگذرنے کی بڑے سنجیدہ پیرائے میں اپیل کی ہے۔سطرسطراخلاص کانمونہ ہےصفحہ صفحہ پرعلماءاہلسنت کوان کی ذمہ داریاں یاددلائی ہیں اوردورجدیدمیں جدیدتعلیم پرانحصار سے کیا نقصانات ہیں ان پرحکیمانہ انداز میں ذہن وفکرکی تطہیرکرنے کی سعی نیک کی گئی ہے۔

کتاب کیا ہے اول سے آخر تک ،صوفیانہ ومشفقانہ اصلاح فکر کا ایک سرمایہ ہے مطالعہ کرنے والے کومتأثر کرتی ہے کہ ختم کئے بغیر رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ یوں تو آپ کا ہر مضمون دل آویزودل پذیر ہوتاہےمگر یہ کتاب تو تجربات ومشاہدات کا ایک چمن ہے جودل سے سجایا اور قلب وجگر کے خون سے نکھارا گیاہے۔اعلیٰ درجے کا اخلاص ہے کہ آپ کی اس کتاب پروقار اہلسنت حضرت بحرالعلوم علامہ عبدالمنان اعظمی صاحب نے تأثرات ودعائیہ کلمات تحریرفرمائے اورآبروئے لوح وقلم گرامی قدرعلامہ یٰسین اختر مصباحی صاحب، مدیراعلیٰ ماہنامہ کنزالایمان نے ایک علمی وفکری پرمغز مقدمہ رقم کیا جوشامل کتاب ہے۔اس اہم خدمت پرحضرت علامہ سیدرکن الدین اصدق ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں۔

میں اس تالیف جدید کی طباعت پرشہزادۂ عالی مرتبت محترم نورالدین صاحب اصدق مدیرجام شہودکودلی مبارکباد پیش کرتاہوں کہ یہ وقت کی بہت بڑی ضرورت تھی جس کو آپ لوگوں نے پورا کیاہے،ہم تمام آپ کے مشکورو ممنون ہیں اور مؤلف ممدوح گرامی کے لئے دعا کرتے ہیں کہ مولیٰ تعالیٰ جان ومال کی حفاظت فرمائےنفس وشیطان کے فتنہ وفساد سے بچائے اور جونفس وشیطان کے غلام ہیں ان کے شر سے محفوظ رکھے ہم سب کو پاکیزہ

رائے گرامی

از:۔بحرالعلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان اعظمی
شیخ الحدیث جامعہ شمس العلوم گھوسی ،(یوپی)

مکرمی حضرت مولانا سیدسیف الدین اصدق صاحب وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سیمنار کے دن ،الجامعۃ الاشرفیہ سے گھرلوٹ کر مجھے اعظم گڑھ جانا تھا۔ڈاکٹر کے وہاں میں ٹائم لے چکا تھااس لئے آپ لوگوں کا زیادہ انتظار نہ کرسکا۔سوادو بجے اعظم گڑھ چلا گیااوردوسرے دن سویرے ہی میں مدرسہ چلا آیا۔مجھے افسوس ہوا کہ آپ لوگوں سے ملاقات نہ ہوسکی۔

سیدمحمد ہاشم اصدق سلمہ ’’خطرات کے بادل‘‘ کے ساتھ بجلی کی طرح آئے اور کتاب کا مبیضہ وخط دیا۔آپ کے والدصاحب تو پختہ کارصاحب قلم ہیں۔ان کی کسی تحریرکو میری تقریظ کی کیا ضرورت۔برسوں پہلے ان کی ایک کتاب ’’تاریخ ہجرت‘‘ ہجرت کے موضوع پر جوانہوں نے مجھے دی تھی پڑھنے کے بعد زبان وبیان کی خوبی کے ساتھ،جس بات نے مجھے خاص طور سے متأثر کیا وہ مفہوم وعبارت کی باہمی مناسبت تھی جس کو بلاغت کہا جاتا ہے۔

اور یہ کتاب ’’خطرات کے بادل‘‘ تو ڈاکٹر اقبال کی تصویر درد ہے۔مگر افسوس یہ ہے کہ ہماری قوم کی بیماری، احساس درد کی منزل سے کوسوں دور بڑھ گئی ہے۔لیکن کیا جائے ، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے بھی تونہیں رہا جاسکتا۔حضرت حافظ شیرازی کہتے ہیں ۔

نوا را تیز تر می زن ، چو ذوق نغمہ کم یابی
حدیٰ را تیز تر می خواں ، چو محمل را گراں بینی

اللہ تعالیٰ مولانا کے رشحات قلم کو قبول فرمائے اور قبولیت عام بخشے۔ان کو صحت کاملہ وعاجلہ عطا فرمائے اور آپ کے فیوض وبرکات کو عام تام کرے۔آمین

عبدالمنان اعظمی
جامعہ شمس العلوم گھوسی ۱۴؍جولائی ۲۰۰۴ء

اشاریہ

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

زمانے کے بدلتے حالات اور وقت کے چیختے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے جینے کی خواہش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے طوفان کے تھپیڑوں سے لڑتی ہوئی کشتی میں سوراخ کر کے دریا پار کرنے کی امید رکھنا۔سواد اعظم اہل سنت و جماعت اس وقت ایسی ہی پرخطر وادی سے گذر رہی ہے جس کے ہر ہر قدم پر رکاوٹ کھڑی ہے اور چاروں طرف دشمن کمین گاہوں میں چھپ کر موقع کا انتظار کر رہے ہیں۔ایسے میں گھنیرا سایہ تلاش کر کے ہم بے خبری کی نیند سوتے رہیں تو ہمارے زندہ رہنے کی کوئی ضمانت ہے؟

کیسے نادان ہیں وہ لوگ جو کسی مخصوص خطے کے ساز گار ماحول میں رہ کر پوری دنیا کو اسی پر قیاس کر رہے ہیں۔انہیں نہیں معلوم کہ ہمیں کن کن محاذوں پر زک اٹھانا پڑ رہا ہے۔اور ہر روز اپنی ایک چوکی چھوڑ کر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ بورڈ کے مدرسے ہمارے ہاتھوں سے نکلتے جا رہے ہیں۔اوقاف کی مسجدیں ہم سے چھینی جا رہی ہیں۔اقلیتی اداروں پر غیروں کی اجارہ داری قائم ہوتی جا رہی ہے۔ اور ہم سترہ قسم کے نعرے ایجاد کر کے اسی میں مگن ہیں۔ہم کو قطعاً اس بات کی فکر نہیں

ہے کہ آنے والی نسل ہمارے ان نعروں کا پالن کرے گی بھی یا نہیں۔

سنی تبلیغی جماعت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کتنا سچ فرمایا تھا خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی نور اللہ مرقدہٗ نے کہ ہندوستان میں کوئی ایسا شہر نہیں جہاں اغیار کا گزر نہ ہو اور درجنوں ایسے مقامات ہیں جہاں کوئی بھی بریلوی عالم بنام جلسہ وجلوس قدم نہیں رکھ سکتا ہے۔پھر ان شہروں کے نام انگلیوں پر گنوائے تھے۔ ۱۹۸۰ء میں سنی تبلیغی جماعت کی ایک کل ہند نشست آپ نے الہ آباد میں بلوائی تھی جس کی صدارت کا بوجھ راقم الحروف کے سر ڈال کر اپنی افتتاحی تقریر میں یہ جملے ارشاد فرمائے تھے۔اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر رحمتوں کے پھول برسائے۔وہ اپنے سینے میں سنیت کے لئے ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے تھے۔

اس چوتھائی صدی میں حالات سدھرے نہیں ہیں ، بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔حضرت علامہ نظامی اور حضرت علامہ ارشد القادری جیسے لوگ بڑھے نہیں ہیں بلکہ گھٹتے جا رہے ہیں۔اسلاف کی مسندیں خالی پڑی ہیں اخلاف اسے پر نہیں کر سکے ہیں۔ہماری تنظیموں کا دامن پھیلا نہیں ہے سمٹ گیا ہے۔جو لوگ خوش فہمیوں کی جنت میں رہتے ہیں وہ نوع بنوع نعرے لگا رہے ہیں۔اس سے جماعت کی رگوں میں خون نہیں دوڑ سکتا۔ہم کیرالا سے لیکر کشمیر تک اور گجرات کی وادی سے لیکر بنگال کی کھاڑی تک جماعت کا شیرازہ تار تار ہوتا دیکھ رہے ہیں ہم روئیں تو کس کے سامنے روئیں۔ اپنا حال پر درد کہیں تو کس سے کہیں اب دور دور تک جماعت کا کوئی مسیحا نظر نہیں آتا ہے۔بڑے لوگ عقیدتمندوں کے جھرمٹ میں رہ کر سمجھتے ہیں کہ سب خیریت ہے۔ چھوٹے لوگ اسٹیج کے نعروں میں مست ہو جاتے ہیں کہ ہر سو ہم ہی ہم ہیں۔

اس وقت جماعت کے لئے سب سے بڑا خطرہ وہ لوگ بن گئے ہیں جو اپنے سوا کسی کو بھی سنی نہیں سمجھتے ۔ ہر خانقاہ ان کے نزدیک ناکارہ، ہر ادارہ ان کے سامنے ناقابل اعتماد اور ہر سلسلہ ان کی نظر میں مشکوک ہے۔ وہ اکھاڑہ تیار کر کے آپس میں ہی کشتی کے لئے تال ٹھونک رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ٹکڑوں میں بٹتے جا رہے ہیں اور سواد اعظم کا لفظ ہمارے لئے مضحکہ خیز بنتا جا رہا ہے۔ مولائے قدیر اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں نفس کی ایسی شرارتوں سے ہمیں محفوظ رکھے ۔

زمانہ پھر گیا ، چلنے لگی ہوا الٹی
چمن کو آگ لگا کر جو باغباں نکلا

زیر نظر کتاب ''خطرات کے بادل'' کے ترتیب کی محرک دو چیزیں بنیں۔

اول ——— یہ کہ سواد اعظم اہل سنت و جماعت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لئے تحریک وہابیت کا نہایت خطرناک منصوبہ، جس کے لئے عالمی سطح پر ہر طرح کے ذرائع اور وسائل کا استعمال کیا جا رہا ہے۔

دوم ——— یہ کہ قائدین اہل سنت کی شرمناک کوتاہیاں، لاپرواہیاں اور تن آسانیاں جماعت کے لئے آج موت کا پیغام بنتی جا رہی ہیں۔ یہ ایک کڑوی حقیقت ہے جسے حلق سے اتارنے میں گرانی ضرور محسوس ہوگی۔ مگر یہ بھی طے ہے کہ یہ تلخی حلق سے اتر جانے کے بعد ہی ہم اپنے جینے کی راہ متعین کر سکیں گے۔

اس کتاب میں تصویر کے دونوں رخ کو کسی قدر تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔
پہلے رخ کا خاکہ کچھ اس طرح ہے:

(۱) فرقۂ ضالّہ کا خروج اور حکومت سعودیہ کا سواد اعظم اہل سنت کی بیخ کنی کے لئے دولتوں کا استعمال۔

(۲) مال و دولت کے ذریعہ سیدھے سادھے مسلمانوں کے عقیدہ و ایمان کی خریداری کا خطرناک عمل۔

(۳) باطل جماعتوں کا درون خانہ گھس کر مسلمانوں کے اندر انتشار پیدا کرنے کی شرمناک سازش۔

(۴) جاہ و منصب کے بل بوتے پر سواد اعظم اہل سنت و جماعت کے خلاف جارحانہ اقدام کی المناک داستان۔

دوسرے رخ میں پیش کی جانے والی تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) سواد اعظم اہل سنت و جماعت کے زوال کے ظاہری اسباب و وجوہ۔

(۲) اشاعت سنیت کے لئے ذرائع و وسائل کی طرف سے ہمارے قائدین کی چشم پوشی۔

(۳) جماعتی ذمہ داریوں سے ہمارے علماء و مشائخ کی غفلت و لاپرواہی۔

(۴) پائیدار دینی کام سے ہمارے سرمایہ داروں کی عدم دلچسپی اور نمائشی کاموں میں ان کی فراخ دلی ——— آخر میں ''چند معروضات'' کے عنوان سے جماعتی کاز کو آگے بڑھانے کی راہ متعین کی گئی ہے۔ اور جماعتی مشکلات کے حل کے لئے ممکنہ صورتوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔

یہ کون نہیں جانتا کہ ——— مخالف طوفان کی زد پر کوئی بھی چراغ بہت دیر تک جلتا نہیں رہ سکتا، اس کے لئے طوفانوں کا رخ موڑ دینے کی تدبیریں بہرحال ضروری ہیں دوسرے یہ کہ چھاپہ مار دستوں کی فتنہ سامانیوں سے محفوظ رہنے کے لئے

اپنے ہراول دستے کو چوکس رکھنا بھی از بس ضروری ہے کیونکہ غفلت کی نیند سوتے رہنے والوں پر دشمن کے کمزور دستے بھی حملے میں کامیابی آسانی کے ساتھ حاصل کر سکتے ہیں۔اور آج ہرسنی آبادی میں اس طرح کے حادثات رونما ہورہے ہیں۔

جو لوگ دشمنوں کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے اور دفاعی تدبیریں کرنے کے بجائے غیبی مدد آنے کا انتظار کرتے رہتے ہیں وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔قرآن حکیم نے کھلے الفاظ میں فرمان رب سنادیا ہے۔**ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیر وا ما بانفسھم** جس کا ترجمہ کسی شاعر نے ایک شعر میں اس طرح پیش کیا ہے ۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو خیال جسے، آپ اپنی حالت بدلنے کا

لہٰذا ہمیں اپنے زندہ رہنے کے لئے کچھ تو کرنا ہی ہے۔اور یہ یاد رہے کہ ہمارے مخالفین اپنی تخریب کاریوں میں جن کٹھن راہوں سے ہوکر مدتوں بعد کامیابی کی دہلیز تک پہونچ پاتے ہیں۔ہم اگر اپنے اندر تھوڑی سی بیداری پیدا کرلیں تو ان کے باطل خیالات کے سارے قلعوں کو مسمار کردینے میں ہمیں ذرا بھی دیر نہیں لگے گی۔مگر کاش ہمیں ہوش آجاتا اور ہم دنیادارانہ سطح سے اوپر اٹھ کر بھی کچھ سوچنے کی فکر کرتے ۔

سفینۂ برگ گل بنا لے گا، قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا

العاجز

سید رکن الدین اصدق چشتی

آستانہ چشتی چمن پیر بیگھہ شریف، ضلع نالندہ

۲۵/شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ

تقدیم

رئیس التحریر حضرت مولانا **یٰسین اختر** مصباحی

بانی وصدر دارالقلم، ذاکرنگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اسلام ساری کائنات کے لئے دین رحمت ورأفت ہے۔رب کائنات کے اسی مقبول ومنتخب دین کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ سارے انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنے اپنے دور میں انجام دیا ہے اوراس سلسلہ کی آخری کڑی پیغمبر اسلام نبی ہاشمی ختمی مرتبت مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔جن کی اس کی نعمت تمام ہوئی اور دین اسلام کی تکمیل ہوئی۔

خلفاء راشدین وصحابہ وتابعین کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسی دین اور اسلامی شریعت کواپنے دل ودماغ اوراپنی زندگی میں اس طرح رچابسایا کہ وہ قیامت تک کی امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لئے اسوہ وقدوۃ قرار پائے اورقرآن حکیم نے انہیں کے صراط مستقیم پر چلنے کا اسے حکم دیا۔تاخود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سواد اعظم کی اطاعت واتباع کا درس دیااوراسی کی ہدایت ونجات کا مژدہ سنایا۔

اصطلاحی طور پراسی کاروان سواد اعظم کواہل سنت وجماعت کہا جاتا ہے جس کے حلقہ ودائرہ میں احناف وشوافع ومالکیہ وحنابلہ سب شامل ہیں۔اوروہ بدنصیب وبے توفیق جماعتیں جوروشن شاہراہ حیات سے بھٹک کرالگ اور دور جاپڑیں وہ دینی واخروی

خسارہ سے دوچار ہوئیں اور وادئ حیرت وضلالت میں اپنے ایمان واسلام کا سارا سرمایہ لٹا بیٹھیں۔ایسے فرق واحزاب باطلہ میں روافض وخوارج سرفہرست ہیں۔پھر معتزلہ وجبریہ وقدریہ وغیرہ کی باری آئی اورسواد اعظم اہل سنت وجماعت سے الگ راہ اپنا کرانہوں نے بھی عالم اسلام کوزبردست بحران اورابتلاء ومصیبت کا شکار بنایا۔

لگ بھگ ڈھائی سو سال پہلے وادئ نجد سے اسی طرح کا ایک خوفناک طوفان اٹھا۔اورابن تیمیہ حرانی کے افکاروخیالات سے متأثر ہوکرشیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی نے مذہب ومسلک اہل سنت کوچیلنج دیتے ہوئے وہابیت کی بنیاد رکھی۔اورکتاب التوحید ودیگر رسائل وکتب کے ذریعہ اس کی بڑے پیمانہ پرتبلیغ وتشہیر کرکے اپنے حامیوں ومعتقدوں کی ایک بےلگام اور جنگ جو جماعت کی بھی تشکیل کرڈالی۔

علماء اسلام ومشائخ اہل سنت نے اس نومولود فکر وہابی کو یکسر مسترد کرتے ہوئے اس کے خلاف اپنا شرعی حکم وفیصلہ صادر فرمایا۔شیخ نجدی کے اساتذہ،اس کے والد حضرت شیخ عبدالوہاب اوراس کے حقیقی بھائی حضرت شیخ سلیمان بن عبدالوہاب نے اس کی کھل کر تردید ومخالفت کی اس کے خلاف سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں کہ وہ حق کی طرف رجوع کرتے ہوئے کاروان سواد اعظم اہل سنت وجماعت میں دوبارہ شامل ہو جائے اورمسلمانان عالم کی تکفیر وتضلیل سے باز آجائے۔مگروہ اس سعادت سے محروم رہا اوراسے توبہ ورجوع کی توفیق نہ مل سکی۔

شیخ نجدی کوتنبیہ وہدایت دیتے ہوئے اس کے بھائی شیخ سلیمان بن عبد الوہاب نے **الصواعق الالٰہیة فی الرد علی الوهابية** (مطبوعہ)

کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا۔اس میں اسے مخاطب کرتے ہوئے ایک جگہ بڑے اخلاص ودردمندی کے ساتھ لکھتے ہیں۔

"باللہ علیکم ! انتھوا عن الجفاء و قول الزور،
واقتدوا بالسلف الصالح و تجنّبوا طریق اھل البدع
ولا تکون کالذی زیّن له سوء عمله فرآه حسناً"

(ص۲۱،الصوائق الالٰھیۃ مطبوعہ استنبول،ترکی)

تمہیں خدا کی قسم ہے کہ ظلم و جفا اور جھوٹی باتوں سے باز آجاؤ۔سلف صالحین کی اقتدا کرو۔بدمذہبوں کا طریقہ چھوڑ دو۔اور ایسوں کی طرح نہ بنو جن کے لئے ان کی بدعملی مزین کی گئی ہو اور وہ اسے اچھی دیکھے۔

لیکن زیغ وضلال کا زنگ اور رنگ شیخ اور اس کے گروہ وہابیہ پر دن بہ دن چھاتا اور بڑھتا چلا گیا اور نہ باز آنا تھا اور نہ باز آئے کہ رسول مکرم ومعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلاف کرام کی شان میں گستاخی کرنے والوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ان کے افکار فاسدہ اور ان کے اعمال ضائع ہوجاتے ہیں۔اور شیطان انہیں اس طرح مبتلائے فریب رکھتا ہے کہ اس ضیاع ونقصان کی انہیں خبر بھی نہیں ہو پاتی۔

اپنی گمراہ کن تحریک ودعوت کے فروغ ورواج کے لئے شیخ نجدی نے اپنے ہی جیسے ایک گمراہ فرقہ قرامطہ سے رابطہ قائم کرکے اس کا تعاون حاصل کرنا چاہا مگر اس اقدام میں کسی وجہ سے اسے ناکامی ہوئی۔اب اس کے بعد اس نے جو کچھ کیا اسے غیر مقلدین ہند کے ایک مشہور پیشوا وعالم نواب صدیق حسن بھوپالی کی زبان سے سنئے۔

اور اس کا یہ راز درون خانہ چشم حیرت سے ملاحظہ فرمائیے۔

"و لما ظھر محمد بن عبد الوھاب بالدعوۃ الوھابیۃ
وانقبض عنهُ القرامطة لجاء الیٰ ابن سعود هٰذا
فصدّق دعوتهُ و قام بتائیدھا و قد غرّہ منه وعدهُ ان
یسلطهُ علیٰ بلاد نجد و کان ذالک سنة ۱۷۶۰ من
المیلاد و تزوج بابنة عبد الوھاب"

(ص۳۰۰،التاج المکلل المطبوع بومبائی،الہند)

محمد بن عبدالوہاب نے جب وہابی مشن ظاہر کیا اور قرامطہ بھی اس سے دور رہے تو اس نے محمد بن سعود (امیر درعیہ) کی پناہ لی۔ابن سعود نے اس کی بھرپور تصدیق وتائید کی۔اسے شیخ نجدی نے یہ لالچ دی کہ بلاد نجد کا حکمراں اسے ہی بنادیا جائیگا۔یہ بات ۱۷۶۰ء کی ہے۔اس محمد بن سعود کی شادی شیخ نجدی کی لڑکی سے ہوئی۔

شیخ نجدی محمد بن عبدالوہاب اور امیر درعیہ محمد بن سعود کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس پر اب بھی عمل جاری ہے۔سیاسی اقتدار آل سعود کے پاس ہے اور مذہبی مناصب آل شیخ (نجدی) کے لئے سعودی عرب میں مخصوص ہیں۔اور خطۂ نجد کے یہ مذہبی وسیاسی آوارہ گرد اپنی متحدہ طاقت اور برطانیہ کی حمایت سے حرمین شریفین وارض حجاز پر قابض ہوکر عالم اسلام کے لئے آج بھی ناسور اور سوہان روح بنے ہوئے ہیں۔

منحوس سرزمین نجد اور شاطر عیار برطانوی سامراج کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو عجیب وغریب حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول کی

تاریخ سامنے رکھئے جب جرمن وترک اور برطانیہ وفرانس وغیرہ کے درمیان پہلی عالمی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) ہوئی تو برطانیہ نے ایک طرف سعودیوں سے معاہدہ کیا کہ وہ عالم عرب میں ترکوں کے خلاف برسرپیکار ہوکر انہیں الجھائے رکھیں اور دوسری طرف یہودیوں سے معاہدہ کیا کہ اس جنگ میں اس کے سائنس داں و سرمایہ دار برطانیہ کا ساتھ دیں۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں برطانیہ وآل سعود کے درمیان یہ تحریری معاہدہ ہوا اور ۱۹۱۷ء میں برطانیہ و یہودیوں کا معاہدہ ہوا اور یہود وسعود دونوں نے اپنا اپنا متعین کردار اور اپنا اپنا کھیل اس طرح کھیلا کہ اس جنگ میں برطانیہ کو فتح وکامیابی ملی اور اس نے وعدہ ومعاہدہ کے مطابق قلب عرب میں ایک یہودی ریاست اور نجد وحجاز میں ایک سعودی حکومت کی تشکیل کے سارے راستے ہموار کر دیئے ۔ آل سعود برطانوی پشت پناہی میں نجد وحجاز پر غالب آ گئے ۔ ۱۹۲۱ء میں نجد، ۱۹۲۴ء میں مکہ مکرمہ اور ۱۹۲۵ء میں مدینہ طیبہ پر ان کی حکومت ہو گئی ۔ اور ۱۹۳۲ء میں اس مجموعہ کو ''المملكة العربية السعودية '' کا نام دیا گیا۔ اسی طرح ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام ہوا اور اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔

سعودی عرب واسرائیل کا پہلے برطانیہ سرپرست تھا اور اس کا آفتاب اقبال غروب ہونے کے بعد اب کئی دہائی سے امریکہ ان دونوں حکومتوں کا آقا وسرپرست بنا ہوا ہے ۔ اس وقت امریکہ براہ راست اور اسرائیل سعودی عرب کے توسط سے عالم عرب اور عالم اسلام کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس سے ساری دنیا واقف ہے۔

نجدی حکمراں اگرچہ حجاز پر قابض ہیں مگر مکہ مکرمہ ومدینہ طیبہ وطائف وجدّہ

وغیرہ جو حدود حجاز میں واقع ہیں ان کے باشندے سنی العقیدہ اور وہابیت سے سخت بیزار ہیں ۔ اور پورے حجاز میں آج بھی معمولات ومراسم اہل سنت ہی کا رواج ہے۔ صرف نجدی قبضہ وتسلط کی وجہ سے وہ اعلانیہ طور پر یہ کام نہیں کر پاتے ۔ مگر ان کے دل اور ان کے گھر کے اندر نجدیت ووہابیت کا آج تک گذر اور کوئی اثر نہیں ہو پایا ہے۔

وہابی مسلک نجد سے نکل کر دہلی اور سہارنپور ہوتا ہوا آج پورے برصغیر ہندو پاک میں پھیل چکا ہے ۔ جس کی ابتداء تقویۃ الایمان از شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی کے ذریعہ ہوئی اور تقویۃ الایمان شیخ نجدی کی کتاب التوحید کا چربہ ہے ۔ علماء عرب نے جس طرح کتاب التوحید کے ایمان سوز خیالات کا مقابلہ کیا اسی طرح تقویۃ الایمان کے خلاف علماء ہند نے سینکڑوں کتابیں لکھیں اور سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے مشاہیر تلامذہ نے اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

نجدیت و وہابیت کے بطن سے کئی فتنوں نے جنم لیا ۔ سعودی ریال کے سہارے دنیا بھر میں وہابیت پھیلانے کی کوشش کی گئی ۔ نہ جانے کتنی مسجدیں اور مدرسے دنیا بھر میں سعودی ریال سے بنائے گئے اور اسلام کے نام پر انہیں وہابی مرکز کے طور پر استعمال کیا گیا جس کا سلسلہ اب جا کر کچھ تھما اور رکا ہے ۔ اور ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء میں امریکہ پر ہونے والے سنگین حملہ کے بعد سعودی امداد پر کافی حد تک پابندی لگ چکی ہے ۔ اس سے پہلے خلیجی بحران ۱۹۹۱ء سے ہی یہ امداد متاثر ہو چکی تھی اور رفتہ رفتہ اس پر لگام لگنے لگی تھی ۔

غیر مقلدیت و دیوبندیت اسی وہابیت کی زہریلی شاخیں ہیں ۔ اور برصغیر ہندو پاک میں ان کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو چکی ہے ۔ بارگاہ خدا

ورسول میں جسارت واسائت کے وہی جراثیم غیرمقلدیت و دیوبندیت کے اندر بھی سرایت کئے ہوئے ہیں اور اسلاف واکابر کی بارگاہ میں گستاخی کے ان کے اندر بھی وہی ناپاک جذبات پائے جاتے ہیں جونجدیت ووہابیت کا طرۂ امتیاز ہیں۔

تبلیغی جماعت، دیوبندیت کا اس وقت ہراول دستہ بنی ہوئی ہے۔اورکلمہ و نماز کے نام پر خوش عقیدہ مسلمانوں کو دیوبندیت کا شکار بنانا تبلیغی جماعت کا محبوب مشغلہ ہے۔مسجدوں پر قبضہ کر کے انہیں دیوبندیوں کے سپرد کرنے میں تبلیغی جماعت خاصی مہارت اورفن کاری کا ثبوت دیتی رہتی ہے۔جس مسجد کے بارے میں سنیوں اور دیوبندیوں کے درمیان کچھ اختلاف شروع ہوتا ہے وہاں تبلیغی جماعت کے دستے بلا تاخیر تعینات کر دیئے جاتے ہیں۔اور ان کے سرگرم کردار کے نتیجہ میں مسجدوں پر دیوبندیوں کا بہت سی جگہوں اور بہت سے مقامات پر قبضہ ہو چکا ہے۔اس کا مشاہدہ اور تجربہ اتنا عام ہے کہ کوئی ذی ہوش اور باشعور انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا۔

یہ سطریں میں تحریر کر رہا تھا کہ آج کی ڈاک سے مجھے اردو کا ایک پندرہ روزہ ملا۔''مسلمانوں کے لئے دعوت فکر وعمل'' کے عنوان سے لکھے گئے ایک مضمون پر میری نظر پڑی۔جس کا ایک حصہ میں اپنے اس مقدمہ کے قارئین کی خدمت میں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔مضمون نگار ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی لکھتے ہیں۔

''فرقہ کے اعتبار سے یہاں مسلمانوں کے دو طبقے ہیں۔شیعہ اور سنی۔شیعہ تعداد میں قلیل اور کچھ شہروں تک محدود ومنتشر ہونے کی وجہ سے اپنے فرقہ کی بقاء اور اپنی مذہبی شناخت کے

تحفظ پر زیادہ زور دیتے ہیں۔عملی طور پر اجتماعی طریقہ سے ان کی کوئی ملی یا سیاسی سرگرمی نہیں کے برابر ہے۔

ہندوستان کے مذہبی فرقوں میں دوسرا سب سے بڑا فرقہ سنی حضرات کا ہے جس میں عام طور پر دو مشہور جماعتیں ہیں۔بریلوی اور دیوبندی۔ہندوپاک میں تعداد کے حساب سے بریلوی مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔اقتدار کی بالادستی اور سیاسی سرپرستی سے محرومی کی وجہ سے ان کے سامنے اپنی بقاء و تحفظ کا مسئلہ درپیش ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں میں ان کا کوئی ملی یا سیاسی اثر ورسوخ نہیں ہے۔اہل سنت وجماعت کا کلی طور پر اطلاق اسی جماعت پر ہوتا ہے۔باقی اہل سنت کی دعویدار دوسری جماعتوں کو یہ حضرات اہل سنت وجماعت سے منحرف سمجھتے ہیں۔

سنی میں دوسری بڑی جماعت کا نام دیوبندی ہے۔ اس جماعت کا آغاز سیاسی جدوجہد سے ہوتا ہے۔اس کے بعد سیاست دانوں سے قربت، اقتدار کی بالادستی اور سیاسی سرپرستی کی وجہ سے پورے ملک میں یہ جماعت اپنی تعلیمی وتبلیغی سرگرمیوں کے ذریعہ اپنے مسلک کو فروغ دینے میں کامیاب رہی۔یہ جماعت اپنے علاوہ مسلمانوں کے تمام مکاتیب فکر کو

مسلک اعتدال سے ہٹا ہوا سمجھتی ہے۔اس جماعت پر وہابیت کا خوشہ چیں ہونے کا الزام بھی ہے۔

تبلیغی جماعت کو بظاہر دیوبندی جماعت کا ایک حصہ کہہ سکتے ہیں لیکن آج کی تاریخ میں اس کا اپنا ایک وجود ہے۔ پوری دنیا میں اعلانیہ اور خفیہ اس کی تبلیغی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اس کے اثر ورسوخ اور ظاہری شان وشوکت کا یہ عالم ہے کہ اس سے وابستہ ہوئے بغیر دیوبندی جماعت کا وجود آج خطرے میں ہے۔جس عالم نے چالیس دن، چار مہینے، ایک سال یا چار سال نہیں لگایا اس کی امامت یا علمیت مشکوک ہے۔

اہل حدیث یا سلفی جماعت کو کچھ لوگ غیر مقلد بھی کہتے ہیں۔ ہندوستان میں بہت کم تعداد میں اور بکھرے ہوئے ہیں۔قرآن وسنت کے علاوہ یہ کسی کی تقلید کو جائز نہیں سمجھتے ہیں۔ اپنے نظریات وعقائد کی شدت کے ساتھ تبلیغ کرتے ہیں۔ یہ حضرات اپنے علاوہ دوسروں کو بدعتی اور گمراہ سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں اصلی وہابی انہیں حضرات کو کہا جاتا ہے۔

جماعت اسلامی کو ہندوستان کی آزادی سے قبل مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے قیام اسلام کی سربلندی کے لئے قائم کیا تھا۔لیکن بعد میں طریقۂ کار میں اختلاف اور کارکنان

جماعت کی عملاً وفاداری اسلام سے زیادہ جماعت کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اس جماعت کو کبھی استحکام نہیں مل سکا۔ بظاہر تنظیمی ڈھانچہ موجود ہونے اور کام کی وسعت کے باوجود عام مسلمانوں میں جماعت اسلامی ایک غیر مانوس نام ہے۔الخ‘‘

(ص۲، پندرہ روزہ خبردار جدید، دہلی شمارہ ۱۶ر ستمبر تا ۳۰ر ستمبر ۲۰۰۴ء)

مضمون نگار نے اپنے طور پر یہ تجزیہ وتبصرہ کیا ہے جس کے مطابق اہل سنت و جماعت ہی مسلمانان ہندو پاک کے درمیان سواد اعظم کہے اور سمجھے جاتے ہیں۔ در حقیقت سواد اعظم اہل سنت و جماعت ہی صراط مستقیم پر گامزن ہیں۔اور یہی مذہب و مسلک اسلاف واکابر کے وارث و جانشین بھی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے اندر تنظیمی نظم وضبط اور جماعتی فکر وشعور کا فقدان ہے اور اپنی بعض عملی کوتاہیوں کے نتیجہ میں ان کا ہمہ گیر اور مضبوط کردار واثر ورسوخ آج برصغیر ہندو پاک کے اندر کم ہی نظر آتا ہے۔

فرقہ بندی اور جماعتی تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے دہلی کے مشہور نقشبندی مجددی عالم وشیخ طریقت شاہ ابوالحسن زید فاروقی (متوفی ۱۹۹۳ء) لکھتے ہیں۔

’’حضرت مجدد (الف ثانی فاروقی سرہندی) کے زمانہ سے ۱۲۴۰ھ (مطابق ۱۸۲۵ء) تک ہندوستان کے مسلمان دوفرقوں میں بٹے رہے۔ایک اہل سنت و جماعت، دوسرے شیعہ۔

اب مولانا محمد اسمٰعیل دہلوی کا ظہور ہوا۔ وہ شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالعزیز و شاہ رفیع الدین اور شاہ

عبدالقادر کے بھتیجے تھے۔ان کا میلان محمد بن عبدالوہاب نجدی کی طرف ہوا۔اورنجدی کا رسالہ ''ردُّ الاشراک'' ان کی نظر سے گذرا۔اور اردو میں انہوں نے ''تقویۃ الایمان'' لکھی۔اس کتاب سے مذہبی آزاد خیالی کا دور شروع ہوا۔کوئی غیر مقلد ہوا،کوئی وہابی بنا،کوئی اہل حدیث کہلایا،کسی نے اپنے کو سلفی کہا۔

ائمۂ مجتہدین کی جو منزلت اوراحترام دل میں تھا وہ ختم ہوا۔معمولی نوشت وخواند کے افراد امام بننے لگے۔اورافسوس اس بات کا ہے کہ توحید کی حفاظت کے نام پر بارگاہ نبوت کی تعظیم واحترام میں تقصیرات کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔یہ ساری قباحتیں ماہ ربیع الآخر ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) کے بعد سے ظاہر ہونی شروع ہوئی''۔

(ص ۹،تقویۃ الایمان اور مولانا اسمٰعیل دہلوی-شاہ ابوالخیر اکیڈمی چتلی قبر،دہلی ۲)

شاہ اسمٰعیل کی رسوائے زمانہ کتاب تقویۃ الایمان کے اثرات ونتائج کا ذکر کرتے ہوئے معروف دیوبندی عالم مولانا احمد رضا بجنوری کہتے ہیں کہ

'' افسوس ہے کہ اس کتاب (تقویۃ الایمان) کی وجہ سے مسلمانان ہندو پاک جن کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ ہے اور تقریباً نوے فیصد حنفی المسلک ہیں،وہ دوگروہ میں بٹ گئے''۔

(ص ۱۰۷،انوارالباری جلد ۱۱،مرتبہ مولانا احمد بجنوری مطبوعہ ناشر العلوم بجنور،یوپی)

مولانا ابوالکلام آزاد بیان کرتے ہیں کہ

''والدمرحوم کہا کرتے تھے کہ گمراہی کی موجودہ ترتیب یوں ہے کہ پہلے وہابیت پھرنیچریت۔نیچریت کے بعد تیسری قدرتی منزل جوالحاد قطعی کی ہے اس کا وہ ذکرنہیں کرتے تھے۔اس لئے کہ وہ نیچریت ہی کو الحاد قطعی سمجھتے تھے۔لیکن میں اسے تسلیم کرتے ہوئے اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ تیسری منزل الحاد ہے۔اورٹھیک ٹھیک مجھے یہی پیش آیا۔سرسید مرحوم کوبھی پہلی منزل وہابیت ہی کی پیش آئی تھی''۔

(ص ۳۰۹،آزاد کی کہانی،مطبوعہ لاہور)

اور وہابی سرچشمہ سے سیراب ہونے والے دومراکز کے بارے میں شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال کا خیال ہے کہ

''قادیانی''اور''دیوبندی''اگر چہ ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔اوردونوں اس تحریک کی پیداوار ہیں جسے عرف عام میں ''وہابیت'' کہاجاتا ہے''۔

(ص ۲۶۲،اقبال کے حضور،ازسید نذیر نیاز،مطبوعہ اقبال اکیڈمی کراچی)

متوارث طور پر مذہب حق کے حامی وعلم بردار اہل سنت وجماعت ہی ہیں۔جنہیں عالم اسلام اور برصغیر ہندوپاک میں سواداعظم کی حیثیت حاصل ہے۔یہی اسلام کے حقیقی وارث وامین ہیں۔ہدایت یافتہ اور ناجی یہی سنی ہیں۔اورسنیت کی دستار فضیلت انہیں کے سرزیب بھی دیتی ہے۔سنی کی تعریف کیا ہے اورسنی کسے کہتے ہیں اس

کے بارے میں صدرالافاضل حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی تحریر فرماتے ہیں۔

''سنی وہ ہے جو **ما انا علیہ و اصحابی** کا مصداق ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خلفاء راشدین، ائمہ مجتہدین، مسلم مشائخ طریقت اور متأخر علماء کرام میں سے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ملک العلماء حضرت بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی، حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی، حضرت مولانا شاہ فضل رسول بدایونی، حضرت مفتی ارشاد حسین رام پوری اور حضرت مولانا مفتی احمد رضا بریلوی کے مسلک پر ہوں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ''

(ص۹، الفقیہ امرتسر پنجاب، شمارہ ۲۱ راگست ۱۹۲۵ء)

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل و احسان اور بے پناہ شکر ہے کہ اس نے ہمیں طریق قویم وصراط مستقیم پہ قائم رکھا۔ اور ہم اہل سنت وجماعت کو سواد اعظم بنایا۔ اس سواد اعظم کے افراد بالخصوص علماء وخواص کے بڑے فرائض اور ان کی بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ جو بڑا ہوتا ہے وہ دوسروں کی بہ نسبت مصائب وبلایا سے زیادہ دوچار ہوتا ہے اور اسے مشکلات بھی طرح طرح کی پیش آتی ہیں۔ کیونکہ **العطایا علیٰ قدر البلایا**۔ اور جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

ہمارا مذہبی واخلاقی فریضہ ہے کہ اپنے حصار اپنی فصیل اور اپنے قلعہ کو حتی الوسع محفوظ ومضبوط رکھیں۔ اپنی حد سے کسی کو تجاوز کرنے کی اجازت نہ دیں اور نہ ایسے اسباب پیدا ہونے دیں کہ ہمارا کوئی فرد اپنے دائرہ سے باہر نکل سکے۔ اور جو کسی

وجہ سے کسی طرح باہر نکل گئے ہیں ان کی اصلاح کر کے انہیں اپنے قریب کریں کہ قانون فطرت اور خیر خواہی اسی کے اندر ہے کہ جب کوئی اپنا شخص بیگانہ ہونے لگتا ہے تو محبت وہمدردی کے ساتھ اسے سمجھا بجھا کر اپنی پرانی ڈگر پہ لایا جاتا ہے۔ ہاں! جب اس کی شر پسندی اور بدطینتی بے قابو ہو جائے اور اس کے خیال واحوال کی اصلاح کی امید باقی نہ رہ جائے تو اس سے کنارہ کشی کر لینے ہی میں عافیت اور بھلائی ہے۔

اس وقت سواد اعظم کے تعلق سے دو دو چار کی طرح میرے پردۂ ذہن پہ جو احساسات وحقائق ابھر رہے ہیں انہیں مختصر الفاظ میں اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ انہیں پڑھ سن کر کچھ اثر قبول اور جس حد تک ممکن ہو ان پر عمل کرنے کی کاوش وکوشش کریں۔

(الف)

اصلاح فکر و اعتقاد: سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ اپنے عقیدۂ توحید و رسالت سے عقیدۂ روز جزاء وسزا تک کو ہر مرحلۂ حیات میں واضح وغیر متزلزل رکھیں۔ کسی انحراف وکج روی کو پاس پھٹکنے نہ دیں۔ اور خدانخواستہ کبھی کوئی ایسا وسوسہ دل کے اندر پیدا بھی ہو جائے تو اسے دل ودماغ سے جھٹک کر اس سے اپنا دامن چھڑا لیں۔ اور اپنے فکر واعتقاد کی اصلاح کر لیں۔ عقیدہ اصل اور عمل اس کی فرع ہے۔ عمل پر عقیدہ مقدم ہے۔ لیکن عمل بھی ہر حال میں ضروری ہے۔ صرف عقیدہ کو درست رکھنا اور عمل سے غافل رہنا درحقیقت صحت عقیدہ پر ہی ایک سوالیہ نشان ہے کہ آیا وہ درست ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر صحت عقیدہ کے باوجود عمل سے غفلت برتی جا رہی ہے تو یہ بھی

فریب نفس اور اغواءِ ابلیس ہے۔عقیدہ وعمل کا باہمی رشتہ انہیں ایک دوسرے سے کبھی الگ نہیں ہونے دیتا۔انبیاء واولیاء وصحابہ وتابعین کی زندگی اس کی واضح دلیل ہے۔ اوران کی سنت ہی ہمارے لئے نشان ہدایت اور نجات دہندہ راہ عمل ہے۔

التزام فرائض وواجبات: فرائض وواجبات کی پابندی اعمال صالحہ میں سب پرمقدم ہے۔اوراس سے وہ جہاں قرب خداوندی کا مستحق ٹھہرتا ہے وہیں بندوں کی نظر میں بھی وہ درجۂ اعتبار پہ فائز ہوتا ہے۔مستحبات ومباحات کا مرحلہ اس کے بہت بعد کا ہے۔محض مستحبات ومباحات میں منہمک رہنا اور فرائض وواجبات سے غافل رہنا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔اورسارے مسلمانوں کو یہ مسئلہ اچھی طرح معلوم ہے کہ بندہ کے اعمال مستحبہ ومباحہ مقبول اسی وقت ہوتے ہیں جب ان کے ساتھ اعمال واجبہ کا بھی التزام واستمرار ہو۔مباحات ومستحبات سے شغف اور فرائض وواجبات سے غفلت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بے توفیقی وبدنصیبی کا عنصر ضرور غالب ہے جس کے اثر اور انجام سے کسی مسلمان کو ہرگز بے پرواہ نہیں ہونا چاہئے۔

دعوت خیر وفلاح: اپنے اندرون اپنے باطن اوراپنے قلب کو جذبات خیر وفلاح سے معمور رکھ کراپنی بساط واستطاعت کی حد تک دعوت خیر وفلاح کو عام کرنا ہر باشعور مسلمان کا فریضہ ہے۔خیر وفلاح مسلم معاشرہ کی امتیازی شان ہے جس کی بقاء وتحفظ کی طرف سے علماء وخواص کی کوتاہی زوال وانحطاط امت کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔

خوف وخشیت وامید ومغفرت وشفاعت: خوف خداوندی وخشیت ربانی جس دل میں جاگزیں ہووہی دل بارگاہ الٰہی میں معزز ومقبول ہے۔یہ خوف وخشیت ہر مسلمان کو غلط روی سے دور رکھتی ہے اوراسے نیک کاموں پر آمادہ برانگیختہ

کرتی ہے۔پھرانجام کاراسے امیدوار مغفرت وشفاعت بناتی ہے۔لیکن صرف اس امید پر اپنی بے عملی وبدعملی کی بنیاد رکھنا کہ اللہ رحیم وکریم ہے، بڑا ستار العیوب وغفار الذنوب ہے وہ ضرور ہماری مغفرت وبخشش فرمادے گا۔اور ہمارے نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم رؤف ورحیم ہیں، شفیع المذنبین ومقبول الشفاعۃ ہیں۔وہ بارگاہ رب تعالیٰ میں شفاعت کرکے ہماری مغفرت کراہی لیں گے۔اس طرح کا خیال اورایسی امید رکھنا بہت بڑی بھول اورسخت نادانی ہے۔

(ب)

علم وبصیرت: ضروریات دین کا علم رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ان کے علاوہ دیگر علوم ومعارف اسلامیہ اور حسب ضرورت وافادیت فنون عصریہ کی تعلیم وتحصیل بھی بحیثیت امت وملت سواد اعظم کے لئے ضروری ہے۔احوال ووقائع زمان ومکان سے واقفیت اور دیگر شعبہائے حیات کے امور ومسائل پر نظر اور بصیرت وژرف نگاہی بھی سواد اعظم کے لئے لازم ہے کہ اسے پوری امت وملت اسلامیہ کی قیادت وسربراہی اور نمائندگی وترجمانی کے منصب رفیع پر فائز کیا گیا ہے جس سے عہدہ برآ ہونا اس کا فرض منصبی ہے۔کیا اس علم وبصیرت کے ہم حامل ہیں؟ اور کیا آج کے حالات میں ہم اپنے آپ کو اس نعمت اورعظیم خدمت کا اہل ثابت کرپارہے ہیں؟

وقار واعتماد: اپنے فضل وکمال اوراپنے اخلاق وکردار کی برکت سے قوم وملت کے درمیان اپنا وقار واعتماد اور اثر ورسوخ پیدا کرنا ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔اوراس کامیابی کا دائرہ اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر قوم وملت کے عمومی مفادات تک وسیع کردینا اس سے بڑی کامیابی ہے۔اپنے تعلقات واثرات اوراپنی شہرت ونیک نامی صرف اپنے لئے نہیں بلکہ پوری قوم وملت کے لئے مفید ہونی چاہئے۔پوری سنجیدگی کے

ساتھ طبقۂ علماء وخواص کو اس جانب خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ: اللہ کی راہ میں ہر وہ چیز خرچ کرنا جو اپنے مقدور میں ہے جس طرح مال کی قربانی دی جاتی ہے اسی طرح اپنے علم، اپنی عقل، اپنے تجربہ، اپنی صلاحیت، اپنے وقت، اپنی جان وغیرہ کی بھی قربانی دی جاتی ہے۔ اور ہر قدم پر ہمیں یہ قربانی دینے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ مال کی قربانی اہل غناء وثروت کا کام ہے اور انہیں اس کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ ان کا جمع کردہ مال صرف اپنے لئے خرچ ہورہا ہے یا مرضیات الٰہی کے مصارف میں بھی اس کا کچھ حصہ قربان کیا جارہا ہے؟ اگر ایسا کچھ نہیں ہے تو پھر وہ مال اس کے لئے درحقیقت سامان راحت نہیں بلکہ باعث عبرت اور سبب زحمت ہی ثابت ہوگا۔ اور ہاتھ کا یہ میل کسی نہ کسی دن اسے کف افسوس ملنے پر مجبور کردے گا۔

احتساب امور: محاسبۂ نفس، احتساب امور، ضبط اوقات اور جائزۂ اعمال کی صفت جس کے اندر پیدا ہوجائے وہ بڑی آسانی کے ساتھ اپنی دینی ودنیوی زندگی کو کامیاب وبامراد بنا سکتا ہے اور اپنے آپ کو بے شمار لغزشوں، خطاؤں سے دور رکھ کر دوسروں کے لئے بھی وہ نمونۂ عمل بن سکتا ہے۔ اپنی سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کرسکتا ہے اور مستقبل کی زندگی کو روشن وتابناک بنا سکتا ہے۔ اس صفت احتساب وجائزہ کا مسلمانوں کے اندر افسوسناک حد تک فقدان ہوتا جارہا ہے اور ان کی اجتماعی زندگی وانفرادی امور ومعاملات کو عام طور پر شتر بے مہار بناتا جارہا ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ **حاسبوا قبل ان تحاسبوا**۔

(ج)

اجتماعی وملی شعور: شخصی وانفرادی مفادات کی تحصیل وتحفظ ہر آدمی کرتا رہتا ہے مگر ہمارا تجربہ مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ سواد اعظم کے اجتماعی وملی شعور وادراک کی صلاحیت کم ہی لوگوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ اپنے محدود اغراض ومقاصد حاصل کرلینا کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ غایت کمال تو یہ ہے کہ ہمارے اندر اجتماعی وملی شعور اس حد تک پیدا ہوجائے کہ قوم وملت کے جذبات ومفادات کے حصول کو ہم اپنی اصل پونجی اور سرمایۂ حیات سمجھنے لگیں۔ صرف اپنے مفاد کی تحصیل وتحفظ تو حیوان بھی کرلیتے ہیں۔ کیا انسان وہ بھی اشرف المخلوقات وہ بھی خیر امم وہ بھی سواد اعظم اسی لئے جینے اور مرنے لگے تو وہ سواد اعظم کہے اور سمجھے جانے کا مستحق ہے بھی یا نہیں؟ یہ نکتہ سمجھنے کا ہے اور یہ بات غور کرنے کی ہے۔

تنظیم وتحریک: سواد اعظم کو منظّم ومتحرک رکھنے کے لئے تنظیم وتحریک از بس ضروری ہے۔ بالخصوص آج کے دور میں وہی قومیں اور وہی جماعتیں زندہ وفعال رہتی ہیں جو تنظیم وتحریک کے ذریعہ اپنے افراد کو ہر لمحہ سرگرم اور رواں دواں رکھتی ہیں۔ اپنے اہداف ومقاصد کو پیش نظر رکھتی ہیں اور میدان عمل میں اتحاد ونشاط اور اپنی قوت وطاقت کا مظاہرہ کرتی رہتی ہیں۔ کیا اس بات میں ہمارا کردار بھی ایسا ہی ہے؟ اور کیا اس معرکۂ حیات میں ہم بھی نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو رہ کر اپنی قوم وملت اور سواد اعظم کو مفتخر وباوقار بنانے کا کچھ سامان کررہے ہیں؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے سواد اعظم کے اصحاب فکر ونظر وارباب بست وکشاد کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہئے۔ اور کوئی نہ کوئی حل انہیں ضرور ڈھونڈ نکالنا چاہئے۔

تحریر وخطابت: خطابت کی دولت سے سواد اعظم کا دامن مالا مال ہے مگر تحریر کے سلسلے میں اس کی سست روی بے حد قابل افسوس ہے۔ کچھ توجہ ادھر چند سالوں سے ہوئی ہے مگر اسے بھی اطمنان بخش نہیں کہا جا سکتا۔ تحریر وخطابت دونوں کی افادیت ونتیجہ خیزی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس سے وابستہ افراد کو سواد اعظم کی ضرورت کے لحاظ سے اپنے اپنے موضوعات کا انتخاب کرنا چاہئے اور رفتار زمانہ کا بھی پورا پورا خیال رکھنا چاہئے۔ کتاب و سنت اور اقوال وارشادات صحابہ وائمۂ مجتہدین کی روشنی میں ہر اہم موضوع اور اس کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے کہ قوم وملت کی قیادت وامامت انہیں صحیح معنوں میں حاصل ہو سکے۔ اور ان کی تحریر وخطابت سارے زمانے کے لئے مشعل راہ بن سکے۔

تقسیم عمل: ہر علم ہر فن اور ہر شعبۂ عمل کے الگ الگ مطالبات ہوا کرتے ہیں۔ اور اس کے حساب اور مناسبت سے جن افراد کی صلاحیتیں مفید ہوں انہیں ہی خصوصیت کے ساتھ اس سے وابستہ اور منسلک بھی رہنا چاہئے۔ ہر فرد ہر کام کا نہیں ہوتا ہے اور نہ ہر کام ہر فرد کے مناسب مزاج وصلاحیت ہوا کرتا ہے۔ اس لئے تقسیم عمل اجتماعی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اور اس ضرورت کی تکمیل بہتر طور پر اسی وقت ممکن ہے جب فن اور فرد دونوں کے اندر مکمل طور پر ہم آہنگی پائی جائے۔ خود اپنے انتخاب یا باہمی مشورہ کے ذریعہ اس تقسیم عمل اور شعبۂ کار کے تقاضا کو پورا کیا جائے کہ یہ کام ہم سے مدتوں سے متقاضی ہے کہ اسے جلد از جلد کر لیا جائے اور اس کے لئے جہاں مناسب افراد کی خدمت حاصل کی جائیں وہیں ضروری اسباب و وسائل کا بھی مناسب انتظام کر لیا جائے۔

د

مساجد: مساجد ہماری نماز وعبادت کی مخصوص جگہیں ہیں اور ساتھ ہی ملت اسلامیہ کی اجتماعی زندگی کو بھی انہیں مساجد سے روشنی اور سیرابی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ مذہبی تقریبات ودیگر مواقع پر ان کے ائمۂ کرام اپنے مقتدیوں ومصلیوں اور عام مسلمانوں کی رہنمائی کا بھی فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔ درس قرآن ودرس حدیث سے بھی ان کے ایمان وعمل کو جلا ملتی رہتی ہے۔ دنیوی امور اور انتخابی سیاست سے انہیں پاک رکھ کر اور قابل اعتراض باتوں سے پرہیز کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات وارشادات وعلوم و معارف ومصالح ومفادات پر گفتگو وتبادلۂ خیال کے لئے مزید بہتر انداز میں ان سے استفادہ کیا جانا چاہئے۔ اور اس کے لئے مناسب طرز وطریقہ استفادہ کا ایک پورا لائحہ فکر و عمل وضع کر لینے اور مسلم رائے عام کو اس کے لئے اچھی طرح ہموار کر لینا چاہئے۔

مدارس: شہر شہر قریہ قریہ اسلامی مدارس قائم ہیں جن کے فیض سے مسلم معاشرہ کے اندر اسلامی روح ومسلم تہذیب وتمدن اور اپنی زبان ولباس کو اپنائے رکھنے کا جذبہ بیدار رکھنے کی ہر جگہ وسیع ترین اور مؤثر خدمت انجام دی جا رہی ہے۔ ان مدارس کے نصاب ونظام تعلیم کو مزید جامع ونفع بخش بنانا ان کا حساب وکتاب اور ان کی نظامت وادارت کے معاملات کو مزید صاف وشفاف رکھنا صرف اصولی طور پر نہیں بلکہ حالات حاضرہ کے تحت بھی بہت ضروری ہے۔ جن مدارس میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے وہاں ایک اچھی لائبریری، طلبہ کے مشقی جلسے، مختلف موضوعات پر تحریری مقابلے اور اچھی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے

والے طلبہ کی حوصلہ افزائی اور مناسب انعامات کا بھی انتظام کیا جانا چاہئے۔ اچھی تعلیم کے ساتھ طلبہ کی اچھی تربیت اور ان کے اندر تبلیغی و دعوتی مزاج اور اور مستقبل میں قوم و ملت کی ہمہ جہت رہنمائی کا جذبۂ بے تاب پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ قوم کے مخیّر و اصحاب ثروت کا فرض ہے کہ وہ ان مدارس کی مالی امداد و اعانت کریں اور انہیں مالی خسارہ و بحران سے بچائے رکھنے کی بھر پور کوشش کرتے رہیں کہ اس دور میں دنیا تو دنیا ہی ہے دین کی خدمت بھی بڑی حد تک مال و زر سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہے۔

خانقاہیں: خانقاہوں کا ماضی بڑا ہی تابناک مگر حال بے حد افسوسناک ہے۔ تاہم سواد اعظم اب بھی قدیم خانقاہوں کی عقیدت اپنے دل میں بسائے ہوئے ہے۔ اور بزرگان دین و اولیاء کرام کی شمع محبت آج بھی ان کے دل میں فروزاں ہے اس لئے ان خانقاہوں کے مشائخ و سجادہ نشین حضرات جو عموماً علم و عمل سے عاری ہوتے ہیں وہ اپنے آباء و اسلاف کی وراثت کا صحیح حق ادا کرنے لگیں اور اصلاح احوال کرلیں تو ان سے دین کا بڑا کام ہو سکتا ہے۔ دعوت و ارشاد کا فیض بڑے پیمانے پر جاری ہو سکتا ہے۔ روحانی فیض کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو سکتا ہے۔ اور ان خانقاہوں کی عظمت رفتہ اب بھی بحال ہو سکتی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان کے منتسبین و وارثین رزق حلال و صدق مقال کا دامن تھام کر طلب و سوال سے اجتناب و احتراز کو اپنا شیوہ بنائیں کہ یہ خانقاہیں دنیا طلبی نہیں بلکہ دین پروری کے لئے ہمارے بزرگوں نے بنائی تھیں اور انہیں کی روش پہ چل کر آج بھی انہیں جیسی روشنی ان خانقاہوں کے ذریعہ مسلم معاشرہ میں پھیلائی جاسکتی ہے۔

اجلاس: ہندو پاک میں سال بھر تک دینی محافل اور مذہبی جلسوں کے انعقاد کا سلسلہ چلتا رہتا ہے عوام تک پہونچنے اور ان تک اپنی بات پہونچانے کا یہ جلسے بہترین ذریعہ و وسیلہ ہیں۔ یہ عوام خود جلسوں کا انتظام کر کے علماء کرام کو مدعو کرتے ہیں اور ان کے خطابات سے مستفید ہوتے ہیں۔ رسمی و روایتی تقریروں کے علاوہ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ہمارے خطباء و مقررین ہر ضروری موضوع پر مطالعہ و تیاری کے ساتھ عوام کو خطاب کریں۔ عوام کو آج کے حالات اور ان کے تقاضوں سے بھی باخبر کیا جانا چاہئے اور ان کی معاشرتی اصلاح کے عنوان سے بھی مؤثر و دل نشیں تقریریں کی جانی چاہئیں۔ صحیح وقت پر جلسہ کا آغاز اور صحیح وقت پر اس کا اختتام ہو جانا چاہئے کہ ان کے سامعین کے اندر نشاط بھی باقی رہے اور وہ جلسہ کے بعد سو کر اٹھیں تو نماز فجر بھی باجماعت ادا کرسکیں کہ جلسہ کا انتظام کرنا یا اس کے اندر تقریر کرنا یا اس تقریر کو سن لینا محض ایک امر مستحب ہے اور فجر کی نماز ان کے اوپر فرض ہے اور جماعت سے نماز ادا کرنا واجب ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
عشق ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

☆

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

خطرات کے بادل سواد اعظم کی آبادیوں کے اوپر منڈلاتے جا رہے ہیں

اورہم ہیں کہ خواب غفلت سے بیدار ہونے کا نام نہیں لے رہے ہیں ۔ یہ خطرات کئی طرح اور کئی رنگ کے ہیں ۔ اور کئی طرف سے اٹھ اٹھ کر ہماری آبادیوں پہ زہریلی بارش برسا رہے ہیں ۔ ان خطرات کو روکنے انہیں دور کرنے اور ان کی زد سے اپنے آپ کو بچانے کی ہمیں ہر ممکن تدبیر کرنی چاہئے ۔

خطرات کے بادل آپ کے سامنے ہیں ۔ آپ کی نظران پر جمی ہوئی ہے ۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بادل کے قطرات سواد اعظم کے وجود اور اس کے بڑے حصہ کو بھگونے کے درپے ہیں ۔ آپ کا فرض ہے کہ زہریلے قطرات سے آپ خود بھی بچئے اور دوسروں کو بھی بچائیے ۔ **الغیاث و الامان** کی پرسوز و پرشور صداؤں سے سواد اعظم کو چوکنّا کیجئے ۔ اور بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی بن کر پاسبان ملت و نقیب ملت و مصلح امت و مناظر اہل سنت کی حیثیت سے یہ صدا بلند کرتے رہئے کہ

سونا جنگل رات اندھیری چھائی بدل کالی ہے
سونے والو! جاگتے رہیو چوروں کی رکھوالی ہے

’’خطرات کے بادل‘‘ میں جہاں نجد و دہلی وسہارنپور کی وہابیت اور اس کے خطرات سے آگاہ کیا گیا ہے وہیں خود اپنی جماعت کے اندر، اپنے سواد اعظم اہل سنت و جماعت کے اندر اور اپنے حلقوں کے اندر جو کمیاں و کوتاہیاں اور خرابیاں پیدا ہوتی جارہی ہیں ان سے بھی مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے ۔ باہر کے خطرات ہوں کہ اندر کے خطرات ہوں یہ سواد اعظم ہر دو طرح کے خطرات کی زد میں ہے ۔ اور اس زد سے باہر نکال کر سنی مسلمانوں کو محفوظ و مامون رکھنا علماء کا فرض ہے، مشائخ کا فرض ہے،

قائدین و عمائدین کا فرض ہے، دانشوران ملت کا فرض ہے اور اصحاب دولت و ثروت کا بھی فرض ہے ۔ اور اس فرض سے عہدہ برآ ہونا ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے ۔

’’خطرات کے بادل‘‘ کا اگر چہ میں بالاستیعاب مطالعہ نہ کرسکا اور جستہ جستہ ہی اسے دیکھنے کا موقع مل سکا لیکن اس کے مصنف شیخ طریقت حضرت مولانا سید رکن الدین اصدق چشتی قادری کا اچھا خاصا میرا مشاہدہ و مطالعہ ہے ۔ آپ الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور ضلع اعظم گڈھ اترپردیش کے فارغ التحصیل اور مجھ سے سینئر فارغین اشرفیہ میں سے ہیں ۔ استاذ گرامی حضور حافظ ملت مولانا الشاہ عبد العزیز محدث مبارکپوری علیہ الرحمۃ والرضوان کے خصوصی اور محبوب تلامذہ میں آپ کا شمار ہوتا ہے ۔ ایک مدت تک آپ رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے قائم کردہ ادارۂ شرعیہ بہار کے فعال و معتمد مہتمم رہ چکے ہیں ۔ پھر بہار شریف ضلع نالندہ بہار کو آپ نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور ’’دارالعلوم اصدقیہ مخدوم شرف‘‘ کے نام سے بہار شریف میں ادارہ قائم کرکے اسے اپنے خون جگر سے پروان چڑھایا اور اس کی متعدد شاخیں قائم کرکے اس کی تعمیر و ترقی کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کردی ۔

حضرت مولانا سید رکن الدین اصدق چشتی قادری مصباحی مدّ ظلہ ہماری جماعت اہل سنت کے مشہور عالم، تجربہ کار مہتمم، معروف خطیب، مقبول مدرس اور بہترین صاحب قلم ہیں ۔ اخلاص و دردمندی اور جماعتی و مسلکی سوز و ساز کا آپ ایک چلتا پھرتا نمونہ ہیں ۔ جہاں جہاں میں نے آپ کی تازہ کاوش ’’خطرات کے بادل‘‘ کا مطالعہ کیا آپ کی فکر کو واضح اور مشاہدہ و تجربہ کو وسیع پایا اور قابل قدر پہلو یہ ہے کہ صرف تنقید و تبصرہ

نہیں بلکہ تحفظ مذہب وملت اور اصلاح قوم آپ کا از اول تا آخر مطلوب ومقصود ہے۔

رب کائنات آپ کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ ہم سب کے علم وعمل میں برکت عطا فرمائے۔ اور ہمیں سواد اعظم اہل سنت و جماعت کی بیش از بیش خدمت کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

☆☆☆

یٰسین اختر مصباحی

بانی وصدر دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

یوم جمعۃ المبارکہ ۲۴/رجب ۱۴۲۵ھ/۱۰/ستمبر ۲۰۰۴ء

فون نمبر: 011-32802937-26986872

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطرات کے بادل

حصہ اول

تصویر کا پہلا رخ

جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے، جو سنے اسے بھی خلش رہے
کہ فسانہ زلف دراز کا، میری زندگی سے دراز ہے
(شادؔ عظیم آبادی)

کل یوم ابتر: گذرے ہوئے دنوں سے ہر آنے والا دن زیادہ برا ہوگا۔

ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ کے آئینے میں ہر آنکھ اس کی صداقت کو دیکھ رہی ہے اور ہر حساس دل اس کے غم کے بوجھ کو محسوس کر رہا ہے۔ ظہور اسلام کے بعد بنام مسلم جو قوم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں جمع ہوئی اس نے آپ کے ہاتھ پر جان و دل کا ایسا سودا کیا کہ ناموس رسالت اور آبروئے اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا کر ہمیشہ شاد نظر آتی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ سامنے آیا کہ نصف صدی میں آدھی دنیا پر وہ چھا گئی اور مہذب دنیا کی اقوام اس کی شوکت گدایانہ کو دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گئیں۔

دور خلافت کے بعد ——— نبی کے فیض صحبت سے مالا مال صحابہ کی نورانی صف آہستہ آہستہ اٹھتی چلی گئی۔ اس کے بعد مسلمان جاہ طلبی، اقتدار پسندی، ہوس مال اور سامان عیش وعشرت کی طرف راغب ہونے لگے یہاں تک کہ حظّ نفس کی ہر راہ انہوں نے اپنالی۔ آپسی انتشار، باہمی خلفشار، شر وفساد اور قتل وقتال تک نوبت جاپہونچی۔

جس کا حاصل یہ نکلا کہ اقوام عالم پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور انفس وآفاق پر چلنے والے ان کے سکے کھوٹے قرار پانے لگے۔ اسلامی تعلیمات سے جب بتدریج دوری بڑھتی گئی تو عمل کے نقائص کے ساتھ ساتھ عقیدے کے فساد کا بھی دروازہ کھلا اگر بد نصیبی سے فرماں روا اور حاکم وقت بھی نوزائیدہ فتنے کی طرف مائل ہوگیا تو اسے کافی فروغ حاصل ہوا اور ''**الناس علیٰ دین ملوکھم** '' کے تحت قوم آوے کا آوہ بگڑ گئی۔

عالمی تاریخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ——— بہت سارے فتنے دین دار بادشاہوں کی مداخلت سے درگور ہوگئے۔ اور مختلف ادوار کے فتنوں کو گمراہ سلاطین نے پروان چڑھایا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ دینی بیماری بہت پرانی ہے۔ دولت ومنصب والوں کی شمولیت کو لوگ تحریک کی صداقت کا معیار سمجھتے ہیں۔ ابتداً پرستاران اسلام کی صف میں غرباء کی کثرت تھی جسے دیکھ کر جاہ پرستوں نے یہی آواز اٹھائی تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے نیچے مفلوک الحال لوگوں کے سوا اور کون ہے۔ فتنوں کے فروغ کے لئے ہمیشہ دو چیزیں مطلوب ہوتی ہیں۔ ایک دولت، دوسری طاقت۔ دولت کے ذریعہ ضعیف الایمان لوگوں کے دل خریدے جاتے ہیں اور طاقت کے بل بوتے پر قوی الایمان لوگوں کی آواز دبائی جاتی ہے۔ اب سے لے کر صدیوں پیشتر تک ہزارہا فتنے اٹھے اور مادی وسائل کے سہارے آگے بڑھے پھر رفتہ رفتہ ان کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں اور وہ کسی گوشے میں محدود ہوکر رہ گئے اور بعض تو ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئے۔ جب آپ ان کے زوال کے اسباب تلاش کریں گے تو یہ حقیقت بے نقاب ہوکر روز روشن کی طرح

سامنے آجائے گی کہ حق پرست علماء نے اپنی جانوں کو داؤ پر لگا کر ان فتنوں کا سد باب کیا یا خدا ترس صوفیاء سد سکندری بن کر ان کی راہ میں کھڑے ہو گئے ۔ مگر آج جو فتنے پنپ رہے ہیں اور باطل نظریات کو جو فروغ حاصل ہو رہا ہے اس کی وجہ اگر مادی اسباب و وسائل کی فراوانی ہے تو دوسری طرف علماء حق کی غفلت ، لاپرواہی اور کوتاہیوں کا پورا پورا عمل دخل بھی ہے ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کل داور محشر کے حضور وہ اپنی کاہلی کے لئے کون سا حیلہ تلاش کریں گے اور خدائی مواخذہ سے کیونکر بچ سکیں گے ۔

لاریب! اس دور انحطاط میں مشیت کا دخل بھی ضرور ہے ——— بے دینی ، بے غیرتی ، بے حیائی ، بے راہ روی اور بدعقیدگی جو معاشرے کے اندر بڑی تیزی سے راہ پا رہی ہے ، معائب و معصیت کو جو قبول عام حاصل ہو رہا ہے ، آوارگی اور عریانیت جو فیشن شمار کی جا رہی ہے یہ سب دور آخر کی نشانیاں ہیں اور قرب قیامت کی علامات ہیں ——— فرمان نبوی کے مطابق ایک دن وہ بھی آنا ہی ہے جب نکوکار لوگ ، دینداروں کی قبروں پر جا کر تمنا کریں گے ——— کاش! ہم اس قبر میں ہوتے ۔ یعنی یہ برا دن دیکھنے کو زندہ نہ رہتے ۔ ظاہر ہے کہ یکبارگی ایسا دن نہیں آجائے گا اس کے آثار بہت پہلے سے رونما ہونگے اور انتہا اس کی خروج دجال پر ہوگی تو جب تک افق عالم پر ضلالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے نہیں چھا جاتے اور حالات دجال کے موافق نہیں ہو جاتے اس وقت تک اس کا خروج کوئی معنی نہیں رکھتا ۔

واضح رہے کہ ——— قبروں سے بیزار لوگ ، قبروں پہ نہیں جائیں گے وہ ہم ہی میں سے ہونگے جو اپنے دلوں کا کرب اپنے بزرگوں کے آستانوں پر اس

تمنا کے ذریعہ ظاہر کریں گے اس کی دو بنیادی وجوہات ہوں گی ——— ایک پاس پڑوس میں رہنے والوں کی بداعمالی ، دوسری دینداری کا دم بھرنے والوں کے ہاتھوں اسلامی عقائد کی پامالی ۔ اس وقت اہل حق میں اتنی سکت باقی نہ رہے گی کہ باطل نظریات کی راہ میں چٹان بن کر کھڑے ہو سکیں یا طاغوتی فوج کے لئے سد سکندری بن جائیں ۔ وہ خود بے کسی کا مزار بن چکے ہونگے اور اس تمنا کے سوا ان کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہ ہوگا ۔ یہ باتیں آپ کے لئے حیرت کا باعث ہوں تو ہوں ، مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہے ۔ میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ کل تک جو جماعتیں نقاب پوش تھیں ، اپنے ہتھیار کمین گاہوں میں چھپا کر رکھتی تھیں اور نہایت خفیہ طریقے سے نقب زنی کر کے لوگوں کو اپنے معتقدات کا اسیر بنایا کرتی تھیں ——— اب وہ ہتھیار بند ہو کر سڑکوں پر نکل آئی ہیں اور ہمارے ہی جوان ان کے توپ خانے اٹھائے آبادیوں میں دندناتے پھر رہے ہیں ۔ کل تک جن لوگوں کے بارے میں بدعقیدگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا وہ عقائد حقہ سے منحرف ہو رہے ہیں ۔ اور جن خاندانوں میں عریانیت کا گمان کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا وہاں بے حیائی عام ہوتی جا رہی ہے ۔

حالات کی ان تبدیلیوں میں کوئی صدی نہیں گذری ۔ مجھے اپنا عہد طالب علمی یاد ہے اور پھر آج کے ماحول پر نظر کرتا ہوں تو صرف چالیس سال کی مدت میں وہ سب کچھ ہو گیا جو کبھی خواب تھا ۔ سیاسی اور ملکی حالات جس تیزی سے بگڑے اسی سرعت سے مسلمانوں پر مسلکی اور فکری زوال بھی طاری ہوا ۔ حیرت ان جوانوں پر نہیں ہے جنہوں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے گرد و پیش میں بدعقیدگی کے گندے نالے

دیکھے اور اسی میں ڈبکی لگانے لگے بلکہ افسوس ان بوڑھوں پر ہے جنہوں نے صالح عقائد ونظریات کی مشکبار نہریں دیکھیں اوران میں خوب خوب غوطہ لگا کر فکر وخیال کی طہارت حاصل کی ، بجائے اس کے کہ وہ جوانوں کو آلودگی سے بچاتے اور انہیں طہارت نفس کے لئے پاکیزہ نہروں کی نشاندہی کرتے ،خود ہی گندے نالے میں کود پڑے اور سر سے پاؤں تک آلودہ ہوگئے ۔

ہوئی نہ زاغ میں پیدا، بلند پروازی
خراب کر گئی شاہین بچے کو، صحبت زاغ

مال دین کے لئے وبال

اسے فکری زوال ہی کہئے کہ ——— آج مسلمانوں کے نزدیک صرف دو چیزیں حق وناحق کا معیار بن کر رہ گئیں ہیں ۔ایک کثرت مال دوسری سروں کی گنتی ۔

ظاہری شان وشوکت ،عمدہ خوراک و پوشاک ،سامان عیش ونشاط ،گاڑی اور بنگلہ ۔زندگی کی یہ ساری چمک دمک لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہیں اور ان ہی چیزوں کو دیکھ کر ان کے رجحانات باطل کی طرف بڑھ رہے ہیں ۔اور ستم بالائے ستم یہ کہ یہ میدان محض نفع اندوزی کے لئے نہیں ہے بلکہ ان ہی چیزوں کو وہ ان کے برحق ہونے کی دلیل بھی سمجھتے ہیں ۔آج کویت کے کھنکتے دینار اور سعودیہ کا چمکتا ریال لوگوں کی توجہات کا مرکز بنا ہوا ہے ۔ یہ دونوں مملکتیں غالی وہابیوں کی اجارہ داری میں ہیں اور وہ وہابیت کی اشاعت پر بے دریغ دولت لٹا رہے ہیں لوگ پیسوں پر رجھے ہوئے ہیں اور ان کے پیچھے دوڑ لگانے میں ایک دوسرے پر سبقت کی کوشش کر رہے ہیں ۔

ان ریاستوں کی سرگرمیاں ،عرب امارت تک محدود رہتیں تو چنداں غم نہیں تھا

مگر یہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو اپنے خودساختہ نظریات کا اسیر بنانا چاہتی ہیں ۔چنانچہ ہندوستان پاکستان اور دیگر اسلامی ملکوں میں ان کے ایجنٹ پھیلے ہوئے ہیں ۔ جو اپنے فاسد عقائد زبردستی مسلمانوں پر مسلط کرنے کے لئے دولت کا سہارا لے رہے ہیں ۔ دادودہش کے علاوہ کتب ورسائل کی مفت تقسیم ان کے جال کے پھندے کو مضبوط بنا رہی ہے لوگ ایک طرف دولت کا اثر قبول کر رہے ہیں تو دوسری طرف ان کے دلوں پر عرب کے تقدس کی چھاپ بیٹھی ہوئی ہے ۔وہ بے چارے کیا جانیں کہ کتاب وسنت کی پیروی ہم پر لازم ہے، کسی زمین کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے ۔زمین کا تقدس زمین تک محدود رہتا ہے ۔زمین والے کا ہر غلط پیغام ہمارے لئے قابل عمل نہیں ہوسکتا ۔

دوسری چیز ——— جو آج کل صداقت کا معیار بن گئی ہے وہ ہے سروں کی گنتی ۔لوگ کثرت تعداد کو اپنی سچائی کی دلیل بنا کر پیش کر رہے ہیں ۔حالانکہ کسی عہد میں حق و ناحق کا یہ معیار کبھی نہیں رہا ۔خاص کر اسلامی ادوار میں تو ایسی مثالیں کہیں نہیں ملتی کہ باطل پرستوں کے مقابلے میں حق پسندوں کی تعداد زیادہ رہی ہو ۔عہد رسالت میں ، نہ عہد خلفاء میں ، نہ بعد کے زمانوں میں ۔مسیلمہ کذاب جیسے بدنہاد کے جھنڈے کے نیچے سوا لاکھ افراد جمع تھے ۔جب کہ حضرت خالد بن ولید مقابلے پر آئے تو صرف دس ہزار سپاہ آپ کے ساتھ تھی ۔میدان کربلا میں بائیس ہزار کے مقابل صرف بہتّر تھے ۔صلیبیوں کی افواج پانچ لاکھ سے متجاوز تھی اور مرد آہن حضرت سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہم رکاب صرف چالیس ہزار مردان غازی تھے ۔

نفری کی کمی بیشی ، سچ اور جھوٹ کی میزان کبھی نہیں بن سکتی ۔ عالمی مردم شماری کے مطابق محمدیوں کے مقابلے میں آج بھی عیسائیوں کی تعداد زیادہ ہے ۔کیا

کوئی بھی مسلمان یہ کہنے کی جسارت کرسکتا ہے کہ راہ ہدایت پر ہونے کے سبب سے ان کی تعداد زیادہ ہے یا دین ومذہب کی سچائی نے ان کو اکثریت کے خانے میں رکھا ہے۔ ہاں! دولت کی فراوانی، لذّات کی فراہمی اور مذہب کے نام پر کھلی آزادی ان کی کثرت تعداد کی موجب ہے۔ خاص کر اس پر آشوب دور میں یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں رہ گئی ہے کہ معصیت کی راہ میں ہر طرف چہل پہل ہے۔ گناہوں کے تمام اڈے آباد ہیں۔ غلط کاری کے دفاتر میں خاصی دھوم دھام ہے۔ برخلاف اس کے صلاح وتقویٰ کی محفلیں ویران ہیں۔ خیر کے تمام دروازے بند ہیں۔ عشق واخلاص کے تربیتی مراکز بے چراغ ہیں اور ہر خاندان گمرہی کی طرف تیز گام ہے۔

''ہدایت وضلالت من جانب اللہ ہے''—— زمین کی نزدیکی اور دوری سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ آدمی کسی بھی جگہ سے تعلق رکھتا ہو وہ گمراہ بھی ہوسکتا ہے اور ہدایت یاب بھی۔ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ سادہ لوح مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ یہ ایرانی ہے وہ افریقی ہے، ہم افغانی—— آپ مانیں، نہ مانیں مگر یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ کالے بھٹ شخص کو افریقی اور گورے آدمی کو ایرانی شو کیا جاتا ہے اور دونوں کو ملک کی مناسبت سے کچھ جملے طوطے کی طرح رٹا کر اس ہدایت کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ بس اسی قدر بولیں۔

ہم ذیل کی سطروں میں اس کی ایک شرمناک مثال قارئین کی نذر کررہے ہیں۔ تبلیغی جماعت کی حیاسوز حرکتوں کو معلوم کرنے کے لئے یہ کہانی چشم عبرت سے پڑھئے۔ اور سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ دین کے نام پر دنیا کو کس طرح کا فریب دیا جارہا ہے۔

میرے مخلص ترین دوستوں میں جناب محمد ایوب خان ایڈوکیٹ مرحوم گورارو ضلع گیا کے رہنے والے تھے۔ گیا میں رہ کر پریکٹس کرتے تھے اور محلّہ معروف گنج میں ڈیرا تھا۔ انگریزی زبان میں مہارت کے ساتھ ساتھ اردو ادب پر اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ دینی معلومات سے بھی گہرا لگاؤ تھا پابند صوم وصلوٰۃ اور حضور مفتی اعظم ہند کے مرید تھے۔ اسے شامت اعمال ہی کہئے کہ بقچہ برداروں کی ٹیم ایک دن ان کے دروازے پر دستک دینے پہونچ گئی۔ جب وہ باہر آئے تو دیکھا کہ دہلی کے فقیر قطاروں میں کھڑے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہئے کیا بات ہے—— امیر جماعت قریب آیا اور کہنے لگا یہ صاحب افریقہ سے آئے ہیں اور یہ جناب ابوظہبی سے تشریف لائے ہیں۔ یہ انجینئر ہیں اور یہ ڈاکٹر ہیں۔ اور میں مدارس میں پروفیسر ہوں۔ ہم دین کی راہ میں نکلے ہوئے ہیں۔ آپ بھی دین کی راہ میں ہمارے ساتھ کچھ وقت دیں۔

وکیل صاحب نے فرمایا، آپ پروفیسر ہوں یا کوئی انجینئر اور ڈاکٹر ہوں، میں ان باتوں سے قطعاً مرعوب ہونے والا نہیں، میں خود ڈبل ایم اے اور ایل ایل بی ہوں اور دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دربدر کی خاک چھان کر آپ دین کا جتنا علم رکھتے ہیں میں گھر بیٹھے آپ سے زیادہ دینی معلومات رکھتا ہوں۔ البتہ ان دونوں سے ضرور سمجھوں گا کہ یہ لوگ اتنی دور سے کیا دینے اور کیا پانے آئے ہیں۔

اس کے بعد یہ جان کر کہ یہ لوگ تو اردو نہیں جانتے ہوں گے۔ انگریزی زبان میں کچہری کے انداز میں بحث شروع کی۔ وہ بے چارے رٹے رٹائے لوگ دس منٹ میں سیرینڈر بول گئے اور گھبرا کر اردو میں باتیں کرنے لگے۔ اور یہ اقرار کیا کہ ہم مدراس کے رہنے والے ہیں اور افریقہ کے ایک کارخانے میں ملازم ہیں۔ یہ

دیکھ کر دوسرے نے بھی کہا، ہم گجرات کے رہنے والے ہیں اور ابوظہبی کی ایک کمپنی میں سروس کرتے ہیں۔ چھٹی میں گھر آئے ہوئے تھے گھر سے ہم کو پکڑ کر لایا گیا ہے۔
یہ سن کر خود وکیل صاحب بھی امیر جماعت کی فریب کاریوں پر حیرت زدہ رہ گئے۔

پھر وہ امیر جماعت کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے پوچھا کہ، آپ کی اس بات میں کہ یہ افریقہ سے آئے ہیں اور یہ ابوظہبی سے دین کی راہ میں نکلے ہیں۔ کتنی صداقت ہے؟ اسی جھوٹ کی تبلیغ کرنے نکلے ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہم وہابیت کا جال لے کر سنیوں کو پھنسانے نکلے ہیں۔ اس کے لئے ہم کو جس قدر بھی جھوٹ بولنا پڑے اور دجل وفریب کا جو راستہ بھی اختیار کرنا پڑے وہ سب روا ہے۔ اس کے بعد وکیل صاحب غریق رحمت نے ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر پڑھتے ہوئے اپنے گھر کا دروازہ بند کرلیا۔

خدا وندا، یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

جب ایک قابل وکیل کی بحث وجرح نے انہیں بالکل عاجز کردیا تو یہ عقدہ کھلا کہ یہ دونوں ہندی نژاد ہیں۔ ان میں سے ایک مدراسی ہے جو افریقہ کی ایک کمپنی میں ملازم ہے اور دوسرا گجراتی ہے۔ دونوں چھٹی میں گھر آئے ہوئے تھے۔ پھنسا کر یہاں لے آیا گیا ہے۔ عرب ملکوں میں ملازمت کرنے والوں کو جھول پہنا کر عربی النسل باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خدا کی پناہ! ان فریب کاریوں کے ذریعہ جو تعداد بڑھائی جارہی ہے وہ میزان عدل پر کیا وزن رکھے گی یہ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

صداقت ہو تو دل سینے سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے، مانی نہیں جاتی

حجاز مقدس اور آل سعود

تاریخ سے بے خبر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آل سعود، موروثی طور پر جزیرہ نمائے عرب پر حکمراں ہیں اور ان کا خاندان حجاز مقدس سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اتنا ہی نہیں یہ بھی گمان ہے کہ ان کے عقائد ونظریات کی اساس اصحاب رسول کی پاک وستھری تعلیمات پر ہے اور وہ اصل اسلام کے داعی ہیں چونکہ اسلام کا آغاز بھی حجاز ہی کی پاک زمین سے ہوا ہے۔ غلط فہمی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ان مہمل خیالات کے تارو پود بکھیر دینے کے لئے میں دو باتوں پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس کررہا ہوں ——— ذیل کی سطروں میں جو حقائق ضبط تحریر میں لائے جارہے ہیں انہیں آپ تعصب کی عینک اتار کر للّٰہیت کی نظر سے مطالعہ فرمائیں، انشاء اللہ آپ اپنے دل کا دروازہ کھلتا ہوا ضرور محسوس کریں گے۔

پہلی بات کے ضمن میں ——— یہ دفعات بطور خاص آپ نظر میں رکھیں تاکہ آپ کا ذہن آئندہ آنے والی تفصیلات کا احاطہ کرسکے۔

(الف) آل سعود صوبۂ حجاز کے باشی اور انصار ومہاجرین کی اولاد سے ہیں یا بلاد عرب میں کسی غیر مانوس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

(ب) اقتدار میں وہ اصل حقدار کی حیثیت سے ہیں یا حجاز پر ان کا غاصبانہ عمل دخل ہے۔ ان کے برسر اقتدار آنے کے سیاسی عوامل کیا ہیں۔

(ج) جزیرہ نمائے عرب پر ان کا تسلط کب ہوا، ان کی مدت العمر کیا ہے،

اور کن طاقتوں کے سہارے وہ یہاں تک پہونچے ہیں۔

دوسری بات کے ذیل میں ——— یہ دفعات ضرور ملحوظ خاطر رہیں تا کہ آنے والے صفحات پر پھیلے ہوئے مباحث تک رسائی میں آپ کی فکر خطا نہ کرے۔

(الف) جن عقائد ونظریات کی تبلیغ کو آل سعود نے اپنا نصب العین بنا رکھا ہے اور پوری دنیا کو انہی خیالات کا پیرو اور متبع دیکھنا چاہتے ہیں وہ ان تک کن ذرائع و وسائل سے پہونچے۔

(ب) بلاد عرب میں اس طرح کے خیالات فاسدہ اور نظر ناقصہ کا ظہور کب سے ہوا۔ اس کا بانی اور موجد کون ہے اور اس کی تاریخ کیا ہے۔

(ج) دیار ہند میں سواد اعظم اہل سنت و جماعت کے خلاف سب سے پہلے محاذ جنگ کس نے کھولا۔ اور ان گمراہ کن نظریات کا اول داعی کون ہے اور آج پورے ہندوستان میں کن طاقتوں کے بل بوتے پر وہابیت کا جال مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔

مذکورہ بالا دفعات اگر آپ کے حافظے میں ہیں تو اب ذیل کی سطروں میں ہر ایک کا نمبر وار تفصیلی جواب ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ——— (الف)

خواجۂ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد پاک میں جب جزیرہ نمائے عرب کے ہر خطہ پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا اور کفر کے سارے حصار مسمار ہو گئے۔ اب اسلام سے بچ کر سر چھپانے کی کوئی سبیل باقی نہ رہی تو مجبور ہو کر سارے عرب کے بعد اسلام لانے والا یہی سعودیوں کا قبیلہ تھا جو جزیرہ نمائے عرب کے ایک مشرقی

صوبہ ''نجد'' سے تعلق رکھتا ہے۔ اس قبیلے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پیغمبر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد اسلام کی گرفت کمزور سمجھ کر مرتد ہو گیا تھا۔ خلیفۂ اول کے حکم سے سیف اللہ حضرت خالد بن ولید ایک لشکر جرار لے کر اس کی سر کوبی کو پہونچے تو مار کھا کر اس نے دوبارہ اسلام قبول کیا۔

اس قبیلے کا ایک تیسرا رخ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے ——— وہ یہ کہ ماہرین انساب کا کہنا ہے کہ مسیلمہ کذاب جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاً بعد نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اسی نجد میں ''عینیہ'' کے مقام پر پیدا ہوا تھا اور اسی قبیلے کی ایک شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ ظالم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کے لئے اپنی جانشینی کی شرط پیش کی تھی۔ اس وقت آپ کے دست اقدس میں ایک چھڑی تھی۔ آپ نے فرمایا اگر تو اپنے اسلام کے عوض مجھ سے یہ چھڑی بھی طلب کرے تو مجھے تیرا اسلام لانا منظور نہیں ہے۔

عہد صدیقی میں ——— اس شاطر نے سوا لاکھ فوج اکٹھی کر کے اس گمان کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کی کہ محمد کے بعد مسلمانوں میں میرے مقابلے کے لئے دم خم نہیں ہے۔ جانشین پیغمبر کے حکم سے حضرت خالد بن ولید دس ہزار سپاہ کے ساتھ مقابل آئے اور اپنی شمشیر خارا شگاف سے دشمن کے فوج کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ خود مسیلمہ بدنہاد بھی حضرت حبشی کی تلوار سے واصل جہنم ہوا۔

(ب)

جزیرہ نمائے عرب پر سلطنت عثمانیہ کا اقتدار ۱۹۲۱ء تک قائم رہا۔ ان ترکوں نے اپنے

دورِ حکومت میں حرمین طیبین کی جو بیش بہا خدمات انجام دیں۔ وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ان کی طرف سے صوبۂ حجاز میں جو گورنر مامور ہوتا وہ صالح، پاکباز، دیندار اور دین پرور ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت خوش عقیدہ اور انتہائی عقیدت کیش بھی ہوتا۔ کیونکہ ترک خود بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والی ہر شئے کے ادب و احترام کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ جانتے تھے۔ سادات اور اہل بیت کے ساتھ ان کے حسن سلوک کا انداز نہایت اچھوتا اور نرالا تھا۔ مقامات مقدسہ کی نگرانی، آثار صحابہ اور بزرگوں کے تبرکات کی نگہداشت انہوں نے اس طرح کی کہ دنیا کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مسجد نبوی شریف کی تعمیر و توسیع میں انہوں نے حسن عقیدت کا جس طرح مظاہرہ فرمایا ہے۔ عالمی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی اور نہ آئندہ کبھی مل سکے گی۔

ترک فرمارواؤں کے بعد ۱۹۲۴ء میں مکہ معظّمہ اور ۱۹۲۵ء میں مدینہ منورہ پر آل سعود کا تسلط کس طرح ہوا۔ قبضہ کے بعد ان حرماں نصیبوں نے حرمین شریفین کی حرمت کس طرح پامال کی اور اہل حجاز پر ان ظالموں نے کیسی قیامت ڈھائی یہ تفصیل آپ جناب صلاح الدین محمود لاہوری کی زبانی سنئے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

''جب بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اس جنگ میں عثمانی حکومت نے انگریز، فرانسیسی اور اطالوی طاقتوں کے خلاف جرمن قوم کا ساتھ دیا۔ ۱۹۱۸ء میں ترک جرمن محاذ کو شکست ہوئی، فتح پانے والوں نے جہاں جرمنی کے

ٹکڑے کر کے اس کے اجتماعی وقار کو خاک میں ملا دیا۔ وہاں ترکمانی ناموس بھی خون کے ساتھ ساتھ بہہ کر خاک میں شامل ہو گیا۔ اور عثمانی حکومت کی کشادہ حدود بھی فاتح ٹولے کے مصرف میں آ گئی۔

اپنی نو آبادیاتی خواہشات کو آگے بڑھانے کے واسطے اس فاتح ٹولے نے عثمانی سلطنت کے خطوں پر حکومت کرنے کے دو طریقے رائج کئے ——— پہلا طریقہ براہ راست حکومت تھا جہاں براہ راست حکومت ممکن نہیں تھی وہاں ایک خاص منصوبے کے تحت ایسے قبیلوں، سیاسی جماعتوں یا افراد کو سہارا اور طاقت دینا طے پایا تھا جن کی وساطت سے محض دائرۂ اثر ہی قائم نہ رکھا جا سکے بلکہ ملت اسلامیہ میں مزید انتشار اور کشیدگی بھی پھیلائی جا سکے۔

جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں جن طاقتوں نے علاقائی افراتفری کا فائدہ اٹھا کر کھلم کھلا ہاتھ پاؤں لگانے شروع کر دیئے تھے۔ ان میں صوبۂ نجد کے ایک پیشہ ور باغیوں کا سعود نامی قبیلہ بھی شامل تھا۔ جنگ کے دوران ہی یہ لوگ ایک خفیہ معاہدہ کے تحت انگریزوں سے مل چکے تھے۔ اس معاہدہ کی رو سے انگریز یہ چاہتا تھا کہ جنگ عظیم کے دوران یہ قبیلہ اپنی بغاوتوں، حملوں، جنگوں اور چھاپوں سے

ترکوں کو اتنا تنگ کرے اور برسرِ پیکار رکھے کہ مشرقِ وسطیٰ میں انگریز حملہ آوروں کی طرف پوری طرح دھیان نہ دے سکیں۔ اس کے عوض انگریز نے عہد کیا تھا کہ اگر وہ جنگ جیت گیا تو وہ پہلے نجد اور پھر جزیرہ نمائے عرب پر اس نجدی قبیلے کا تسلط قائم کرنے میں ان کی مدد کرے گا۔

بہرکیف ترکوں کی ہار کے بعد ان فاتح طاقتوں کی ایماء و امداد پر سعودیوں نے اپنے علاقائی حریفوں کو شکست دے کر ۱۹۲۱ء میں صوبۂ نجد پر اپنی عملداری اور بادشاہت کا اعلان کر دیا عالمی جنگ کے اختتام پر ہی ترکوں نے حجاز کا نظام، حجاز کے سربراہ قبیلے کے سردار، شریف مکہ کے سپرد کر کے اپنی فوجیں حجاز سے واپس بلا لی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جنگ میں شکست کے بعد وہ حجاز میں اپنی حکومت صرف فوجی طاقت کے ذریعہ قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی حملے کی صورت میں خاکِ حجاز پر لہو بہانا لازم ہو جائے گا۔ مکہ اور مدینہ میں گولی چلانی پڑ جائے گی۔ یہ کیفیت ترک لحن اور خصلت کے بالکل برعکس تھی۔ کچھ عرصہ سوچ بچار کے بعد حجاز کے ترک گورنر کا حکم ہوا تھا اور ترکوں نے خانۂ کعبہ کے گرد آخری طواف کر کے مسجد نبوی کی دہلیز چوم کر آخری بار خاکِ حجاز سے ہمیشہ کے لئے واپس چلے گئے''

(تاریخ نجد و حجاز)

(ج)

شریف مکہ حجازی قبیلے کے محض ایک سردار تھے۔ امن وامن کی صورت میں وہ حجاز کا نظام بحسن و خوبی چلا سکتے تھے مگر ایک قوی دشمن کے دفاع کے لئے ان کے پاس فوجی طاقت نہ تھی۔ ترکوں کے چلے جانے کے بعد سعودیوں نے حجاز کو خالی پا کر مکہ پر فوج کشی کر دی۔ انگریزی سامراج کے سہارے وہ صوبۂ نجد پر ۱۹۲۱ء میں ہی قابض ہو چکے تھے۔ اب ۱۹۲۴ء میں مکہ پر بھی تسلط قائم کر لیا۔ اس کے بعد ان کی نظر مدینہ کی طرف اٹھی اور لگاتار حملوں کے بعد ۱۹۲۵ء میں اسے بھی اپنے زیرِ نگیں کر لیا۔ یلغار کا یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ جدّہ پر بھی اسے بالا دستی حاصل ہو گئی۔ چنانچہ صوبہ نجد و حجاز کو سعودی عرب کا نام دے کر ۱۹۲۶ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ یہیں سے حجاز پر سعودیوں کے دورِ حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ منحوس دور ابھی تک جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔

فتنے کا ظہور

(الف)

عرب کا وہ نامسعود مقام جو دعائے نبوی سے محروم رہا ''نجد کہلاتا ہے۔ نجد عرب کے مشرق میں واقع ہے اور جنوبی نجد میں ایک مقام عینیہ کے نام سے معروف ہے۔ جو روئے زمین پر بدترین جگہوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہیں سے مسیلمہ کذاب کے روپ میں تاریخ کا بھیانک فتنہ ظاہر ہوا۔ جس کے دام فریب میں آ کر لاکھوں آدمی

دین ودنیا سے ہاتھ دھو بیٹھے اور وہ خود بھی لعنتوں کا طوق گلے میں لٹکا کر ۱۲۰ سال کی عمر میں جانب دوزخ روانہ ہوا۔

پورے گیارہ سو سال بعد ——— ٹھیک اسی مقام سے نہایت خطرناک دوسرا فتنہ رونما ہوا جس کی دھمک بہت دور تک محسوس کی گئی اور آج بھی اس کے زہریلے جراثیم انفس وآفاق پر تیزی سے پھیلتے جا رہے ہیں۔ یہ فتنہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا تھا۔ جو نجد کے عیینہ کے مقام پر بارہویں صدی ہجری میں پیدا ہوا۔ اس کے وجود نامحمود سے دین کو ضرر پہونچا، شریعت داغ دار ہوئی اس نافرجام نے انبیاء کی عصمت کو مجروح کیا، ناموس رسالت پر انگشت نمائی کی، اہل بیت اور اہل حرمین کی عظمت پر حملے کئے، تقدس مآب صحابہ کی قبریں مسمار کرائیں، تمام تاریخی مشاہد وآثر کے نشانات مٹائے، خود کو اور اپنے حواریوں کو مسلمان، باقی تمام مسلمانوں کو مشرک قرار دیا۔

محمد بن عبدالوہاب کے باپ اور چچا علمائے حنابلہ سے بلند پایہ فقیہ تھے۔ جب تک یہ شخص ان دونوں کے زیر درس رہا، اگرچہ طبیعت میں فتور بھرا ہوا تھا مگر ان کی گرفت نے اسے سنبھالے رکھا ——— ان کے بعد اسے ایسے دو شخص کی صحبت میسر آئی جو ابن تیمیہ کی کتابوں سے متأثر اور اس کے معتقدات پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ تقی الدین ابن تیمیہ وہ شخص ہے جس نے اسلاف کی راہ سے انحراف کرنے میں پہل کی ہے۔ معتقدات کے پیمانے بدل کر لوگوں کے لئے گمراہی کا دروازہ کھولنے والا یہ پہلا بدنصیب ہے۔ علماء نے اسے صحابہ پر اتہام تراشنے والا لکھا ہے۔

یہ دونوں شخص جو محمد بن عبدالوہاب کے اتالیق قرار پائے۔ غایت درجہ کے

بدعقیدہ، بے دین، گمراہ اور گمراہ گر تھے۔ ان میں سے ایک عبداللہ ابن ابراہیم بن سیف تھا۔ یہ شخص نجد کے ایک بااثر خاندان کا رئیس تھا ابن تیمیہ کا پیرو، اس کے باطل نظریات کا معتقد اور اس کی ہفوات کا شیدائی تھا۔ اس شخص نے محمد بن عبدالوہاب کو اپنے مطلب کا آدمی جان کر اس پر پوری محنت صرف کی اور اپنے شیشے میں اتار لیا ——— دوسرا شخص ہندی نژاد محمد حیات سندھی تھا یہ بدبخت شفاعت نبوی اور عظمت اولیاء کا سخت منکر تھا۔ مشرکین کی حق میں نازل ہونے والی آیات کو راسخ الاعتقاد مسلمانوں پر چسپاں کر کے انہیں مشرک وبے دین قرار دیتا تھا۔

محمد بن عبدالوہاب نجدی ——— مدینہ پہونچ کر محمد حیات سندھی کے درس میں داخل ہوا۔ یہ ناپاک دیار نبوی میں بیٹھ کر لوگوں کے قلوب واذہان پر ڈاکہ زنی کرتا تھا۔ چنانچہ اس خرانٹ بڈھے نے اپنی فکر کا زہر محمد بن عبدالوہاب کے ذہن میں گھول دیا اسی صحبت بد کا یہ اثر تھا کہ آنیوالے دنوں میں محمد بن عبدالوہاب نجدی نے تمام جہان کے نیک دل اور پارسا مسلمانوں کو کافر ومشرک قرار دیا۔

محمد بن عبدالوہاب نجدی کی بے راہ روی کے اسباب کا ایک رخ تو آپ نے پڑھ لیا۔ اب ذرا دوسرا رخ بھی کلیجہ تھام کر پڑھنے کے لئے تیار ہو جایئے۔ جو نہایت بدنما، روح فرسا اور شرمناک ہے ——— محمد بن عبدالوہاب نجدی فطرتاً تیز مزاج، جلد باز، جاہ پسند، خوشامد پرست اور مغرور آدمی تھا۔ ایسا آدمی آسانی سے دوسروں کا آلۂ کار بن جاتا ہے تعلیمی مراحل طے کر لینے کے بعد اس نے ایران، اصفہان اور دوسرے ممالک کی سیاحی بھی کی تھی۔ اسی سیاحت کے دوران وہ انگریزوں کے ایک

شاطر اور خطرناک جاسوس کے دام کا اسیر ہو گیا۔

ہمفرے، انگریزوں کا ایک فنکار جاسوس تھا وہ اسلامی تاریخ کا بھی گہرا مطالعہ رکھتا تھا۔ چونکہ اسے مسلم ممالک میں جاسوسی کے فرائض انجام دینے تھے اسلئے خود کو مسلمان ظاہر کرتا تھا۔ مسجدوں میں جاتا نمازیں پڑھتا اور ائمہ سے رابطہ رکھتا۔ اسی رابطے کے دوران ایک تقویٰ شعار بوڑھے امام سے وہ اس درجہ متأثر ہوا کہ اسے اپنے مذہب سے نفرت سی پیدا ہو گئی اور وہ اسلام قبول کرتے کرتے رہ گیا —— جب اس کی ملاقات محمد بن عبدالوہاب نجدی سے ہوئی تو اس کو تولنے کے بعد ہمفرے نے اسے اپنے مطلب کا آدمی پایا۔ اس کے بعد کی تفصیل خود ہمفرے کی زبانی سنئے وہ اپنی یادداشت میں لکھتا ہے۔

> "ان دنوں جب میں ترکھان کا کام کرتا تھا۔ میری ملاقات اک ایسے شخص سے ہوئی جو وہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ ترکی، فارسی اور عربی زبانوں میں گفتگو کرتا تھا۔ وہ دینی طالب علموں کا لباس پہنتا تھا۔ اس کا نام محمد بن عبدالوہاب تھا وہ اونچا اڑنے والا، جاہ طلب، اور غصیلا انسان تھا۔ اسے عثمانی حکومت سے سخت نفرت تھی، وہ ہمیشہ اس کی برائی کرتا تھا لیکن حکومت ایران سے اس کو کوئی سروکار نہ تھا۔ ترکھان عبدالرضا سے اس کی دوستی کی مشترک وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں ہی عثمانی خلیفہ کو اپنا سخت ترین دشمن سمجھتے تھے لیکن میرے علم میں یہ بات نہ آسکی کہ اس نے عبدالرضا

> ترکھان سے دوستی کس طرح بڑھائی جبکہ یہ سنی تھا اور وہ شیعہ۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس نے فارسی کہاں سے سیکھی تھی —— البتہ بصرہ میں شیعہ، سنی مسلمان ایک ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ روابط بھی دوستانہ تھے۔ اور وہاں فارسی و عربی دونوں زبانیں بولی جاتی تھیں۔ تاہم ترکی سمجھنے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ محمد بن عبدالوہاب ایک آزاد خیال آدمی تھا۔ اس کا ذہن شیعہ سنی تعصّبات سے بالکل پاک تھا۔ حالانکہ وہاں بیشتر سنی حضرات شیعوں کے خلاف تھے اور بعض مفتی شیعوں کی تکفیر بھی کرتے تھے —— شیخ محمد کے نزدیک حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی مکتب فکر میں سے کسی مکتب فکر کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ وہ کہتا تھا کہ خدا نے قرآن میں جو کچھ کہہ دیا ہے بس وہی ہمارے لئے کافی ہے۔"

اس اقتباس سے چند باتیں معلوم ہوئیں —— ایک یہ کہ وہ جاہ طلب اور بلند پرواز ذہن رکھتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ خلافت عثمانیہ اور ترکوں کا زبردست دشمن تھا۔ تیسرے یہ کہ وہ ائمۂ شریعت سے بالاتر ہو کر اپنی فہم پر اعتماد کرتا تھا۔ کسی بھی شخص کو غلط راہ پر ڈالنے کے لئے یہ نقائص بڑی حد تک معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ترکوں سے ترکھان کی دشمنی کا سبب اس کی شیعیت تھی اور اس شخص کی عداوت کی وجہ اس کی غیر مقلدیت تھی۔ چونکہ ترک قوم اسلاف کے روایات کی حامل تھی۔

ایک نباض جاسوس نے محمد بن عبدالوہاب کی کن کمزوریوں کی بنا پر اسے اپنے کام کا آدمی تصور کیا اور کس طرح اس کے جذبات کو مہمیز کر کے بدکرداری کی راہ پر اسے ڈالا اور پھر اپنے مقاصد کے لئے اسے استعمال کیا۔ اور کتنی آسانی سے یہ شخص ہمفرے کے جال میں پھنس کر پورے عالم اسلام کے لئے زبردست فتنہ بن گیا۔ ان تفصیلات کو جاننے کے لئے آپ یہ اقتباس چشم خوں ناب سے پڑھئے۔ ہمفرے اپنی یاداشت میں لکھتا ہے۔

> ''محمد بن عبدالوہاب سے میل جول اور ملاقاتوں کے سلسلہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ برطانوی حکومت کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ شخص بہت مناسب دکھائی دیتا ہے۔ اونچا اڑنے کی خواہش، جاہ طلبی، غرور، علماء اور مشائخ سے دشمنی، اس حد تک خودسری کہ خلفائے راشدین بھی اس کی تنقید کا نشانہ بنے۔ اور حقیقت کے سراسر خلاف قرآن وحدیث سے استفادہ ——— اس کی یہ وہ کمزوریاں تھیں جس سے بڑی آسانی سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔
>
> میں نے سوچا ——— کہاں یہ مغرور نوجوان اور کہاں استنبول کا وہ ترک بوڑھا احمد آفندی، جس کے افکار و کردار، گویا ہزار سال پہلے کے افراد کی تصویر کشی کرتے تھے۔ اس نے اپنے اندر ذرا بھی تبدیلی نہیں کی تھی۔ حنفی مذہب سے تعلق رکھنے والا وہ

بوڑھا شخص ابوحنیفہ کا نام زبان پر لانے سے پہلے وضو کرتا تھا۔ صحیح بخاری کے مطالعہ کو اپنا فرض سمجھتا تھا جو اہل سنت کے نزدیک حدیثوں کی نہایت معتبر اور مستند کتاب ہے۔ وہاں بھی وہ وضو کے بغیر کتاب کو نہیں چھوتا تھا۔

اس کے بالکل برعکس شیخ محمد بن عبدالوہاب، امام ابو حنیفہ کی تحقیر کرتا تھا اور اسے ناقابل اعتبار سمجھتا تھا ——— محمد کہتا تھا کہ میں ابوحنیفہ سے زیادہ جانتا ہوں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ نصف بخاری بالکل لچر اور بیہودہ ہے ——— میں نے محمد سے گہرے مراسم قائم کر لئے اور ہماری دوستی میں ناقابل جدائی استحکام پیدا ہو گیا۔ میں بار بار اس کے کانوں میں یہ رس گھولتا تھا کہ خدا نے تمہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہیں زیادہ صاحب استعداد بنایا ہے۔ تمہیں بڑی فضیلت اور بزرگی بخشی ہے اور اگر تم رسالت مآب کے زمانے میں ہوتے تو یقیناً ان کی جانشینی تم کو ہی ملتی۔

میں ہمیشہ پرامید لہجے میں اس سے کہتا ——— میں چاہتا ہوں کہ اسلام میں جس انقلاب کو رونما ہونا ہے وہ تمہارے ہاتھوں ہی انجام پذیر ہو۔ اس لئے کہ صرف تم ہی وہ شخصیت ہو جو اسلام کو زوال سے بچا سکتے ہو۔ اس سلسلے میں سب کی امیدیں

تم ہی سے وابستہ ہیں ۔ میں نے محمد کے ساتھ طے کیا کہ ہم
دونوں بیٹھ کر علماءِ اسلام، مفسرین کرام، پیشوایان دین اور صحابۂ
عظام سے ہٹ کر نئے افکار کی بنیاد پر قرآن مجید پر گفتگو کریں۔
پہلے ہم قرآن پڑھتے اور آیات کے بارے میں اظہار خیال
کرتے ہیں۔ میرا لائحۂ عمل یہ تھا میں کسی طرح انگریز نو آبادیاتی
علاقوں کی وزارت کے دام میں پھنسا دوں“

دیکھ لیا آپ نے —— اسلاف کی شاہراہ سے انحراف کا انجام اور بزرگوں کی ڈگر چھوڑنے کا نتیجہ ہمفرے کا تیور صاف بتا رہا ہے کہ اس کا اکابرین امت سے بیزاری کا مزاج نہ ہوتا تو، ہرگز اتنی آسانی سے دام میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔ دین کے فہم کے لئے صرف عربی قواعد و گرامر تک رسائی کافی نہیں بلکہ پیش رؤوں کی دینی بصیرت پر اعتماد بھی ضروری ہے۔ اس نے اپنی ڈائری میں جس ترک بوڑھے کا ذکر کیا ہے اس سے یہی تأثر دینا چاہتا ہے کہ اس جیسے لوگوں پر کسی کا جادو نہیں چل سکتا۔ ایک جگہ اس نے یہاں تک لکھا ہے کہ مجھے ایسے افراد بہت ملے جن کی صحبتوں میں بیٹھنے کے بعد میں جلد مایوس ہو گیا کہ میرے ہاتھ نہیں آسکتے۔ مگر ایسا شخص ایک ہی ملا جس کی مجلسوں میں بیٹھنے کے بعد میں خود اپنے مشن ہی سے بیزار ہو گیا اور قریب تھا کہ اپنا دین چھوڑ بیٹھوں۔ لیکن میں نے جلدی نہیں کی۔ رات کو جب اپنے بستر پر گیا تو مجھے اپنا حلف نامہ یاد آیا اور بمشکل اپنے دل پر قابو پایا اس بوڑھے امام کی صحبت مجھے ترک کرنا پڑی ورنہ میں اپنے حلف پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ —— ہمفرے نے محمد بن عبدالوہاب کو جو نئے دین کی دعوت پر ابھارا، اور قرآن و حدیث کے خود ساختہ معنی و مطالب کی طرف راغب کیا۔ اور اس کوشش میں صد فی صد کامیاب ہوا۔ اس کی یہی دو بنیادیں وجہیں ہیں —— ایک اسلاف کے علمی سرمایہ کی ناقدری، قرآن و حدیث سے متعلق ان کی توجیہات و تشریحات سے بیزاری اور ان کے صالح عقائد و نظریات سے دوری —— دوسری محمد بن عبدالوہاب کی خود پرستی اپنی فکری بالا دستی کا غرہ اور دولت و شہرت کی طرف اس کے رجحانات۔

محمد بن عبدالوہاب کو میدان عمل میں پوری طرح اتار دینے کے لئے ہمفرے نے جو آخری حربہ استعمال کیا۔ اس کی تفصیل پڑھنے کے بعد دل و دماغ پر زلزلے کا جھٹکا محسوس ہونے لگتا ہے —— مسلم کے روپ میں ایک خطرناک عیسائی جاسوس اسلام کا شیرازہ منتشر کر دینے کے لئے کیسی ناپاک جسارت کرتا ہے۔ یہ تفصیل جاننے کے لئے اس کی ڈائری سے یہ اقتباس پڑھئے اور شیخ نجدی کی فہم و فراست پر ماتم کیجئے —— وہ لکھتا ہے۔

”ایک دن میں نے اس سے اپنا ایک جھوٹا خواب بیان کیا اور کہا
—— رات میں نے خواب میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ
وسلم کو بالکل اسی سراپا کے ساتھ کرسی پر بیٹھے دیکھا جیسے واعظین
اور ذاکرین منبروں پر بیان کرتے ہیں —— بڑے بڑے
علماء اور بزرگان دین جن سے میری کوئی واقفیت نہیں تھی۔

چاروں طرف سے ان کو گھیر رکھا تھا۔ ایسے میں میں نے دیکھا
کہ اچانک تم اس مجمع میں داخل ہو گئے۔

تمہارے چہرے سے نور کی شعائیں پھوٹ رہی تھیں۔ جہاں تم رسالت مآب کے سامنے پہونچے تو انہوں نے کھڑے ہو کر تمہاری تعظیم کی اور تمہارا ماتھا چوم کر کہا اے میرے ہم نام! تم میرے علم کے وارث اور مسلمانوں کے دینی و دنیاوی امور کو سنوارنے میں میرے جانشین ہو —— یہ سن کر تم نے کہا، یا رسول اللہ! لوگوں پر اپنے علم کو ظاہر کرتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔

رسالت مآب نے فرمایا —— خوف کو اپنے دل میں جگہ نہ دو، کیونکہ جو کچھ تم اپنے بارے میں سوچتے ہو اس سے کہیں زیادہ صاحب مرتبہ ہو —— محمد بن عبدالوہاب نے میرے اس من گڑھت خواب کو سنا تو خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھتا تھا، کیا تمہارے خواب سچے ہوتے ہیں؟ اور میں اسے مسلسل اطمنان دلاتا رہا —— میں نے یہ محسوس کیا کہ خواب کے تذکرے کے بعد اس نے اپنے دل میں ایک نئے مذہب کے اعلان کا مصمم ارادہ کر لیا ہے''

یہ اقتباس کسی تبصرے کا محتاج نہیں —— محمد بن عبدالوہاب کی جگہ محدود علم

رکھنے والا ایک مومن ہوتا تو ہمفرے کو مسلمان جان کر بھی اس کی ہفوات کو کذب و افتراء کے خانے میں جگہ دیتا۔ اس کی مجلس سے دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا اور اس کی طرف دوبارہ نظر کرنا گناہ تصور کرتا —— کیونکہ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عامی شخص کے لئے تعظیماً کھڑا ہونا، اس کی ناپاک پیشانی کو چومنا اور اس کو ایک نئے دین کی دعوت کا اشارہ دینا ایسے اختراعات ہیں جو کسی مومن کے دل میں راہ نہیں پا سکتے۔ لیکن محمد بن عبدالوہاب وہ بدنصیب شخص ہے جو دینی بصیرت کے ساتھ ساتھ عقل وشعور کو بھی نخوت کی بھینٹ چڑھا چکا تھا۔

محمد بن عبدالوہاب جب ایک نئے دین کی داغ بیل ڈالنے پر کمر بستہ ہو گیا تو انگریزوں کو فکر لاحق ہوئی کہ یہ نیا دین ایسے نہج پر وجود میں آئے جو ہمارے نوآبادیاتی منصوبے کے لئے باعث تقویت ہو۔ چنانچہ ہمفرے کی سرگرمیاں اب اور تیز ہو گئیں۔ اس نے شیخ کی راہ میں ایسے جال بچھا دیئے کہ اب وہ جہاں کہیں بھی جائے تو آزادانہ طور پر گھوم پھر نہ سکے۔ اس کے لئے اس کی یہ صورت پیدا کی کہ عبدالکریم نامی ایک عیسائی کو اس کا دمساز بنا دیا جو قدم قدم پر اس سے راز لیتا رہا —— دوسر طرف دو پیشہ ور لڑکیاں آسیہ اور صفیہ نام رکھ کر متعہ کے بہانے اس کی آغوش میں پہونچا دیا۔ ان دونوں یہودن پریوں نے اس کی نماز کی عادت چھڑا دی اور اسے شراب کا خوگر بنا دیا۔ اب اس کے بعد محمد بن عبدالوہاب کس کام کے لائق رہ گیا۔ اس کا انکشاف خود ہمفرے کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

''مختصر یہ کہ عبدالکریم، صفیہ، آسیہ اور راقم الحروف نے مل کر اپنی

رات دن کی کوششوں سے شیخ محمد بن عبدالوہاب کو نو آبادیاتی
علاقوں کی وزارت کی خواہشات کے عین مطابق ڈھالا اور آئندہ
کی پلاننگ کو روبہ عمل لانے کی ذمہ داری اٹھانے پر آمادہ کیا''

(ہمفرے کے انکشافات، ص ۸۰)

کہاں ہیں محمد بن عبدالوہاب کو مصلح کہنے والے ——— اب ذرا آ کر اس کا اصلی چہرہ دیکھیں کہ وہ مصلح ہے یا مسلح۔ اگر مسلح ہے تو کس نے ان کو کن لوگوں کے خلاف مسلح کیا ہے ——— مسیلمہ کذاب نے براہ راست نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ تو نہیں کیا لیکن نئی شریعت ضرور گڑھی۔ قرآن تو نیا نہیں بنایا مگر تفسیر بالرائے کر کے غارت گر ایمان ضرور بنا۔ اس کی نئی شریعت کا کرشمہ دیکھنا ہو تو کتاب کی اوراق گردانی جاری رکھئے۔ آنے والے صفحات میں وہ سب کچھ مل جائے گا جس کی آپ کو تلاش ہے۔

شیخ نجد کا، سردار نجد سے رابطہ

ایران اصفہان اور ترکی کی زمین کسی نئے دین کی دعوت کے لئے سازگار نہ تھی۔ یہاں نہ صرف یہ آواز دبادی جاتی بلکہ داعی کو فوراً کیفر کردار تک پہونچا دیا جاتا۔ اس لئے محمد بن عبدالوہاب نے اپنی دعوت کے لئے عرب کی سرزمین کا انتخاب کیا۔ کیونکہ ترک فرمارواؤں کے چلے جانے کے بعد جزیرہ نمائے عرب طوائف الملوکی کا شکار تھا۔ خاص کر نجد کی زمین محمد بن عبدالوہاب کے لئے زیادہ موافق اور سازگار تھی۔ چونکہ وہاں انگریزی سامراج کے ایجنٹ پہلے سے کام کر رہے تھے

——— فرق صرف اتنا تھا کہ انہیں کام کرنے کے لئے سیاسی پلیٹ فارم دیا گیا تھا اور ان کو سرحدوں پر نقب زنی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

محمد بن عبدالوہاب نے ——— اپنی تحریک کا آغاز کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ جو لوگ اپنے عقائد کی اصلاح کر کے ہماری تحریک کے رکن بن جائیں گے صرف ان ہی لوگوں کا خون اور مال محفوظ رہے گا۔ وہ ایک عیار شخص تھا، اپنے باطل نظریات کو پھیلانے کے لئے وعظ و پند کے راستہ کو کافی نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے باقائدہ چھاپہ مار دستے تیار کئے، غارت گری اور لوٹ کے ذریعہ لوگوں کو ہراساں کیا لہٰذا خوش دلی سے کم، جان و مال سے بچنے کے لئے زیادہ لوگ اس کی تحریک میں شامل ہوئے۔ لوٹ کے مال کو غنیمت کا نام دیتا اور اپنی غارت گری کو جہاد سے تعبیر کرتا تھا۔

(ب)

عرب کے بعض جانباز قبیلوں نے انہیں اپنی آبادی سے کھدیڑ دیا۔ بلکہ آس پاس کی آبادی پر بھی ان کی پیش قدمی روک دی اور دور تک انہیں مار بھگایا۔ ظاہر ہے کہ جب انجانے میں اس نے کچھ قبیلوں کو جالیا اور لوٹ مچائی تو دوسرے قبیلے ہوشیار ہو گئے اور انہوں نے اپنی دفاعی قوت مستحکم کر لی جس کے نتیجے میں شیخ نجدی کے دوستوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی اس کے بعد محمد بن عبدالوہاب کو اپنی طاقت مزید مضبوط کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کام کے لئے اس کی نظر انتخاب آل سعود پر پڑی۔

محمد بن سعود سردار قبیلہ ——— انگریزوں کی مدد سے صوبہ نجد پر اپنی اجارہ داری قائم کر چکا تھا اور تمام قبائل اس کی بالا دستی تسلیم کر چکے تھے۔ مگر وہ اب تک تحریک

وہابیت سے متاثر نہ تھا۔عقیدہ ومذہب کو مدعا بنا کر قتل وقتال اور خون خرابہ اس کا مزاج نہ تھا۔اس کا سارا کاروبار،حکومت اور اقتدار تک محدود تھا۔محمد بن عبدالوہاب برابر کوشاں رہا کہ محمد بن سعود ان کی تحریک کی طرف التفات کرے اور تحریک وہابیت کو تلوار کی قوت پہونچائے۔مگر وہ اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔چنانچہ بہت دنوں تک دعوت وپیغام کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔بالآخر وسیلے کا منکر،محمد بن سعود تک رسائی کے لئے وسیلے کا جویاں ہوا۔

مولانا عبدالقیوم قادری تاریخ نجد وحجاز کے صفحہ ۶۱ پر تحریر فرماتے ہیں۔

''شیخ نجدی انبیاء علیہم السلام کی تعظیم اوران سے طلب شفاعت کے خلاف جو دعوت لیکر اٹھے تھے اس کی کامیابی کے لئے انہیں تلوار کی قوت کی ضرورت تھی۔ورنہ ان کے افکار وعقائد بھی ابن تیمیہ کی طرح صرف قرطاس وکتب تک محدود رہتے۔اس نصب العین کی تکمیل کے لئے ان کی آنکھوں نے نجد کے سرداروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔بالآخر ان کی نگاہوں نے اس مہم کے لئے محمد بن سعود کا انتخاب کرلیا اور محمد بن سعود کی بیوی کے ذریعہ انہوں نے اسے اپنا ہمنوا بنا لیا۔اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار حسنی لکھتے ہیں۔

عینیہ سے شیخ ، درعیّہ میں پہونچے اور اپنے ایک شاگرد ابن سویلم کے یہاں مقیم ہوئے۔ابن سویلم نے امیر محمد

بن سعود والی درعیّہ کی مدد حاصل کرنے کا وعدہ کیا۔لیکن امیر درعیّہ شروع میں رضامند نہ ہوا،اس کے بھائی جو اس عرصہ میں شیخ کے بیحد مداح ہوگئے تھے اور بعد میں اس کے بہترین مؤید ثابت ہوئے۔امیر کو شیخ کی متابعت کی ترغیب دیتے رہے۔

آخرش امیر کی عقلمند اور ہوشیار بیوی ان کی مدد کے لئے مساعی ہوئی۔نتیجہ یہ ہوا کہ امیر بھی شیخ کا معترف ہوگیا''

محمد بن سعود اور محمد بن عبدالوہاب کے درمیان رابطہ کس طرح ہوا۔یہ دونوں نجدی کس طرح ایک دوسرے کے قریب آئے،تحریک وہابیت میں محمد بن سعود کن شرطوں پر شامل ہوا اور ان دونوں میں کیا عہد وپیمان قرار پائے۔اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے تاریخ نجد وحجاز کے مصنف صفحہ ۶۲ پر ایک وہابی عالم کا تحریری بیان نقل فرماتے ہیں۔

''امیر محمد بن سعود جو شیخ کی دعوت سے پہلے حسن اخلاق میں مشہور تھا۔اپنی بیوی کی گفتگو سے متاثر ہوا اور اس کے دل میں شیخ کی عقیدت گھر کرگئی۔سب کے اصرار پر اس نے ملنے میں پہل کی اور اخلاق سے اس کی پذیرائی کی۔شیخ نے اپنی دعوت کے اہم حصوں پر مختصر سی تقریر کی اور اہل عرب کی برائیوں سے آگاہ کیا۔اوران کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔امیر متاثر ہوکر بے ساختہ بول اٹھا۔اے شیخ! یہ تو بلا شبہ اللہ کا دین ہے۔میں آپ کی امداد واطاعت اور مخالفین توحید سے جہاد کے لئے تیار

ہوں۔لیکن دوشرطیں ہیں ——— ایک یہ کہ اگر ہم نے آپ
کی مدد کی اور اللہ نے ہمیں فتح دی تو آپ ہمارا ساتھ نہ چھوڑیں
——— دوسرے یہ کہ اہل درعیّہ سے فصل کے وقت میں کچھ مقررہ
محصول لیتا ہوں۔آپ مجھے اس سے نہ روکیں۔شیخ نے جواب دیا
پہلی شرط بہ سروچشم منظور ——— **الدم بالدم و الھدم**
بالھدم ——— تمہارا خون میرا خون اور تمہاری تباہی میری
تباہی۔رہی دوسری شرط سو انشاء اللہ تمہیں فتوحات اور غنیمتوں سے
اتنا کچھ مل جائے گا کہ اس خراج کا دل میں خیال بھی نہ آئے گا“

سن رہے ہیں آپ! اس سفاک کی باتیں۔یہ صحیح العقیدہ سنی مسلمانوں کی خوں ریزی کو جہاد اور فتوحات کہہ رہا ہے۔اور ان کے مال واسباب پر ڈاکہ زنی کو غنیمت سے تعبیر کر رہا ہے۔اس جفا کش کو اپنی کامیابی کا یقین اس لئے ہے کہ جب وہ نہتے مسلمانوں پر فوج وسپاہ لے کر تاخت کرے گا تو وہ بے چارے مقابلے پر زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکیں گے۔ظاہر ہے جو لوگ تربیت یافتہ فوجی نہ ہوں، پھر ان کے ساتھ عورتیں بچے بوڑھے اور مریض سبھی ہوں گے وہ جنگی سامانوں سے لیس فوجیوں کا دفاع کتنی دیر کریں گے۔لہٰذا ان کی یہ ہزیمت، وہابیوں کی فتح ہے اور ان کا مال ظالموں کے لئے غنیمت۔خدا کی پناہ! اس بدترین شقاوت کی مثال کہیں مل سکتی ہے۔
محمد بن عبدالوہاب کے ان ہی سیاہ کارناموں پر پردہ ڈالنے کے لئے اسے مصلح قوم کہتے ہوئے آج ہندوستان کے وہابیوں کی زبانیں نہیں تھکتی ہیں ؎

کہتے ہیں جس کو زخم محبت، کچھ اور ہے
کہنے کو یوں تو، گل کا بھی سینہ فگار ہے

سطور بالا میں تاریخ نجد وحجاز کے حوالہ سے ایک وہابی کی تحریر کا جو اقتباس پیش کیا گیا ہے۔اس میں محمد بن سعود کی طرف منسوب دو جملے گہری توجہ کے قابل ہیں ——— (۱) اے شیخ! یہ تو بلاشبہ اللہ کا دین ہے۔(۲) میں مخالفین توحید سے جہاد کے لئے تیار ہوں۔

محمد بن عبدالوہاب کا کلمہ پڑھنے والوں سے میں صرف اتنا پوچھنا چاہوں گا کہ اگر دعوت شیخ ہی اللہ کا دین ہے۔تو پھر دین محمدی کیا ہے؟ ——— جملے کا تیور صاف بتا رہا ہے کہ بالکل پہلی بار سامنے آنے والا یہ دین، اللہ کا دین ہے۔ثانیاً یہ کہ ——— پوری دنیا میں پھیلے ہوئے اربوں مسلمان کس دین پر تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شیخ کی دعوت پر ایمان لانے سے قبل خود محمد بن سعود کسی دین پر تھے یا نہیں۔اگر تھے تو وہ کس کا دین تھا؟ ظاہر ہے کہ جب دو تعلیمات متصادم ہوں۔ان میں ایک کی تعلیم کو اللہ کا دین کہا جائے تو لامحالہ دوسرے کو اللہ کا دین قرار دینے سے انکار کرنا پڑے گا ——— بدنصیبی کا یہ تمغہ وہابیوں ہی کو مبارک ہو۔

(۲) یہ بات مسلم ہے کہ تحریک وہابیت، ادیان عالم کو چیلنج کرنے کے لئے نہیں اٹھی تھی۔اس کا نشانہ صرف دین محمدی پر چلنے والے لوگ تھے۔اس کی تصدیق یہ جملہ بھی کر رہا ہے کہ شیخ نے اپنی تقریر میں اہل عرب کی برائیاں بیان کیں۔پھر یہ کہنے کے کیا معنی کہ میں مخالفین توحید سے جہاد کے لئے تیار ہوں ——— ہے کوئی موحّد

ماں کی چھاتیوں کا دودھ پینے والا فرزند، جو عالم اسلام سے ایک فرد بھی ایسا ڈھونڈ لائے جو مسلمان ہوتے ہوئے بھی توحید کا مخالف ہو۔ سواد اعظم اہل سنت کو مشرک اور مخالف توحید کہنے میں ذرا بھی غیرت نہیں آتی۔ ان کی خون ریزی کو جہاد کا نام دیتے ہوئے کچھ بھی محشر کا خوف دامن گیر نہیں ہوتا۔

کلمے کا پہلا جزو محل نزاع کبھی نہیں بنا۔ ہاں کلمے کا دوسرا جزو انتشار کا باعث ضرور بنا کیونکہ ذات باری پر کسی فرقے نے انگشت نمائی کبھی نہیں کی۔ البتہ شان رسالت گھٹانے والوں نے اختلافات کے میدان ضرور ہموار کئے۔ جن لوگوں نے اپنے نبی کی محبت دل میں بسا کر ان کی اطاعت کو عین طاعت الٰہی قرار دیا وہ ان شاتمان رسول کے نزدیک مشرک ٹھہرے۔ اسی لئے انہیں کلمہ پڑھا کر اپنی ٹولی میں شامل کرنے کی مہم چلائی جا رہی ہے۔ کیونکہ اہانت رسول ہی ان کے نزدیک اصل توحید ہے ——— چین و جاپان کی سیر کرنے والوں کے متعلق کوئی نہیں بتا سکتا کہ انہوں نے کسی غیر مسلم کو کبھی کلمہ پڑھایا ہو۔ یا ان کو دین کی دعوت دینے کی جسارت بھی کی ہو۔ ان ظالموں کی تبلیغ کا دائرہ اور محور صرف مسلمان تھے۔

یہ سبھی جانتے ہیں کہ دوسو سال پیشتر دیار عرب میں محمد بن عبدالوہاب کے ذریعہ عقائد باطلہ کا ظہور ہوا اور ابن تیمیہ کی کتابیں اس کے لئے راہ نما ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد آل سعود کی فوجی طاقت اس مشن کے لئے سہارا بنی اور آج تک سعودی نظام اور ریال کے بل پر یہ مذہب چل رہا ہے۔ محمد بن عبدالوہاب کے استاذ عبداللہ بن ابراہیم بن سیف اور مولوی حیات محمد سندھی اگرچہ اسے گمراہی کے راستے پر ڈالنے والے تھے۔ اور برطانوی

جاسوس ہمفرے نے اسے نئے دین کی دعوت کا خواب دکھایا تھا۔ مگر اصلاً تحریک وہابیت محمد بن عبدالوہاب نجدی کی ذات سے ظہور پذیر ہوئی اور اسی کی کوششوں سے ایوان حکومت تک رسائی حاصل ہوئی۔ اس لئے اسے ہی مؤسس وبانی تسلیم کیا گیا ہے۔

امیر نجد اور شیخ کے درمیان اتحاد کا جو عہد ہوا تھا اس کے رو سے یہ طے پایا تھا کہ سیاسی عہدے آل سعود میں رہیں گے اور مذہبی منصب پر آل شیخ قابض رہیں گے۔ یعنی تلوار ابن سعود کی ہوگی اور مذہب محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ہوگا۔ اس عہد و پیمان کو دوسو برس گذر چکے ہیں لیکن آج بھی یہ تعلق اور اشتراک عمل کس مضبوطی سے قائم ہے۔ یہ جاننے کے لئے تاریخ نجد وحجاز دیکھئے۔ مولانا عبدالقیوم قادری ایک وہابی مولوی کے اقرارنامے سے یہ عبارت نقل کرتے ہیں۔

> ''یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑے بڑے دینی مناصب آل الشیخ (محمد بن عبدالوہاب نجدی کا خاندان) کے لئے مخصوص ہے اور دوسرے لوگ صرف اسی صورت میں دینی منصب پر مقرر کئے جاتے ہیں جبکہ آل الشیخ میں کوئی آدمی موجود نہ ہو۔ حرم مکہ کے خطیب اگرچہ شیخ عبدالمہیمن بصری ہیں لیکن وہ حرم کے خطیب اول نہیں بلکہ خطیب اول آل الشیخ کے ایک فرزند شیخ عبدالعزیز بن حسن ہیں۔''

اس اقتباس سے آل شیخ اور آل سعود کا اٹوٹ رشتہ معلوم ہوگیا۔ اب یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں رہی کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے نظریات کو اصل دین قرار دے کر سارے اسلام سے اس کے قبول کرانے کا بھوت حکومت سعودیہ پر کیوں

سوار ہو گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں کسی بھی سرد وگرم رویہ کو اپنانے میں وہ دریغ نہیں
کرتی۔ میرے دیرینہ رفیق اور عالم اسلام کی معتمد شخصیت حضرت مولانا قمرالزماں
خان اعظمی ورلڈ اسلامک مشن لندن نے پوری تحقیق کے بعد اعلانیہ یہ بات کہی تھی کہ
حکومت سعودیہ کے دفاعی فنڈ سے اس کے تبلیغی اخراجات زیادہ ہیں۔ آنے والے
صفحات میں ہم حکومت سعودیہ کے اسراف کا جو تفصیلی جائزہ لیں گے اس سے اس
دعوے کی پوری طرح تصدیق ہو جائے گی۔

آل سعود کی اب سے پہلے تک تبلیغی سرگرمیاں اپنے ملک تک محدود تھیں۔
لیکن ان کے نشانے کا رخ اب بدل گیا ہے۔ اب وہ پورے عالم اسلام کو اپنے خیالات
کا پیرو دیکھنا چاہتے ہیں اس تبدیلی کی شاید وجہ یہ ہے کہ حدود عرب میں ظاہراً اب انہیں
ایسا کوئی آدمی نظر نہیں آتا جسے مشرک کہہ سکیں انہیں صرف محمد بن عبدالوہاب کے دین کا
پابند موحد پسند ہے۔ دین محمدی کے پیرو موحد کو دیکھنا ان کو گوارا نہیں ہے۔ اب چاہے وہ
عرب کا ہو یا ہندوسندھ کا، ان کا عقیدہ بدلنا ہے اور ان پر وہابیت کا رنگ چڑھانا ہے
چنانچہ اس کام کے لئے انہوں نے تین رخ سے نہایت مضبوط جال بچھا رکھا ہے کیونکہ
اب تلوار کی طاقت کا زمانہ نہیں رہا۔ اب تو دولت ہی کی طاقت سے کام لینا ہے۔

پہلا جال :—— بیرون ملک کے حاجیوں کے لئے ہے۔

دوسرا جال:—— باہر سے آئے ہوئے ملازمت پیشہ جوانوں کے لئے ہے۔

تیسرا جال:—— مدارس اسلامیہ کے طلباء کے لئے ہے۔

اب آپ ذیل کی سطروں میں نمبروار ہر ایک کی تفصیل پڑھیے اور زمانے کی

ستم ظریفی کا ماتم کیجئے۔

(۱) منیٰ، مزدلفہ، عرفات، مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد خیف، مسجد قبا اور دیگر اہم
مقامات پر ان کے مبلغین بیٹھے ہیں تاکہ حاجیوں کو سکھائیں، پڑھائیں، وہابیت کی راہ
بتائیں، اسلاف کی راہ سے نفرت دلائیں اور اب تک جس ڈگر پر وہ چلتا آیا ہے اس سے
توبہ کرائیں۔ اگر حسن اتفاق سے مجلس میں کوئی سنی عالم موجود ہو اور گرفت کرے تو سلاخوں
کے پیچھے ڈھکیل دینے کی دھمکی دے کر اسے خاموش کر دیں۔ یہ پوری مشنری کس لئے
حرکت کر رہی ہے اہل تشیع پر تو ان کا جادو چل نہیں سکتا، قادیانی تو ان کے قریب آنے سے
رہے، باہر سے آنے والوں میں جو لوگ محمد بن عبدالوہاب پر ایمان پہلے سے لائے ہوئے
ہیں وہ تو اپنے ہی ہیں، اب رہ گئے سواد اعظم اہل سنت وجماعت۔ لے دے کے یہ ساری
سرگرمیاں ان ہی کے عقیدہ وایمان پر کاری ضرب لگانے کے لئے ہیں۔

حاجی حج کے دوران کتنی باتیں سیکھ سکے گا۔ اور جو سیکھے گا ان میں کتنی باتیں
یاد رکھ سکے گا۔ لہٰذا اپنی دعوت سے متعلق کتابچے، رسالے اور پرچے دنیا کی مختلف
زبانوں میں چھپوا کر مفت تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ تاکہ ہر زبان کا جاننے والا حاجی اسے
اپنے ساتھ لے جائے، پڑھے اور پڑھایا ہوا سبق یاد رکھے۔ خود پڑھنے کے بعد اپنے
بچوں کو، اہل خاندان کو اور احباب و اقرباء کو پڑھوائے اور رفتہ رفتہ پورا قبیلہ ایک ہی
سانچے میں ڈھل جائے —— یہ جان لینے کے بعد کہ ہندوستان و پاکستان کا ہر
حاجی پڑھا لکھا نہیں ہوتا۔ بہت سے ٹھپّا مار کوئلہ کان سے نکلے اور حج کو چلے آئے۔ ان
جاہلوں کے علاج کا سامان بھی اس دور جدید میں کچھ دشوار نہیں۔ زہریلی تقریریں
کیسٹوں میں بھروا کر ہر حاجی کی جیب میں دو کیسٹ رکھ دی گئی۔ وہ خود سنے گا، اس

کے گھر والے سنیں گے، بار بار دوستوں کو سنوائے گا اور سینہ پھلا کر کہے گا کہ عرب کی کیسٹ ہے ——— نتیجہ ظاہر ہے، کان کے راستے سے بدعقیدگی کی گیس سینہ پر جا کر جمنا شروع ہوگی اور ایک دن خوش عقیدگی کا دھڑکتا ہوا دل بیٹھ جائے گا۔

حجاج میں بیشتر ایسے نادان ہوتے ہیں جو ان کے مبلغین کو فرشتۂ غیبی اور ان کی کتابوں کو صحیفۂ آسمانی سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے ذہنوں پر مقدس جگہ اور محترم مقام کی دھونس جمی رہتی ہے۔ وہ لوٹ کر جب گھر آتے ہیں تو یہ بکواس شروع کر دیتے ہیں کہ وہاں تو میں نے یہ نہیں دیکھا اور وہ نہیں دیکھا۔ ان کم عقلوں کو کون بتائے کہ جو کچھ تم نے وہاں دیکھا ہے اس کو سو سال پورے نہیں ہوئے ہیں اور اسلام کا سورج ڈیڑھ ہزار سال پہلے طلوع ہوا ہے۔ پون صدی پیشتر تک اسلاف کی تمام روایات اور ان کے طریقے پورے جزیرۃ العرب میں جاری وساری تھے۔ تمہارا یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ غلط لوگ وہاں کیسے پہونچ سکتے ہیں۔ تم نے چھوٹے شیطان اور بڑے شیطان کو جو کنکریاں ماری تھیں تو وہ شیاطین کبھی وہاں تک پہونچے تھے۔ آج بھی اگر ان کے کارندے ہزاروں کی تعداد میں وہاں پہونچ رہے ہیں تو کیا تعجب ہے۔

(۲) عصبیت کے اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمت کا مسئلہ بڑا سنگین ہو چکا ہے۔ ان کی معاشی حالت دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ تجارتی میدان میں بھی قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا وہ روزگار کے سلسلے میں بیرونی ممالک کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہیں۔ پاکستان کی حالت بھی کچھ کم ناگفتہ بہ نہیں ہے۔ جب ان ملکوں سے مسلم نوجوان نوکری کی تلاش

میں عرب پہونچ گئے اور خوش بختی سے کسی فرم میں انہیں ملازمت مل گئی تو گھات میں بیٹھے ہوئے شکاری ان کے گرد منڈلانے لگتے ہیں۔ نام، پتہ، ٹھکانہ اور مقام معلوم کرنے کے بعد یہ کوشش شروع ہوجاتی ہے کہ ان کے معتقدات کے پیمانے بدل دئے جائیں اور وہ دو سال کے قیام کے بعد یہاں سے ہمارے عقیدے اور ہماری فکر لے کر واپس جائیں۔ اس کے لئے ہر ممکن تدبیر بروئے کار لائی جاتی ہے۔ مثلاً وعظ و نصیحت اور تعلیم وتنبیہ۔ اگر جوان ذہین ثابت ہوا اور دینی معلومات رکھنے والا نظر آیا تو اس کے ساتھ بحث وتکرار کا دروازہ بھی کھول دیا جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں اس کے مطالعہ کی میز پر ذہن سوز لٹریچرس اور وہابیت کا رنگ چڑھانے والی کتابوں کا انبار لگا دیا جاتا ہے۔ اور یہ وضاحت بھی کر دی جاتی ہے کہ ان کتابوں کی قیمت چاہئے نہ واپسی۔

کتابوں کی تقسیم میں نہایت فراخ دلی اور کشادہ قلبی سے کام لیا جا رہا ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کے وہ دانشوران جو ان کے ملک کی سرحدوں تک نہیں پہونچ سکتے ان کے اذہان پر چھاپہ ماری کے لئے سعودی سفارت خانوں اور وہابی اداروں کے توسط سے ان ملکوں تک ضخیم ضخیم کتابیں پہونچائی جا رہی ہیں۔ یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے۔ اہل علم جانتے ہیں اور ان کے تجربات اس کے گواہ ہیں۔ پھر بھی تاریخ نجد وحجاز اٹھایئے اور صفحہ ۶۸ کی عبارت پڑھئے۔

’’یہ کس قدر ظلم کی بات ہے کہ پاکستان جس کی اکثریت سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے وہ تو اپنا لٹریچر سعودیہ عربیہ نہیں بھیج سکتے۔

لیکن سعودی سفارت خانے کے ذریعہ پاکستان میں وہابی لٹریچر
جس کی ایک ایک جلد آٹھ آٹھ سوصفحات پر مشتمل ہے مفت تقسیم
کیا جارہا ہے۔''

آج ہمارے نوجوان نوے فیصد روایتی سنی ہیں۔انہوں نے جو اپنے بڑوں کو جو کرتے دیکھا وہ کر رہے ہیں۔سو میں سے دس ہی بمشکل ایسے ملیں گے جن کی جماعتی سطح پر ذہن سازی کی گئی ہو۔انہیں مسلک کے نوک و پلک سے آگاہ کیا گیا ہو۔اور انہوں نے خود بھی اپنے معتقدات کے پیمانے کو ناپا تولا ہو——— انہوں نے کتابوں کے آئینے میں وہابیہ اور دیابنہ کا اصل روپ بھی دیکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ ان کے عقیدے کی گہرائی میں اتر کر اسے جانچا پرکھا ہے۔کچھ لوگ ان پڑھ ہونے کے سبب ناواقف ہیں اور بہتوں کو ناول اور افسانوں سے فرصت کہاں کہ اس جانب توجہ دیں۔انجام کار معلوم ہے۔یہی دس فیصد جوان اپنے ایمان وعقائد کو بچا پاتے ہیں۔باقی تمام کے تمام چند سالوں کے اندر ان کی راہ کے راہی اور ان کے دام کے اسیر دکھائی دیتے ہیں۔یہ کوئی قیاس آرائی نہیں ہے۔میرے مریدوں میں پینتیس چالیس جوان بلاد عرب میں ملازمتوں پر مامور ہیں ان میں سے کتنوں کے پردۂ ذہن پر جمائی ہوئی بدعقیدگی کی دھول کو مجھے صاف کرنا پڑا ہے۔انہوں ہی نے مجھے بتایا کہ جب بھی کوئی نووارد وہاں پہونچتا ہے تو تبلیغی مکڑے ان پر اپنا جال بننا شروع کر دیتے ہیں اور جب تک وہ پورے طور پر ان کا ہم خیال نہیں ہو جاتا ، مذہب کے ان سوداگروں سے پیچھا چھوٹنا مشکل ہوتا ہے۔اگر کسی خوددار جوان نے اپنے مسلکی

تصلب کا کھلم کھلا اظہار کر دیا تو اس کی واپسی کا راستہ بھی بڑی آسانی سے صاف کر دیا جاتا ہے۔

(۳) سعودی سربراہوں نے مسلم آبادی والے ملکوں میں اپنے ایجنٹوں کا نہایت مستحکم جال بچھا رکھا ہے وہاں بڑے بڑے تعلیمی مراکز قائم کئے جا رہے ہیں۔پرشکوہ عمارتیں بنوائی جا رہی ہیں کثیر اخراجات والے مدارس کے اخراجات کا نصف حصہ کویت اور سعودیہ کی حکومتوں نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔آپ کو یاد ہوگا عراق نے جب کویت پر قبضہ جما لیا تھا تو بعض ادارے کے سربراہ کو عراق کی تباہی کے لئے رو رو کر بددعا مانگتے سنا گیا تھا۔اور وجہ انہوں نے خود ہی بتائی تھی کہ میرے ادارے کا آدھا خرچ کویت پورا کرتا ہے ——— کیا ہمدردی ہے کویت کو آپ سے؟ یہی نہ کہ آپ اپنی مشین کے ذریعہ اس کا مشن چلا رہے ہیں اور وہ آپ کے کارخانے کا خرچ چلا رہا ہے۔

وہابیت کی فیکٹری کے ٹھیکیداروں نے ان ہی کے سرمایہ سے ایسے ایسے بلند بام ادارے کھول رکھے ہیں جنہیں دیکھ کر لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ان اداروں کو آباد کرنے کے لئے باضابطہ سنی آبادیوں سے طلباء کی تحصیل ہوتی ہے۔انہیں کاپی، کتاب، دوا، علاج خلاصہ یہ کہ ہر نوع کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔بھلا اتنی ساری سہولتوں کے بعد کون ہے جو سنی طلباء کا راستہ روک سکے۔ہر آبادی سے بچے کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں۔اور گنتی کے چند سال ان کے ماحول میں گذار کر، ان کا ہی مشن لے کر میدان عمل میں اتر رہے ہیں۔سند و دستار کے بعد فرزند گھر پہونچا تو باپ نے اس کے اعزاز میں جلسہ کیا۔تقریر شروع ہوئی۔میلا دالنبی اور صلوٰۃ وسلام گناہ

ہے، غوث وخواجہ کی فاتحہ حرام ہے، بزرگوں کی قبروں پر جانا شرک ہے۔ بایں ہمہ باپ بہت خوش ہے کہ بیٹا عالم بن گیا۔ البتہ عہد کہنہ دیکھے ہوئے دادا سر پیٹ رہا ہے کہ ہائے ہائے یہ کیا ہوگیا مگر اس بے چارے کی اب کون سنتا ہے، وہ تو چراغ سحری ہے بجھ جائے گا۔

کل تک دیکھا جا رہا تھا کہ شوہر میلاد وفاتحہ میں بدعت کی بو سونگھتا ہے اور گھر میں سب کچھ ہو رہا ہے۔ اگر راہ چلتے کسی نے دامن پکڑا بھی کہ کیوں بھئی! باہر منع کرتے پھرتے ہو اور تمہارے گھر میں کیا ہو رہا ہے، تو پھیکا سا جواب ملتا، کیا کروں بیوی نہیں مانتی، مگر اب نقشہ الٹا نظر آ رہا ہے اور آثار بگڑتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ جگہ جگہ مدرسۃ البنات اور مدرسۂ نسواں کے نام سے ادارے کھول دئے گئے ہیں۔ باضابطہ دارالاقامہ کا نظم ہے تعلیم دینے کے لئے معلمات بحال ہیں اور اسے کویتی سکے اور سعودی ریال کا کرشمہ ہی کہئے کہ ادارہ طالبات کی ساری ضرورتوں کا کفیل بھی ہے۔ اب جبکہ بچوں سے زیادہ بچیوں کی تعلیم کا شوق جاگ اٹھا ہے تو ایسی درسگاہ میں جہاں شداد کی جنت کی آرائش موجود ہو، سنی گھرانوں کی لڑکیوں کو جانے سے روکنے کی کس کے اندر طاقت ہے۔ اور یہ بچیاں جب ان کے سائے میں پل کر جوان ہونگی اور برگ وبار لانے کے قابل ہوکر کسی گھر میں جائیں گی تو وہاں اپنی کن صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں گی، کیا یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے۔

اپنے کانوں سے غفلت کے پردے ہٹا کر میری باتیں سنئے! ان درسگاہوں میں سنی گھرانوں کی بچیاں پڑھ رہی ہیں۔ یہ قیاس نہیں میرا مشاہدہ ہے، بلکہ سنی

قائدین میں شمار ہونے والوں کی بچیاں بھی وہاں داخل درس ہیں۔ اب رہا یہ دعویٰ کہ ہماری بچیاں ان کا اثر قبول نہیں کریں گی یا ہم انہیں اپنے سانچے میں ڈھال لیں گے، محض خوش فہمی ہے۔ وہ لڑکیاں اپنے گھر کے آنگن میں اس وقت واپس ہونگی جب ان کی عمریں ڈھلنے ڈھلانے کی منزلوں سے گذر چکی ہونگی۔ ہاں آپ کی سوچ پر غالبؔ کا یہ مصرعہ ضرور صادق آتا ہے

ع دل کے بہلانے کو، غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

دشمن کے دامن کی مسموم ہوا ہمارے صحن خانہ تک پہونچ رہی ہے اور ہماری قوت حسّیہ اسے محسوس بھی نہیں کر پا رہی ہے اس سے بڑھ کر جماعتی بے حسی کی اور کیا مثال ہوسکتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں تو جیب وگریباں پھاڑ ڈالنے کو جی چاہتا ہے کہ باطل تحریک کے کرمچاریوں کے اندر، زندگی کی دھڑکنوں کو تیز کرنے کا کس قدر جذبہ موجزن ہے۔ اور حق کے پاسداروں کو اپنی قوم کی رگوں کا رستا ہوا خون بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔

ایک اور خطرناک راہ

وہابی ازم کی ایک نہایت کارآمد اور مضبوط شاخ تبلیغی جماعت ہے۔ جو فریب کاری کے ہتھیاروں سے لیس اور ریا کی دولتوں سے مالامال ہے۔ یہ جس محنت اور چابکدستی سے آقایان نعمت کا حق ادا کر رہی ہے اسی ہوشمندی سے ان کے عطایا بھی ہضم کرنا جانتی ہے۔ یعنی یہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ اتنا بڑا سرمایہ کہاں سے آ رہا ہے۔ کہیں امیر کی کرامت کہہ دو اور کسی کو جماعت کی برکت بتا دو۔ ان کے گرد جاہلوں کی جو بھیڑ اکٹھا ہے اسے اس قسم کی خوش کن باتوں سے مطمئن کر دینا کچھ مشکل نہیں ہے۔

میں نے جو سروے کیا ہے اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ تین طرح کے لوگ ان کے جھنڈے کے نیچے آسانی سے جمع ہوجاتے ہیں۔

(۱) بالکل جاہل، گنوار دیہاتی، جنہیں دین تو کیا، دنیاداری کا بھی شعور نہیں۔

(۲) موٹا کام کرنے والا الھڑ جوان یا اسکول وکالج کے وہ طلباء جنہیں کچھ دینی معلومات نہیں۔

(۳) وہ تاجر جنہیں صحیح غلط پرکھنے کی تمیز نہیں۔ زندگی میں صرف کمانا سیکھا ہے۔

جماعتی گروگھنٹال ان تینوں کو الگ الگ کاموں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ دیہاتیوں اور جوانوں کو ساتھ لے کر وہ گاؤں اور محلوں تک پہونچنے کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ بسااوقات صرف ایک شخص پوری آبادی کا تبلیغیوں کے ہاتھ سودا کردیتا ہے۔ طلباء کے سادہ ذہن پر اپنی گہری چھاپ اتار کر وہ اسے اپنے کام کا آدمی بناتے ہیں۔ جو مستقبل میں ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر اور حاکم بن کر ان کے لئے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ تاجروں اور سوداگروں سے زکوٰۃ کی موٹی رقم جماعت فنڈ کے نام پر وصول کرتے ہیں۔ داخلی اور خارجی دونوں فنڈ جمع ہوجانے کے بعد اب غم ہی کیا ہے کہ اجتماع کے لئے سرمایہ کہاں سے آئے۔

اس دور میں حق معلوم کرنے کی کسوٹی خراب ہوگئی ہے۔ کسی ادارہ کی عمارت بلند ہے، پیسوں کے زور پر انتظامات عمدہ ہیں۔ مدارس میں رہائش اور خوراک کا نظم بہتر ہے۔ اساتذہ اور طلباء کی تعداد زیادہ ہے۔ تو ان کا راستہ بھی درست ہے اور ان کا مذہب بھی حق۔ یہ ہے آپ کی کسوٹی پروپیگنڈہ کے بل پر پبلیسٹی کے ذریعہ، ڈگر ڈگر ڈفلی بجاکر، نگر نگر شور مچاکر، اگر کئی لاکھ کی بھیڑ اکٹھا کرلی گئی تو یہی کثرت سچائی کی دلیل

بھی ہے۔ یہ ہے آپ کی پیمائش۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ اس بھیڑ میں ہزاروں تماشہ بین بھی ہونگے۔ سینکڑوں لٹیرے اور پاکٹ مار بھی ہوں گے، تجارت اور دھندہ کی غرض سے آنے والے بھی ہوں گے۔ اور جاسوسی کی نیت سے پھرنے والے اغیار بھی ہوں گے۔ یہاں تو بس سروں کی گنتی مقصود ہے۔ بڑے فخر سے کہا جاتا ہے یہ امریکہ کے ڈاکٹر ہیں۔ یہ برطانیہ کے پروفیسر ہیں۔ یہ افریقہ کے سیاح ہیں۔ یہ فرانس کے انجینئر ہیں۔ یہ کویت کے شیخ ہیں اور یہ سعودیہ کے بڑے تاجر ہیں۔ آپ کے نزدیک یہی حقانیت کی میزان ہے۔ اور ان کے ہاتھوں پر بک جانے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

آج کل عوام کو یہ تأثر بھی دیا جاتا ہے کہ اکثر مدارس ان ہی کے ہیں۔ بیشتر مساجد پر ان ہی کا دخل ہے۔ تمام محکموں میں ان ہی کے آدمی ہیں۔ اہل سیاست انہی کے بہی خواہ ہیں اور رسائل واخبارات پر انہی کا قبضہ ہے۔ یہ ہماری کم نصیبی اور کوتاہی تو ضرور کہی جاسکتی ہے لیکن دوسروں کی سچائی کی دلیل نہیں بن سکتی۔ سچائی تو یہ ہے کہ ہمارا اصلی چہرہ سامنے ہو، ہمارے پیغام کے تمام پہلو نمایاں ہوں اور ہماری دعوت کا کوئی حصہ پوشیدہ نہ رہے—— سواد اعظم اہل سنت و جماعت کے سوا کائی جماعت ایسی نہیں ہے، جس نے عوام کے ردعمل سے بےخوف ہوکر اپنا اصل روپ قوم کے سامنے پیش کردیا ہو۔ انفس وآفاق پر پھیل جانے کے بعد بھی ان کے اصل عقائد زبانوں پر کم اور کتابوں میں زیادہ ہیں۔ جو لوگ بقچہ برداروں کے دوش بدوش دیکھے جارہے ہیں ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو جماعت کے بنیادی مقصد اور اصل خیالات سے آگاہ نہیں ہیں۔ بیشتر افراد صرف کلمہ ونماز کی ایک تحریک سمجھ کر ان کے ساتھ ہوگئے

ہیں۔اوران کے ساتھ اہل سنت کے اختلافات کو میلاد و فاتحہ اور چادر و گاگر کا جھگڑا سمجھتے ہیں۔یہ اور بات ہے کہ گڑھی ہوئی کرامتوں اور بنی بنائی ہوئی برکتوں کو سن سن کر وہ ایسے بہرے ہو چکے ہیں کہ اب حق سننے کو تیار نہیں۔ذہنی طور بھی اس قدر مفلوج ہو چکے ہیں کہ ان کے خلاف دلیل اور حوالے کی زبان میں کہی جانے والی ہر بات کو وہ بریلویوں کی طرف سے اتہام تصور کرتے ہیں۔اگر وہ حق معلوم کرنے کی ذرا بھی کوشش کریں تو ان کے لوٹ آنے میں دیر نہیں لگے گی۔

بدلتے حالات

ایسے اوقاف جن کے واقف یا واقفہ صحیح العقیدہ سنی تھے۔درجنوں اوقاف کو تو میں بطور خود جانتا ہوں جن کے واقفین نے اپنے وقف نامے میں مسلک اور منشائے وقف کی وضاحت بھی کردی ہے،جس کا جی چاہے مدرسہ انوار العلوم گیا اور جامع مسجد گیا کے وقف بورڈ کے کاغذات اٹھا کر دیکھے۔مگر آج ان تمام اوقاف پر دیوبندی قابض ہیں اور اس کی ساری آمدنی وہ اپنی منشاء کے مطابق خرچ کر رہے ہیں۔جس کی ایک زندہ مثال صغریٰ وقف اسٹیٹ بہار شریف بھی ہے۔صغریٰ وقف اسٹیٹ کے مالکان جناب مولوی عبدالعزیز اصدقی مرحوم اور حضرت بی بی صغریٰ مرحومہ، قطب عالم حضور سیدنا خواجہ شاہ قیام اصدق چشتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مرید اور مریدہ تھیں۔وقف خانقاہ کا کاغذ تیار کرا کر دونوں فٹن گاڑی سے آستانہ چشتی چمن پیر بیگھہ شریف پہونچے اور سرکار کے حضور پیش کیا۔آپ نے پوچھا یہ کیا ہے۔عرض کیا،سرکار کو تو معلوم ہے کہ ہم لوگوں کو کوئی اولاد نہیں اور جائداد بڑی ہے،نذر خانقاہ کا کاغذ بنوا کر لائے ہیں۔

سرکار قدس سرہٗ کا چہرہ سرخ ہوگیا،ریش مبارک پر ہاتھ پھیر کر تین بار فرمایا۔ فقیر کی سپیدی میں سیاہی لگانا چاہتے ہو۔جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو دونوں نے عرض کیا،اس باب میں سرکار کا کچھ حکم ہو۔فرمایا مدارس،مساجد اور غرباء و مساکین پر وقف کردو۔ چنانچہ دوسرا کاغذ بنام صغریٰ وقف اسٹیٹ تیار کرایا گیا۔یہ روایت میں نے اپنے بزرگوں کے علاوہ حضرت مولانا حکیم سید شاہ قسیم الدین بلخی الفردوسی رحمۃ اللہ علیہ گلزار ابراہیم بھینسا سور،بہار شریف سے بھی سنی ہے۔آج صغریٰ وقف اسٹیٹ پر سنیوں اور خانقاہوں کا کیا عمل دخل ہے۔اور اسکے تحت چلنے والے اداروں میں کتنے سنی اور خانقاہی بحال ہیں؟ جدھر دیکھئے واقفین کی روح کو آزار پہونچانے والے ان کی جائداد کو لوٹ کھسوٹ کر کھا رہے ہیں اور اس کے اصل حقدار اپنی کوتاہی اور نااہلی سے بہت دور جا پڑے ہیں۔

اکثر جائداد والی درگاہوں کی تولیت ایسے ہاتھوں میں چلی گئی اور باقی ماندہ بھی چلی جا رہی ہے۔جن کا مزاج یہ ہے کہ آپ بھی ٹھیک،اور آپ بھی ٹھیک۔سب ہی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔نتائج جو سامنے آئیں گے وہ معلوم ہیں۔آپ تو اپنی نادانی سے دامن جھاڑ کر الگ ہو جائیں گے کہ متولی ہمارا آدمی نہیں ہے اور وہ ہوشمندی سے دوڑ کر اس کے گلے لپٹ جائیں گے کہ میں تو آپ ہی کا آدمی ہوں۔اس کے بعد جو صورت حال سامنے آئے گی بلکہ آرہی ہے وہ بتانے کی ضرورت نہیں۔آج ہم اسی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں کہ بہار سنی وقف بورڈ، بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ، بہار اردو

اکادمی اوراز یں قبل دیگر تمام اداروں پران ہی کی اجارہ داری ہےاوروہ اپنے مقاصد کے لئے ان کا استحصال کررہے ہیں۔

اس وقت سنی وقف بورڈ کی سازش انتہائی شرمناک ہے۔ وہ معمولی وقف والی چھوٹی مسجدیں بھی سنیوں کے ہاتھ میں دیکھنا نہیں چاہتے۔ جبکہ اس مسجد میں سب کچھ دیا ہوا سنیوں ہی کا ہے۔ اگر کسی آبادی میں سنیوں نے خون پسینہ بہا کر کوئی مسجد تعمیر کی اور لب سڑک ہونے کے سبب اخراجات مسجد کے لئے دوکانیں وغیرہ بھی بنوادیں تو وقف بورڈ والے سرکاری حکام کی مدد سے زبردستی اس پر اپنا آدمی بیٹھا دینا چاہتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں مار پیٹ تک کی نوبت پہونچ جاتی ہے۔ اس طرح کے حادثات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں۔ میرے پاس اس کے درجنوں شواہد موجود ہیں۔ خاص کر موجودہ چیرمین کا رویہ تو کھلے عام جارحانہ ہے۔ بہار کی ان مثالوں سے آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اس قسم کے معاملات بہار ہی تک محدود ہیں پورے ملک کا تقریباً یہی حال ہے۔ مجھے بہت سی ریاستوں کے تلخ تجربات ہیں۔

جن عقائد و نظریات کو ہندوستان میں آئے ہوئے دو صدیاں بھی نہیں گذریں۔ ان نظریات کے ماننے والوں کا اثر و نفوذ ملک کے تمام سرکاری محکموں سے گذر کر بین الاقوامی اداروں تک جا پہونچا ہے۔ اور ہم ہیں کہ گذرنے والوں کی صرف خاک گذر دیکھ رہے ہیں۔ حالات کی ان حیرت ناک تبدیلیوں کے بعد بھی ہماری آنکھوں سے غفلت کی پٹی اترتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ کیا اتنا سب کچھ ہماری غیرت خفتہ کو جگانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ ہمارے جاگنے کا کوئی اور وقت آئے گا۔

سب باندھ چکے کب کے سر شاخ نشیمن
ہم ہیں کہ گلستاں کی ہوا، دیکھ رہے ہیں

ہندوستان میں وہابیت

ہندوستان میں وہابیت کے اول مبلغ مولوی اسماعیل دہلوی ہیں۔ وہابیت کو ہندوستان میں آنجناب کے ذریعہ پھلنا پھولنا تھا۔ اس لئے مولوی صاحب نے طبیعت اور خوبو، محمد بن عبدالوہاب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی پائی تھی۔ دونوں میں خاندانی مطابقت بھی تھی۔ محمد بن عبدالوہاب کے والد اور چچا حنبلی مسلک رکھتے تھے اور متبحر علماء میں شمار کئے جاتے تھے۔ انہوں نے حتی المقدور اسے کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کی۔ اور مولوی اسماعیل کے دادا، چچا، علماء احناف میں محدث کا درجہ رکھتے تھے اور ان کا خاندان علمی خدمات کے اعتبار سے پورے غیر منقسم ہندوستان میں مشہور تھا۔ ان کے چچاؤں نے بھی ان کو قابو میں رکھنے کی سعی کی تھی۔

محمد بن عبدالوہاب کے تذکرے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ جاہ پسندی، دنیا طلبی اور خودنمائی، اس کے مزاج میں رچی بسی تھی۔ مولوی اسماعیل دہلوی بھی ان ہی اوصاف کے جامع تھے۔ جس کا انکشاف میں آئندہ صفحات میں کروں گا۔ ہمفرے کے حوالے سے آپ پڑھ چکے ہیں کہ حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی میں سے کسی مسلک کی شیخ نجدی کی نظر میں کوئی اہمیت نہ تھی۔ مولوی صاحب موصوف نے بھی اپنے اسلاف کی راہ سے ہٹ کر غیر مقلدیت کی راہ ہموار کی ہے۔ ثبوت کے لئے دیکھئے ارواح ثلثہ کا مرتب جناب کے محاسن کے ذیل میں لکھتا ہے۔

''مولوی محمد علی صاحب اور مولوی علی احمد صاحب نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے عرض کیا، حضرت! مولوی اسماعیل نے رفع یدین شروع کیا ہے۔ اور اس سے مفسدہ پیدا ہوگا۔ آپ ان کو روک دیجئے۔ جب شاہ عبدالقادر صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا۔ میاں عبدالقادر! تم اسماعیل کو سمجھا دینا کہ وہ رفع یدین نہ کیا کریں۔ کیا فائدہ ہے۔ خواہ مخواہ عوام میں شورش پیدا ہوگی۔ شاہ عبدالقادر صاحب نے فرمایا۔ حضرت میں کہہ دوں گا مگر وہ مانے گا نہیں۔ اور حدیثیں پیش کرے گا۔''

شاہ عبدالقادر صاحب کے سامنے مولوی اسماعیل دہلوی پلے بڑھے تھے۔ اس لئے ان کو مولوی صاحب کے مزاج کا خوب خوب اندازہ تھا۔ چنانچہ ہوا وہی جو شاہ صاحب نے فرمایا تھا۔ جب مولوی صاحب کو تنبیہ کی گئی تو ان کے انا کو ٹھیس پہونچی۔ انہوں نے قیل وقال شروع کر دیا اور اپنی روش پر قائم رہے۔ مولوی صاحب کے مزاج میں جاہ پسندی اور دنیا طلبی کا عنصر غالب تھا۔ جب اس نے شرارت نفس کو مہمیز کیا تو جناب نے ایسے کاموں کا بیڑا اٹھالیا جو عاقبت کی بربادی کے ساتھ ساتھ دنیا کی رسوائی کا سامان بھی بنا۔ تفصیل جاننے کے لئے برادر مخلص جناب ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی کی ''تاریخ محاسبۂ تقویۃ الایمان'' کی یہ عبارت گہری توجہ سے پڑھئے ص ۶۸ پر لکھتے ہیں۔

''مذکورہ عبارت کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے آنجناب احساس کمتری کا شکار تھے اپنی حیثیت منوانے کے لئے اس طرح

کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنا، ان کی فطری مجبوری تھی انگریزوں نے ان کی نفسیات کا مطالعہ کرلیا تھا۔ اسی لئے انہیں اپنا آلۂ کار بنانے میں ان کو کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ بلا تبصرہ ایک انتہائی اہم حوالہ اس موضوع پر پیش ہے۔ مولانا حالی کے استاذ حضرت مولانا قلندر علی زبیری کی تصنیف ''تنزیل الندیر فی نظیر البشیر'' سے پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسیٹی کے سابق مترجم محترم محمد اسرائیل صاحب اپنے تاثرات کا ایک اقتباس نقل فرماتے ہیں آپ بھی ملاحظہ کریں۔

اور بلا شک مولوی اسماعیل دہلوی، حافظ قرآن اور عالم تھا۔ لیکن وہ تھا جھگڑا کرنے والا اپنے اکابرین و معاصرین سے۔ اور شدت کرنے والا عارفین کے خلفاء پر۔ ان سے اس واسطے عداوت تھی کہ امراء وسلاطین ان خلفاء اور عرفاء کو عطیات کثیرہ دیتے تھے۔ اس کو اس قدر نہ دیتے تھے۔ پس حسد ہوا اس کو اور اپنے وعظ میں برا کہنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ استعانت با اولیاء اور کرامت عرفاء سے بھی انکار کیا۔ اور اختیار کیا مذہب عبدالوہاب نامی نجدی کا۔ جس کی مذمت حدیث بخاری سے واضح ہے۔ پس اس زمانے کے علماء وفضلاء نے اس کو برا کہا اور برا جانا۔ اور اس سے مباحثہ کیا۔ اخر الامر مباحثۂ منجر بہ دشمنی ہوا۔ اور اس کی تکفیر

کی۔اور حاکم کے حکم سے دہلی سے خارج کر دیا۔''

دیکھا آپ نے۔ یہ تھا مولوی اسماعیل دہلوی کی دنیا طلبی کا نشہ، اپنے ہم عصر علماء وصلحاء کو وعظوں میں صرف اس لئے گالیاں دینے لگے کہ امراء انہیں نذرانے پیش کرتے تھے اور آنجناب کو نہیں۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ معاصرین کی چشمک میں اولیاء سے استمداد واستعانت کو ناجائز قرار دے دیا اور صوفیاء کی کرامتوں کا سرے سے انکار کر بیٹھے۔ اس پر بھی صبر نہیں ہوا تو اپنے خاندان کا تقدس پامال کر کے محمد بن عبدالوہاب کے خیمے میں جا بیٹھے۔ خاندان سے بیزاری کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ خاندانی عظمت کی گدی انہیں نہ مل کر کسی اور کو مل گئی تھی۔ ''تاریخ محاسبۂ تقویۃ الایمان'' کا یہ اقتباس پڑھیے اور مولوی صاحب کی تلوّن مزاجی کا تماشہ دیکھئے۔

''علامہ وحید احمد مسعود دہلوی لکھتے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے جب شاہ اسمٰعیل کے بجائے شاہ محمد اسحٰق کو اپنا جانشین بنایا تو کوئی وجہ نہیں کہ شاہ اسمٰعیل کو تحت شعور میں مایوسی نہ ہوئی ہو۔ ایسی حالت میں شاہ اسمٰعیل کو اپنی وجاہت قائم رکھنے کے لئے نیا راستہ بنانا تھا وہی بنا بھی لیا۔''

جاہ پرستی کا ایسا بھوت سر پر سوار تھا کہ گدی نہ ملی تو اپنے اسلاف کے دین سے پھر گئے اور جھوٹی شہرت حاصل کرنے کے لئے ایک نئے دین کے داعی بن گئے۔ محمد بن عبدالوہاب کی بدنام زمانہ کتاب ''التوحید'' کا اردو زبان میں چربہ اتار کر اس کا نام ''تقویۃ الایمان'' رکھا، جو غارت گر ایمان ثابت ہوئی اور ہندو پاک کے مسلمان

افتراق وانتشار میں مبتلا ہو گئے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ملک میں جو خلفشار برپا ہوا اور ہر طرف جو افراتفری مچی اس کی نشاندہی کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم سابق استاذ جامعہ ملیہ رقم طراز ہیں۔

''دراصل انیسویں صدی ہی سے نظریاتی بنیادوں پر علماء مختلف مکاتب میں تقسیم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اور مسلم معاشرہ بھی ان کی پیروی میں متعدد خیموں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ صدیوں تک ہدایہ ہندوستانی مسلمانوں کو راہ ہدایت دکھاتی رہی۔ لیکن نجد میں تصنیف کی ہوئی کتاب وسنت کی ایک نئی تعبیر ''التوحید'' کو انیسویں صدی میں ہندوستان میں درآمد کیا گیا۔ جس کا اردو چربہ ''تقویۃ الایمان'' نفاق کا باعث بنا۔ شاہ اسمٰعیل دہلوی کی کتاب تقویۃ الایمان کی اشاعت سے پہلے ہندوستانی مسلمان صرف دو گروہوں میں منقسم تھے۔ اہل سنت اور اہل تشیع۔ ان میں اول الذکر کی آبادی کثیر تھی۔

لیکن تقویۃ الایمان کے بعد اختلافات کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ سواد اعظم اہل سنت سے نکل نکل کر لوگ مختلف خیموں میں داخل ہونے لگے۔ اور اس طرح سواد اعظم کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ اس انتشار کی روک تھام اور اہل سنت کی شیرازہ بندی کے لئے بریلی کے ایک فاضل عالم نے عزم مصمم کیا۔ اور اس طرح انیسویں

صدی کے اختتام کے قریب اہل سنت و جماعت کے بریلوی مکتب
کی بنیاد پڑی، یہ فاضل عالم تھے مولانا احمد رضا خان۔"

(برطانوی راج میں مذہب اور سیاست مطبوعہ دہلی ص ۶)

اس اقتباس سے دو باتیں صراحتاً معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ مولوی اسمٰعیل کے ارتداد سے پہلے ملت مسلمہ متحد تھی۔ اور ہند و پاک میں گروہی تصادم کا کوئی تصور نہ تھا۔ تقویۃ الایمان نامی کتاب مسلمانوں میں شورش برپا کرنے والی ثابت ہوئی اور اسی نے مسلمانوں میں اختلاف کا بیج بویا۔ دوسرے یہ کہ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی، ہند و پاک کے مسلمانوں کو انتشار سے بچانے کے لئے میدان عمل میں آئے۔ اور سواد اعظم اہل سنت و جماعت کو ٹوٹنے سے بچانے ہی میں ان کی ساری کوششیں صرف ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب دیوبندی، وہابی تو بلا شبہ نہیں ہیں۔ لیکن وہ بریلوی بھی نہیں ہیں۔ ہاں! سواد اعظم اہل سنت میں ضرور ہیں اس لئے اختلاف امت کے سانحہ کے اسباب بڑی صاف دلی سے بیان کر رہے ہیں۔ ان کے اس بے لاگ تبصرے پر کسی کو انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔

قوم کی یہ کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ جس شخص نے کوئی نیا نظریہ نہیں رائج کیا، کوئی نئی راہ نہیں کھولی، اسلاف کے طریقوں سے ہٹ کر کوئی نئی ڈگر نہیں قائم کی۔ راہ حق سے پھرنے والوں کو صرف روکتا رہا، نئے نظریات کے فساد سے قوم کو مطلع کرتا رہا، زبان و قلم سے اسلاف کی تعلیمات کی روشنی زندگی بھر دکھاتا رہا۔ اسے نئے دین کا موجد اور جھگڑالو کہا جا رہا ہے اور نجد سے سہارنپور تک جن نفس پرستوں نے عقل عیار کے سہارے امت

کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ انہیں دین حق کا داعی اور کتاب و سنت کا پیرو بتایا جا رہا ہے۔

نادان دوست، کبھی کبھی دانا دشمنوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

یہ ضرور قابل افسوس ہے کہ بعض کم فہم لوگ اعلیٰ حضرت سے اپنی گہری عقیدت دکھانے کے لئے ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں، جس سے نہ اعلیٰ حضرت راضی ہیں اور نہ ان کی فکر اس سے متفق ہے۔ ہمارے اکابر و مشاہیر جو ہمارے لئے سند بن سکتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اس طرح کی بات نہیں کی، لہٰذا بازاری لوگوں کی بکواس کو آڑ بنا کر اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی شخصیت مجروح نہیں کی جا سکتی۔ ماننے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم اعلیٰ حضرت کو ایک فرقے کا بانی بنا کر پیش کریں یا ان کی تعریف کے پردے میں اساطین امت کی تحقیر کی راہ کھولیں، مثلاً اعلیٰ حضرت کا امام اعظم سے تقابل کر کے یہ کہنا کہ امام اعظم نے بہت سارے مسائل میں اپنے فتوؤں سے رجوع فرمایا اور ان کے شاگردوں نے بھی بعض مسائل میں ان سے اختلاف برتا ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے کبھی اپنے فتوے سے رجوع نہیں کیا۔ اور ان کے شاگردوں میں کبھی کسی نے ان سے اختلاف کی جرأت نہیں کی۔ یہ گفتگو جہل پر مبنی ہے اور امام اعظم کی بارگاہ میں خوفناک جسارت ہے۔ خود کو عالم کہنے والا کاش! گفتگو سے پہلے مفتی اور مجتہد کا فرق معلوم کر لیتا۔ یہ حماقت بھی کم افسوسناک نہیں ہے کہ آج خود کو فخریہ طور پر بریلوی کہہ کر دنیا کو ایک نئے فرقے کا ذہن دیا جا رہا ہے۔ جبکہ وہابیوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے مخاصمت میں ہمیں اس نام سے پکارا تھا۔ وہ اس طرح اپنے چہرے سے وہابیت کی کالک مٹانا چاہتے تھے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہم خود سے ان کا مدعا پورا کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ جب ہم بزبان

خویش خود کو فرقۂ بریلویہ تسلیم کریں گے تو اغیار سارے زمانے میں ڈنکے کی چوٹ پر خود کو اہل سنت و جماعت مشہور کریں گے۔ ابھی تو اتنا ضرور ہے کہ اہل سنت و جماعت کہنے سے کسی دوسرے کی طرف ذہن متبادر نہیں ہوتا۔

اسی اسمٰعیل دہلوی کے مشن کو فروغ دینے کے لئے دو راستے نکالے گئے۔ ایک مدرسۂ دیو بند، دوسرے خانقاہ گنگوہ۔ ان دونوں راستے کی ہمواری میں اس قدر عیاری اور ہوشیاری سے کام لیا گیا کہ قوم ان کے اصلی چہرے کو نہ پہچان سکے پھر ان دو سے شاخ در شاخ جماعتیں نکلتی گئیں اور ہر ایک نے الگ الگ محاذ قائم کر کے کام کرنا شروع کر دیا۔ طریقے بدلتے گئے اور نظریہ ایک رہا۔ نئے چہروں کو سامنے لانے کے لئے طریقۂ کار میں الٹ پھیر اور ناموں کی تبدیلی کی ضرورت محسوس کی گئی مگر مشن اپنی اصلی صورت پر باقی رہا۔ ابتداء میں انگریزوں کی کاسہ لیسی کے ذریعہ یافت ہوتی رہی۔ پھر تجوریوں کے دہانے ہی کھل گئے۔ ٹھنکتے سکے اور کھنکتے دینار برسنے لگے۔ اب چہرے پر نقاب کی بھی ضرورت باقی نہ رہی۔ چونکہ منڈی میں سب سے بڑے خریدار کی حیثیت سے یہ سامنے آ چکے ہیں۔ تفصیلات گذشتہ صفحات پر گذر چکیں۔

خطرناک چالوں کے دو نمونے

ارتقائی جولان گاہ میں گھوڑے دوڑانے کے لئے دو تعلیمی مراکز ہیں۔ ایک علوم عصریہ کے لئے اسکول اور کالج۔ دوسرے علم مشرقیہ کے لئے مدرسے اور دار العلوم۔ قومی ترقی کی تمام شاہراہیں ان دونوں مراکز سے ہو کر ہی گذرتی ہیں۔ ان دونوں میدانوں میں کامیاب زندگی کی مشق کرنے والی نسل و پود، جس کے قابو میں آ جائے گی،

گورنمنٹی محکموں سے لے کر تمام پرائیویٹ اداروں تک اس کا سکہ چلنے لگے گا۔ اس نزاکت کو وہابی ازم نے اچھی طرح بھانپ لیا۔ اسی لئے ان کے چھاپہ مار دستے ان دونوں میدانوں میں بڑی پختہ کاری سے کام کر رہے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ان میدانوں کے ہاتھ آ جانے کے بعد ان پڑھوں اور مزدوروں ہی کا طبقہ رہ جائے گا۔ جنہیں ان دونوں کے پیچھے چلنے کے سوا چارۂ کار نہیں ہے۔ اب آپ اپنے دشمنوں کے کام کا انداز معلوم کرنے کے لئے ذیل کی سطروں میں ایک افسوسناک مثال پڑھئے۔

گذشتہ سال جے پور کے پروگرام پر جاتے ہوئے دہلی میں میرا قیام ہوا تھا۔ میرے چھوٹے بہنوئی سید احسان احمد گیلانی آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اچھے منصب پر فائز ہیں۔ چونکہ وہ خود حاجی اور نمازی ہیں، اس لئے انہوں نے اپنے بچے کو اس خیال سے کہ وہ اردو اور دینیات سے بے بہرہ نہ رہ جائے ایک اسٹنڈرڈ مسلم اسکول میں داخل کرا دیا ہے۔ میرے دوران قیام ایک دن میرا بھانجہ بہت خوش خوش اسکول سے آیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک کتاب تھی جسے میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس نے کہا ماموں جان! یہ کتاب مجھے اسکول سے فری ملی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ گھر جا کے اس کتاب کو پڑھو گے امی اور آپی کو بھی پڑھاؤ گے۔ شاید اس طرح کی بیہودہ کتابیں اسے پہلی بار نہیں بلکہ پہلے بھی مل چکی تھیں۔

کتاب کا نام ''بدعات مروجہ'' ہے۔ کتاب کے مؤلف کا نام ''شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز'' ہے۔ اصل کتاب عربی میں لکھی گئی ہے مترجم کا نام ''سیف الرحمٰن الفلاح'' ہے۔ کتاب کیا ہے، خباثت نفس کا بدترین مجموعہ اور رسول دشمنی کا زندہ، جاگتا

نمونہ ہے۔جلی سرخیوں میں دئے گئے عنوانات سے کتاب کی زہرافشانیوں کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔کتاب اس وقت میرے پیش نظر ہے۔عنوان ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) یوم میلاد کی محفلیں اور رسومات حرام ہیں۔

(۲) شب معراج کو جلسہ اور اجتماع کرنا بدعت ہے۔

(۳) شب برأت میں جلسے میں جانا اور مجمع لگانا بدعت ہے۔

کتاب کا مترجم اپنے ابتدائیہ میں خبث باطنی کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے۔

''چونکہ ہمارے ملک پاکستان میں بھی مذکورہ بالا بدعات رائج ہیں۔ بدیں وجہ ان کی تردید کے پیش نظر ان مقالات کو اردو زبان میں منتقل کر دیا ہے۔ تاکہ اردوداں طبقہ بھی اسے آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکے۔ شاید یہ کسی کا ذریعہ نجات اور جنت کا موجب بن سکے۔'' (ص ۵)

وہ کہنا چاہتا ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی میلاد پاک منانے اور فاتحہ وشیرینی کا اہتمام کرنے والے، ۲۶ویں رجب کو معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جلسہ کرنے والے اور آقائے کائنات کے سفر معراج کا تذکرہ کرنے اور سننے والے، شب پندرہویں شعبان کو مسجدوں میں جمع ہو کر ذکر و تلاوت کرنے والے سب کے سب جہنمی ہیں۔ جو لوگ میری اس کتاب کو پڑھ کر ان تمام کاموں سے توبہ کرلیں گے وہی جنت میں جائیں گے اور میری یہ کتاب ان کے لئے ذریعۂ نجات بنے گی۔

خدا کی پناہ! خدا کی بارگاہ کے سجدہ گذاروں کو جہنمی کہتے ہوئے اس غارت گر

کو خدا کا خوف بھی نہیں آیا۔رات کی نیند قربان کر کے خانۂ خدا میں سجدہ ریز بندے جہنمی ہیں۔خواجۂ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں رات جاگ کر گذارنے والے بندے جہنمی ہیں۔ یہ سیاہ دل، محمد بن عبدالوہاب نجدی کے دین کا پیروکار، حقدار جنت ہے۔ وہ دن دور نہیں جب تمہارے قلم کی سیاہی تمہارے ماتھے پر کالک کا نشان بن کر ظاہر ہوگی۔

ذرا غور فرمایئے۔ایسی عمر کا بچہ، جس کا ذہن کورس کی کتابوں کے علاوہ دیگر کتب و رسائل کے اسباق کا متحمل نہیں یا درسی کتابوں کے بعد دینیات میں اللہ کی وحدانیت، رسول کی رسالت، اسلام کے ساتوں کلمے اور طریقۂ نماز بتائے جانے کے لائق ہے، اس سے زیادہ کی ہرگز گنجائش نہیں۔ ان بچوں کو اس قسم کی کتابیں تھما کر ایسی ہدایات دینے کے کیا معنی؟ ان کو ابھی ان مباحث سے کیا سروکار۔ مگر برا ہو دین کے دشمنوں کا۔ان کا مشن ہی یہ ہے کہ بالکل سادہ لوحی کے زمانے میں بچوں کا ذہن زہر آلود کر دیا جائے اور ان کی وساطت سے ماں اور بہن کے عقیدہ و ایمان پر بھی چھاپہ ماری کی جائے۔ جو لوگ خانقاہ کے صاف ستھرے ماحول میں پلے بڑھے ہیں اس قسم کی ایمان سوز کتابیں ان پر اثر انداز نہ ہوں یہ الگ بات ہے۔ ورنہ عام حالات میں ایسی کتابوں سے لوگوں کی فکر کا مجروح ہو جانا اور ان کے دماغ میں بدعقیدگی کا پوائزن بھر جانا، ایک فطری امر ہے۔ خاص کر ایسے بچے جو ابھی کچھ نہیں جانتے ہیں، وہ اسے ہی اصل دین سمجھنے لگیں گے۔

یہ کتاب لکھی گئی عرب میں، اس کا ترجمہ کیا گیا پاکستان میں، تقسیم ہو رہی ہے ہندوستان میں۔ مکہ، کراچی اور دہلی میں بھائی چارگی کا رشتہ کس طرح پیدا ہوا۔ ان کا باہمی گٹھ جوڑ کیسا ہے۔ اور یہ ایک دوسرے سے قریب کس لئے ہوئے۔ اسے ماننے

کے لئے مولوی سیف الرحمٰن الفلاح کے ابتدائیہ کا یہ اقتباس چشم حیرت سے پڑھئے، جس میں اس نے اپنے آقاؤں کا گن گاتے ہوئے پوری دنیا میں تحریک وہابیت کو پھیلانے کا سہرا حکومت سعودیہ کے سر ڈالا ہے۔ اور اقرار کیا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کے دولت کے سہارے ہو رہا ہے۔ صفحہ ۵ پر وہ لکھتا ہے۔

"اللہ سعودی حکومت کو مسند اقتدار پر تا قیامت رکھے۔ جس کا اصل مشن تمام روئے زمین پر توحید و سنت کے پودوں کی تخم ریزی اور آبیاری ہے۔ اور شرک و بدعت کے نجس اور بدبودار پودوں کا قلع قمع کرنا ہے۔ اس نے اپنے ملک میں جید علماء پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا ہوا ہے۔ جس کے ڈائرکٹر جنرل سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز حفظہ اللہ ہیں۔ یہ جو وقتاً فوقتاً اپنے تحقیقی مقالات شائع کرتے رہے ہیں۔ بدعات کی تردید کے سلسلے میں ان کے چند مقالات جامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ نے کتابی صورت میں جمع کر کے شائع کئے ہیں۔"

مذکورہ بالا عبارت سے یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ ان تینوں کے باہمی رشتے کس نوعیت کے ہیں۔ اور ان سبھوں کا ایک دوسرے سے تال میل کس مقصد کے لئے ہے۔ اگر اب بھی آپ کو سمجھنے میں دشواری ہو رہی ہو تو اسے یوں سمجھیں کہ حکومت سعودیہ کمپنی ہے، شیخ عبدالعزیز بن باز کے بورڈ کا کام مال برآمد کرنا اور اس پر سعودیہ کا لیبل لگا کر سپلائی کرنا ہے۔ دہلی اور کراچی میں اس کی ایجنسی ہے۔ کمپنی کا تعارف

گذشتہ صفحات میں شرح و بسط کے ساتھ کرایا جا چکا ہے۔ یہاں مال سپلائر کا تعارف اور اس کا اصلی چہرہ دکھا دینا ضروری ہے۔

کتاب کا نام "التحذیر من البدع" ہے۔ جس کا اردو ترجمہ "بدعات مروجہ" ہے۔ اصل مؤلف کا نام، شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز ہے۔ شیخ عبدالعزیز کے باپ، شیخ عبداللہ بن باز، حکومت سعودیہ کے محکمہ افتاء کے صدر الصدور تھے۔ انہوں نے ۱۹۷۵ء میں یہ فتویٰ صادر کیا تھا کہ مسجد کے اندر کسی کی بھی قبر رہنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف، مسجد نبوی سے دوسری جگہ منتقل کر دی جائے۔ یہ فتویٰ سعودی عرب کے ایک مقبول اور کثیر الاشاعت، عربی جریدے میں چھپا تھا۔ اس اشاعت سے حکومت سعودیہ کا مقصد یہ جاننا تھا کہ عالم اسلام کا اس پر رد عمل کیا ہوتا ہے۔ آیا یہ کام ممکن بھی ہے یا نہیں۔

معاذ اللہ! گنبد خضریٰ کو مسمار کر دینے کا یہ ناپاک منصوبہ، جوں عالمی منظر نامے پر ظاہر ہوا۔ پوری دنیا میں بھونچال آ گیا۔ مسلم عوام سڑکوں پر نکل آئی۔ دنیا بھر کے اخبارات و رسائل نے لے دے مچائی۔ خاص کر ہند و پاک کے سواد اعظم اہل سنت تو آپے سے باہر ہو گئے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے ۱۹۷۶ء میں بھاگا بازار ضلع دھنباد میں ایک تاریخ ساز "تحفظ گنبد خضریٰ کانفرنس" میں نے بلائی تھی۔ میرے ساتھ الحاج محمد اسحٰق اصدقی مرحوم بھاگا بازار روشن منزل، جناب بابو واجد حسین رضوی مرحوم جھریا، جناب محمد عنایت اللہ قادری مرحوم اور جناب بابو محمود حسین صاحب سرگرم عمل تھے۔ شرکاء اجلاس میں، قائد ملت حضرت مولانا سید شاہ اسرار الحق شاہجہاں پوری، مجاہد دوراں حضرت مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی، قائد اہل سنت حضرت

علامہ ارشد القادری، فخر بہار حضرت مولانا محمد میاں کامل سہسرامی علیہم الرحمہ اور خطیب الہند حضرت مولانا محمد قمر الزماں خان اعظمی قابل ذکر ہیں۔ اس عظیم الشان کانفرنس کے بعد ملک بھر میں اسی نام سے بڑے بڑے احتجاجی جلسے ہوئے۔ مگر کوئی نہیں بتا سکتا ہے کہ دیوبندی اور غیر مقلدوں کی طرف سے کہیں بھی کوئی معمولی احتجاجی جلسہ ہوا ہو۔ اس سے ان کی رسول دشمنی ظاہر ہے اور حکومت سعودیہ کی حق نمک خواری بھی۔

بیشتر مسلم ملکوں کے سربراہوں نے اس کا نوٹس لیا اور براہ راست حکومت سعودیہ سے استفسار کیا تو مجبور ہو کر سعودیہ حکومت کو اعلان کرنا پڑا کہ شیخ عبد اللہ بن باز کا یہ ذاتی خیال ہے۔ حکومت سعودیہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی ہے۔ تب کہیں جا کر معاملہ ٹھنڈا پڑا اگر اس میں حکومت کا ایماء شامل نہ ہوتا تو نہ صرف یہ کہ عبد اللہ بن باز، اپنے عہدے سے معزول کر دیا جاتا، بلکہ قابل گردن زدنی قرار پاتا۔ جس رسالے میں یہ فتویٰ شائع ہوا تھا، اسے بھی بخش دئے جانے کا کوئی جواز نہ تھا۔ مگر یہ سب کچھ آپسی ملی بھگت سے ہوا تھا۔ ذرا اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ اگر اس مسئلے پر پورا عالم اسلام خاموش رہ جاتا تو انجام کار کیا سامنے آتا۔

اسی خانہ خراب باپ کے بیٹے شیخ عبد العزیز ہیں۔ ان سے اس کے سوا اور توقع ہی کیا کی جاسکتی ہے۔ ''ہر چہ پدر نتواند پسر تمام کند'' کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اسی لئے حکومت سعودیہ نے یہ بدعقیدگی کی غلاظت پھیلانے والے بورڈ کا انہیں ڈائرکٹر بنا دیا ہے۔ اب تو ان کو کھلی چھوٹ ہے، ان کا بے لگام قلم جو چاہے لکھے۔ حکومت کی مشنری کو اسے پوری دنیا میں پھیلا ہی دینا ہے۔ ان کے وفادار کارندے، ہمہ وقت

اشارۂ ابرو کے منتظر ہیں۔ اور ان کے نمک خوار ایجنٹ ہر جگہ دفتر سنبھالے کھڑے ہیں جب یہ حکومت سعودیہ کا اصل مشن ہی ٹھہرا تو اب اس کے پیچھے جتنا بھی تیل جل جائے، غم کس بات کا ہے۔ غم تو جب ہوتا کہ حکومت کا یہ ذیلی اور ضمنی پروگرام ہوتا۔

ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید و سنت کی جو تخم ریزی فرمادی ہے۔ ہمارا کام بس اسی شجرۂ مبارکہ کی آبیاری کرنا ہے اور مرتے دم تک ان ہی توحیدی خطوط پر ثابت قدم رہنا ہے۔ لاریب! یہی معیار ایمان اور بلاشبہ یہی مدار نجات ہیں۔ ہاں! وہابی تحریک کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دئے ہوئے توحید کے پیمانے سے ہٹ کر من چاہی توحید کا معیار قائم کرنا ہے اور اپنے ہی ہاتھوں لگائے ہوئے توحیدی پودوں کی آبیاری کرنا ہے۔ یہ میرا کوئی اتہام نہیں ہے۔ مولوی سیف الرحمٰن الفلاح خود ہی اس کے اقراری ہیں۔ ان کے یہ الفاظ آپ نئی توجہ کے ساتھ پھر سے پڑھئے۔

> ''اللہ سعودی حکومت کو مسند اقتدار پر تا قیامت رکھے۔ جس کا اصل مشن روئے زمین پر توحید و سنت کے پودوں کی تخم ریزی اور آبیاری ہے۔''

یعنی اصل مشن، نئے دین کی تخم ریزی کرنا ہے اور اپنے بوئے ہوئے بیج کا جو توحیدی پودا اگے گا، اسی پودے کی آبیاری کرنا ہے۔ خدا بچائے ایسی توحید سے جو خود ساختہ اور خود پرداختہ ہو۔ کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کے مطابق، اللہ تعالیٰ کو تمام عیوب پر قادر ماننا، حتیٰ کہ جھوٹ بولنے پر بھی قادر جاننا، وہی توحید ہے۔ جس کی تخم ریزی ان کے بابائے قوم نے کی ہے اور حکومت سعودیہ کا اصل مشن اسی توحید کی آبیاری ہے۔

حملے کے خطرناک نوعیت کو بتانے کے لئے مجھے تھوڑی تفصیل میں جانا پڑا ہے۔ ورنہ اس وقت میرا مدعا ''بدعات مروجہ'' کا جواب لکھنا یا اس پر کوئی تبصر کرنا مقصود نہیں ہے۔ آج کی نشست میں ہم اپنے احباب کو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دشمن کہاں کہاں گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہماری مہینوں کی محنت، ان کے برسوں کی محنت پر پانی پھیر سکتی ہے۔ مگر پہلے ہم جاگیں تب تو، اپنی گود کے پالوں کی ہلاکت کا غم ہم کو ستائے تب تو۔ یہاں تو ہم خواب خرگوش میں پڑے ہوئے اندر ہی سے کہہ رہے ہیں کہ باہر سب خیریت ہے۔ قومی قیادت کی زمام جن ہاتھوں میں ہے وہ خود کو تنہا تصور کرنے لگیں اور اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر لذت کام و دہن میں مصروف ہو جائیں تب تو قوم کے بیڑے کا خدا ہی حافظ ہے۔ حضرت علامہ سید مرتضیٰ حسن شفق عماد پوری علیہ الرحمہ نے سچ فرمایا ہے۔

اب قوم کے بیڑے کا خدا ہی حافظ
ناؤ بھنور میں ہے اور نا خدا کوئی نہیں

دوسرا تعلیمی مراکز

مدارس اور دارالعلوم ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی آبادی میں اغیار کے مدارس اور دارالعلوم موجود ہیں۔ اور ان کے یہاں طلباء بھی زیادہ ہیں۔ وہ سنی آبادیوں سے باقاعدہ طلباء کی تحصیل کرتے ہیں۔ شاندار عمارت اور عمدہ انتظام دیکھ کر ہر باپ اپنے لڑکے کو مکتب فکر کا خیال کئے بغیر ان کے حوالے کر دیتا ہے۔ جو بچہ کچھ نہیں جانتا اس کو بھی چند دنوں کے اندر اتنا ضرور سکھا دیا جاتا ہے کہ فاتحہ کی ہوئی شیرینی نہیں کھائی

جاتی، وہ بتوں پر چڑھاوے کی مٹھائی کی طرح حرام ہے۔ یہ کوئی کہاوت نہیں ہے میرے ذاتی تجربات اس کے شاہد ہیں۔

جو لڑکے ہوشیار اور شعور مند ہیں۔ ان کو باضابطہ مباحثہ کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ایک کو بریلوی عقائد کی بے جان اور پھس پھسی دلیل یاد کرا کر بحث کی مشق کرائی جاتی ہے اور دوسرے کو دیوبندی مذہب کی وکالت کے لئے عقلی و نقلی دلائل کی پختہ تیاری کرائی جاتی ہے۔ پھر تمام طلبہ کی موجودگی میں دونوں کے درمیان مباحثہ کرایا جاتا ہے۔ گھنٹوں کی بحث و تکرار کے بعد بریلوی مکتب فکر کی فرضی حمایت کرنے والے طالب علم سے ہار منوائی جاتی ہے۔ یہ بھی کوئی اختراع اور الزام نہیں ہے۔ ہمارے پاس اس کے بہت سارے ثبوت و شواہد موجود ہیں۔ یہاں ان کی تفصیلات کا موقع نہیں ہے۔

اس طرح کی نازیبا حرکتوں کے پیچھے ان کے دو مقاصد پوشیدہ ہیں۔ اولاً تو یہ کہ بچوں میں لاشعوری کے زمانے ہی میں ذہن پر یہ گرد جمائی جائے کہ بریلوی مذہب نہایت کمزور، پھس پھسا اور بے جان ہے۔ اس کے دماغ میں بریلویوں کی اتنی نفرت بھر دی جائے کہ لڑکا اگر مدرسہ چھوڑ بھی دے تو کسی بریلوی ادارے کا رخ بھول کر بھی نہ کرے۔

ثانیاً یہ کہ وہ اسی عمر سے اپنے گھروں کے تمام مراسم فاتحہ، عرس، میلاد اور سلام و قیام سے نفرت کرنے لگیں۔ اور جہاں تک بس چلے ابھی سے وہ اپنے گھروں کو جا کر ان مراسم کو بند کرانا شروع کر دیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ان کو یہاں تک کہنے سے دریغ نہیں ہے کہ غوث پاک کے فاتحہ کا مرغ، سور سے زیادہ حرام ہے۔ معاذ اللہ! وہ اس راز کو پا چکے ہیں کہ دلائل کی زبان میں کسی چیز کو جائز یا ناجائز ثابت کرنا دشوار ہے مگر کسی

چیز سے نفرت دلا دینا بہت آسان ہے اور اس حربہ کو وہ طلباء پر استعمال کر رہے ہیں۔

یہ مجھے معلوم ہے کہ ہمارے یہاں وسائل کی کمی ہے۔ غیر ملکی سرمائے کا دروازہ ہم پر بند ہے۔ اغیار بیرون ملک کی امداد کے بل بوتے پر اپنے طلباء کے لئے جو سہولتیں مہیا کر رہے ہیں وہ ہمارے لئے ممکن نہیں ہیں۔ غم اس بات کا نہیں ہے۔ دکھ اصل اس کا ہے کہ ہم جو کر سکتے ہیں وہ بھی نہیں کر رہے ہیں۔ نئے طلباء کی ذہن سازی اور ان کی فکری اصلاح کے لئے کوئی فنڈ درکار نہیں ہے۔ شعور مند طلباء کو مسلک کی نوک و پلک سے واقف کرانے کے لئے الگ سے کسی بجٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے لائق اور مخلص اساتذہ کی خصوصی توجہ مطلوب ہے۔ اور یہ کام وقت کی تھوڑی قربانی چاہتا ہے۔ طلباء کو صرف جارحانہ تقریر یاد کرا دینا مسئلے کا حل نہیں ہے۔

بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارے کارندوں کا ذہن ہر میدان میں سوداگرانہ ہوتا جارہا ہے۔ وہ کوئی قدم بھی بغیر معاضہ کے اٹھانے کو تیار نہیں ہیں۔ حتی کہ تعلیم و تربیت کو بھی دو خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ اور مزاج یہ ہے کہ ہم تو تعلیم دینے کی تنخواہ پاتے ہیں، تربیت کا بوجھ کس لئے اٹھائیں اب جو یہ طلباء مدرس بن رہے ہیں تو بے چارے نے تربیت سیکھی ہی نہیں تو لائیں گے کہاں سے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جیسے خود ہیں ویسی ہی فصل تیا کر رہے ہیں۔ درد سے لبریز دل رکھنے والا ہی دوسروں کو درد کی لذت سے آشنا کرا سکے گا۔ میں نے جب ۱۹۷۴ء میں ادارۂ شرعیہ کا عہدۂ اہتمام سنبھالا تھا۔ تو پوری عمارت میں مجھے تنہا رہنا پڑتا تھا۔ باقی لوگ ٹائم پر اترتے تھے۔ ایک دن مجھے جھاڑو دیتے ہوئے ایک پروفیسر صاحب نے دیکھ لیا۔ انہوں نے اپنے دوستوں میں کہا!

اب ادارۂ شرعیہ اپنا مقام پالے گا۔ جو مہتمم خود ہاتھ میں جھاڑو اٹھالے اسے اپنا مقام بنانے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ مجھے جب ان کے تأثر کی اطلاع ملی تو میں نے کہا سبحان اللہ! یہ ہے دانشوروں کا مزاج۔ کہ ہاتھ میں جھاڑو دیکھ کر تضحیک نہیں، تعریف کر رہے ہیں، اور حق یہی ہے جو انہوں نے کہا۔

بغیر کسی شان کے آج ہم کو ہر کام میں کسر شان کا غم ستا رہا ہے۔ اور شان والوں نے کبھی کسی کام کو کسر شان نہیں سمجھا۔ میرے استاذ حضور حافظ ملت کو مبارکپور کے گاؤں سے کچھ لوگ دعوت دینے آئے۔ آپ نے فرمایا، کتنی دور ہے۔ لوگوں نے بتایا چھ میل ہے، حضرت نے پوچھا سواری کون سی جاتی ہے۔ لوگوں نے عرض کیا، سوائے سائیکل کے اور کوئی سواری نہیں جاتی۔ حضرت نے فرمایا، کبھی میں دس میل بھی پیدل چل لیتا تھا، مگر اب اس کی قوت نہیں ہے۔ آپ ایک اچھے سائیکل سوار کو بھیج دیں جو مجھے پیچھے بٹھا کر لے جا سکے۔ استاذی الکریم حضرت قاری محمد یحیٰ صاحب نے خفا ہو کر فرمایا۔ سائیکل پر بیٹھ کر جانا، حضرت کے شایان شان نہیں ہے۔ وہ کون سی جگہ ہے، جہاں پالکی نہیں جاتی۔ انہیں حضرت کو لے جانا ہے تو پالکی کا انتظام کریں۔

کوئی ہمیں بتائے کہ قاری صاحب علیہ الرحمہ نے غلط کیا کہا تھا۔ ان کا فرمانا حق تھا۔ ہر بادی النظر میں سچ تھا۔ حضرت کی عمر بھی اس کی متقاضی نہیں تھی۔ مگر واہ رے مرد پیر، للّٰہیت، خلوص، دینی لگن اور بے نفسی جس پر سو جان سے قربان تھی۔ حضرت قاری صاحب مرحوم کی طرف دیکھ کر مسکرائے پھر فرمایا، قاری صاحب! میں کام دیکھتا ہوں، شان نہیں۔ شان دیکھنے سے تو کام ہی نہیں ہوگا۔ یہ میں کوئی روایت نہیں بیان کر

رہا ہوں۔ میں خود اس مجلس میں حاضر باش تھا۔ اللہ اکبر! ہمارے اسلاف اتنی اونچی شان رکھ کر بھی شان دیکھنے کی لعنتوں میں گرفتار نہیں تھے۔ اسی لئے ان کا کام، خاک سے اٹھ کر، افلاک کو چھو رہا تھا، اور پیچھے آنے والوں سے ان کا نشان قدم کہہ رہا تھا۔

ہم کو بننا ہے، نشان راہ منزل دوستو
ہم اگر بھٹکے تو کتنے کارواں کھو جائیں گے

☆☆☆

تصویر کا دوسرا رخ

سواد اعظم اہل سنت، ایک ایسی جماعت ہے جس کا دنیا کے کسی فرقہ سے اتحاد نہیں ہے۔ سارے فرق "الکفر ملة واحدة" کے مصداق، اہل سنت کے مقابلے پر ہم آہنگ اور یک زبان ہیں۔ ان اتحادی طاقتوں سے تنہا نبرد آزما ہو کر اس کا زندہ رہنا ہی اس کی حقانیت کی دلیل ہے۔ دو سو سال کے اندر جن تحریکوں نے دین داری کا روپ دھار کر سر اٹھایا، انہوں نے اپنے خود ساختہ مذہب کا ہمنوا کہاں سے بنایا۔ ہمارے ہی جوانوں کو توڑ کر، ان کے گرد فریب کا پھندا ڈال کر، انہوں نے اپنی سرگرمیوں کے لئے زمین کہاں سے حاصل کی، ہمارے ہی قلم رو میں چور دروازے سے گھس کر ناجائز طور پر قبضہ جمایا۔

مشہور ہے کہ مولوی اشرف علی تھانوی کانپور کی ایک مسجد میں لمبی مدت تک سنی بن کر مقیم رہے۔ اور جن امور کو انہوں نے اپنی کتاب میں بدعت لکھا ہے انہیں خود ہی کرتے رہے۔ مولوی سید سلیمان ندوی نے تحریک ندوۃ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا کہ میرے اوائل تک میرٹھ کی بیشتر آبادی معمولات اہل سنت پر کاربند تھی۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ میرٹھ میں امام عیدگاہ کو لے کر جھگڑا کھڑا ہوا، کانگریسی حکومت نے ابوالکلام آزاد کو فیصل مقرر کر دیا۔ مولانا میرٹھ پہونچے، دونوں جماعت

سے گفت وشنید کے بعد فیصلہ دیا کہ میرٹھ میں سنیوں کی اکثریت ہے اور ان کے پاس دیوبندی امام کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کا عذر معقول بھی ہے، لہٰذا امام عیدگاہ بریلوی مکتب فکر کا عالم ہوگا۔

ساٹھ سال کی عمر کا ہر ہوشمند آدمی یہ بتا سکتا ہے۔ چالیس سال قبل تک سنی آبادیوں کا تناسب کیا تھا اور ان پر باطل تحریکوں کی گرفت کس قدر کمزور تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شہر اور گاؤں کی کسی بھی مسجد میں دیوبندی عالم چہرے پر سنیت کا نقاب ڈالے بغیر امام مقرر نہیں ہوسکتا تھا، عوام کو مدرسہ اور مدرسے کی سند سے غرض نہیں تھی، وہ بس عقیدے میں ذرا سی کجی پاتے اور اسے فوراً واپسی کا راستہ بتا دیتے، جس شہر میں دیوبندی امام، میلاد و فاتحہ کی آڑ میں چھپ کر رہتا تھا، آج اس شہر میں نماز جمعہ پڑھنے کے لئے سنی امام کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ نئی نسل بڑی تیزی سے برباد ہو رہی ہے۔ باطل تحریکوں کے وظیفہ خوار، سیم و زر کا دلکش جال لے کر نئے نئے شکار کی تلاش میں ہر طرف دندناتے پھر رہے ہیں۔ آج جو محفوظ ہے، کل تک اس کے بچے رہنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔

ان ناگفتہ بہ حالات کے باوجود، معتقدات اہل سنت کی میزان پر اگر نفری شمار کی جائے تو میرا چیلنج ہے کہ آج بھی صحیح العقیدہ مسلمانوں کی تعداد ہر مسلک کے ماننے والوں سے زیادہ ثابت ہوگی اور وہ دیگر جماعتوں کے اصل چہرے سے آگاہ ہو کر ان کا ساتھ دینے پر ہرگز آمادہ نہیں ہوں گے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم بہتّر کے مقابلے پر اکیلے ہیں۔ ان کے تحفظ کے لئے ہمارے پاس مادی ذرائع و وسائل نہیں ہیں۔ ہم

امراء و حکام کی سرپرستی سے محروم ہیں۔ سرمائے کی کمی کے باعث قوت دفاع ہماری کمزور ہے۔ پروپیگنڈہ اور پبلیسٹی کے میدان میں ہم بہت پیچھے ہیں۔

لیکن آپ ہماری جسارت معاف فرمائیں یہ بھی صدفی صد صحیح ہے کہ ہم میں مقبول عام شخصیتیں بے حس ہیں، ہمارے ذی علم اور ذہین افراد کاہل ہیں۔ ہمارے اکثر خطباء جاہل اور حریص ہیں۔ ہمارے بیشتر سرمایہ دار جماعتی کاز کے لئے کوتاہ دست اور فضول خرچی میں دریادل ہیں۔ اور ہماری عوام بے عملی اور بے راہ روی کی شکار ہے۔ گمراہ جماعتیں اپنی انتھک کوششوں کے سہارے کامیابی کی دہلیز تک پہونچ رہی ہیں تو اس میں بھی ہرگز دورائے نہیں کہ ہماری جماعتی بے حسی اور کاہلی ان کو آگے بڑھنے کا موقع دے رہی ہے۔

قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی قبر پر مولائے قدیر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے۔ ان کا حساس دل جماعت کے غم میں ہمیشہ بے چین رہتا تھا۔ وہ جماعت کے سروں پر منڈلاتے ہوئے خطرات کے بادل کو ہر وقت نظر میں رکھتے تھے اور جماعت کے پاسبانوں کو بیدار رکھنے کی فکر میں ہمہ وقت مضطرب رہتے تھے۔ ماہنامہ جام نور کلکتہ، اکتوبر و نومبر ۱۹۶۸ء کے اداریہ میں جماعت کی زبوں حالی کا ماتم کرتے ہوئے اس طرح رقم طراز ہیں۔

"دوسری وجہ یہ ہے کہ کروڑوں افراد پر مشتمل کسی ملک گیر تنظیم کو چلانے کے لئے جن سیاسی وسائل اور وافر سرمایہ کی ضرورت ہے، وہ ہمارے یہاں مفقود ہے۔ سیاسی وسائل کا مرحلہ تو اس

لئے مشکل ہے کہ یہ میدان ضمیر، دیانت اور مذہبی احساسات کی قربانی کا متقاضی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارا جماعتی مزاج اس طرح کی ایمان سوز قربانی کا قطعاً متحمل نہیں ہے۔ کیونکہ ہم دین کو قربان کر کے دین کی حرمت کا قطعاً کوئی تصور نہیں رکھتے۔

اب رہ گیا سرمایہ کا سوال، تو آج کے دور میں اس کی فراہمی کے دو ہی راستے ہیں۔ پہلا راستہ تو سیاسی منڈیوں کے ہاتھ خود فروشی کا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں قابل فروخت کوئی جنس ہی نہیں ہے۔ جن کے تبادلے میں ہم امریکہ کا ڈالر، یورپ کا پاؤنڈ اور سعودی عرب کا ریال حاصل کرسکیں۔

اب لے دے کے ہمارے لئے صرف عوامی تعاون کا ایک راستہ ہے جو اب تک کھلا ہوا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اب تک ہم اس طرح کی خدمات کے لئے اپنے عوام کا ذہن ہی نہ بنا سکے۔

تیسری وجہ ہمارے علماء کی انتہائی مصروف اور پابہ رکاب زندگی ہے۔ بالکل نسیم سحری کی طرح سبزہ وگل کو چھوتی ہوئی گذر جانے والی اور جوئبار کی طرح مسلسل رواں دواں۔ ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک صوبے سے دوسرے صوبے، ایک ملک سے دوسرے ملک، شرق سے غرب اور جنوب سے شمال، زندگی بھر کا یہ لگا تار سفر، جو جلسہ گاہوں، کانفرنسوں اور اسٹیجوں

کے گرد گھومتا ہے۔ اس جادہ نوردی اور شورالرحیل میں اتنی فرصت کہاں کہ جماعتی زندگی کے مسائل کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں۔ اور اگر ہزار جتن کے بعد لوگ بیٹھے اور غور وفکر کے بعد کوئی منصوبہ بھی بنا تو اب اس کی تکمیل کا مرحلہ کون طے کرے گا۔ قائدین سفر میں ہیں یا تو اسٹیج پر ہیں یا پھر دوسرے سفر کے لئے پر تول رہے ہیں۔ ان حالات میں ہماری لامرکزیت اور جماعتی زبوں حالی کے اسباب کا اندازہ لگانا اب کسی کے لئے بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔

لیکن بہر حال یہ سوال اپنی جگہ پر ہے کہ ان ساری رکاوٹوں اور دشواریوں کے باوجود دستوری سطح کے کسی ملک گیر جماعتی نظام کی تشکیل کا مرحلہ کیا ہمارے لئے قطعاً ناممکن ہے۔ اور کیا ہندوستان جیسے جمہوری اور سیکولر ملک میں کوئی جماعت بھی بغیر تنظیم کے اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی فعال اور متحرک تنظیم کو چلانے کے لئے متعدد قسم کے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ آج ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ لیکن اخلاص، ایثار اور نصرت خداوندی کے بھروسے پر اگر ہمارے علماء اٹھ کھڑے ہوں تو کیا مشکلات کی یہ زنجیریں ٹوٹ نہیں سکتیں۔''

حضرت علامہ ارشد القادری مرحوم آج سے تقریباً پینتیس سال پہلے ذمہ داران جماعت کی جن کمزوریوں کا گلہ کر رہے تھے۔ کیا آج اس میں کئی گنا اضافہ نہیں ہو گیا ہے۔ اس وقت تک علماء میں بہت کچھ جماعت کا درد باقی تھا اور وہ جماعتی زندگی کے لئے کسی حد تک فکرمند بھی رہا کرتے تھے۔ اس کی چند مثالیں آئندہ صفحات پر آرہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت اکابرین کی صف میں متعدد کوہ پیما شخصیتیں جماعت اہل سنت پر سایہ فگن تھیں۔ لیکن آج دال میں نمک کے برابر اخلاص باقی رہ گیا ہے۔ اور انگلیوں پر گنے جانے کی تعداد میں مخلص نظر آتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف اغیار کے لئے ہر روز فتوحات کے نئے نئے دروازے کھل رہے ہیں۔ اور غیر ملکی وظیفہ میں ہر دن اضافہ ہو رہا ہے۔

جس کسی کے سینے میں دردسنیت سے کوئی حصہ موجود ہے وہ اس پر آشوب زمانے میں خطرے کا احساس کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور خطرات کے بادل کو اپنے سروں پہ دیکھ کر اس کی سیف زباں اور نشتر قلم میں حرکت پیدا ہو جانا بھی تقاضائے فطرت ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ دل جلا قلم جب بھی بولے گا تو اس سے تلخ نوائی کے سوا شیریں کلامی کی امید فضول ہے۔ مولانا غلام جابر شمس مصباحی اپنی جماعت کے ایک حساس نوجوان ہیں۔ جماعتی بے حسی کا شکوہ کرتے ہوئے وہ حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے ایک مکتوب کا تراشہ پیش کرتے ہیں۔ ذیل کی سطروں میں درد و کرب میں ڈوبے ہوئے علامہ کے الفاظ پڑھئے۔

''ہماری جماعت میں جو انتشار ہے۔ افراتفری اور اتھل پتھل

ہے۔ چیختے تقاضوں سے گریز ہے۔ قومی مسائل اور ملی ضرورتوں سے چشم پوشی ہے۔ اس سے علامہ کا دل کراہ رہا ہے۔ ان کی آنکھیں سوسو آنسو بہا رہی ہیں۔ کیونکہ جماعتی درد و کرب سے ان کا دل لبریز ہے۔ افتاد طبع کے اعتبار سے وہ حساس واقع ہوئے ہیں۔ احساس مسئولیت رکھتے ہیں۔ وقت کی ایک عظیم ترین شخصیت حضرت علامہ اختر رضا خان ازہری کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔ آپ گہرائی میں اتر کر سوچئے کہ دس بارہ کروڑ افراد کی جماعت، جن لوگوں کی سربراہی میں ملک کے اندر سواد اعظم کی حیثیت رکھتی ہے، اسے باعزت طور پر زندہ رکھنے کے لئے اس جماعت کے سربراہوں پر جلسہ اور پیری مریدی سے آگے بھی کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یا نہیں۔''

اسی مکتوب کے ایک اور اقتباس میں یک گونہ جرأت کے ساتھ یوں رقم طراز ہیں۔

''آدمی تنہا ہوتو ایک ذات کا کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن جن لوگوں کے ساتھ لاکھوں اور کروڑوں کا قافلہ ہو، انہیں اپنے قافلہ کو زندہ رکھنے کے لئے کتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ بات کسی دانشور سے مخفی نہیں ہے لیکن میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ بریلی سے کچھوچھہ تک، جبل پور سے مبارکپور تک اور کلکتہ سے

بمبئی تک اہل سنت کے سارے علماء و مشائخ الا ماشاء اللہ صرف جلسہ و جلوس اور پیری مریدی کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ کوئی بھی اس رخ پر نہیں سوچ رہا ہے کہ ہمارے داخلی اور خارجی مسائل کیا ہیں طاقتور دشمنوں کے بیچ میں ہماری مسجدیں، ہمارے ادارے اور ہماری درسگاہیں کیوں کر محفوظ رہ سکیں گی۔''

(رئیس القلم نمبر دہلی ص ۲۲)

کیا کوئی بھی دردمند عالم یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ حضرت علامہ مرحوم نے حقائق سے ہٹ کر کوئی بات کہی ہو۔ مولائے کریم ان کی قبر پر رحمتوں کے پھول برسائے۔ انہوں نے درد ملت میں ساری زندگی تڑپ تڑپ کر گذاری ہے۔ قوم کے فرزندوں میں زندگی کی نئی لہر پیدا کرنے کے لئے بڑھاپے کی راحتیں قربان کی ہیں۔ بے شک انہیں سب کچھ کہنے کا حق حاصل تھا۔ آپ خوش فہمی کی ان بھول بھلیوں میں نہ رہیں کہ حضرت علامہ نے مسجدوں کے ساتھ ساتھ مدرسوں کا ذکر محض رو میں کر دیا ہے۔ مسجد کا انتظام عوام کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اس لئے مسجدیں تو غیروں کی تحویل میں جا سکتی ہیں۔ مگر اداروں پر علماء کا کنٹرول ہوتا ہے۔ ان پر اغیار کا عمل دخل کیوں کر ہو سکتا ہے۔

میں انگلیوں پر درجنوں ادارے شمار کرا سکتا ہوں کہ ان کی عمارات سنیوں نے بنوائیں تھیں۔ ان کی ساری جائداد و املاک سنیوں کی عطا کردہ ہیں۔ وہ سارے ادارے گورنمنٹ کی تحویل میں چلے گئے اور گورنمنٹ کے ایسے سارے محکمے جو اقلیت

سے تعلق رکھتے ہیں، ان سب پر اغیار کی اجارہ داری ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے، سبھی پر وہی قابض و دخیل ہیں۔ آج ہمارا ایک آدمی بھی اس میں بحال نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر کسی نے ہمت کی بھی تو سینکڑوں اڑچنیں سامنے آئیں اور بے چارے کو خائب و خاسر واپس ہونا پڑا۔ ہم اکثریت میں ہیں کا صرف نعرہ لگانے سے کام نہیں بن سکتا۔ خوش فہمی کی جنت سے ذرا باہر نکل کر دیکھئے کہ ملکی اداروں، سرکاری محکموں اور دانشور طبقوں پر آپ کی کتنی پکڑ ہے۔ ریڈیو اسٹیشن، اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ میں آپ کی کہاں تک رسائی ہے۔

غم لا انتہا، سعی مسلسل، شوق بے پایاں
مقام اپنا سمجھتے ہیں، نہ ہم منزل سمجھتے ہیں

اس مقام پر غالباً یہ حوالہ غیر مفید نہ ہوگا کہ آل انڈیا سنی جمیعۃ العلماء کی تنظیمی کانفرنس میں سید العلماء حضرت مولانا الحافظ سید شاہ آل مصطفےٰ قادری برکاتی مارہروی علیہ الرحمہ نے جو خطبۂ صدارت دیا تھا، اس کا یہ اقتباس ذہن وفکر کو حاضر کرکے پڑھئے اور اپنے کردار وعمل کا گہری توجہ کے ساتھ جائزہ لیجئے۔ اور یہ دیکھنے کی کوشش کیجئے کہ ہم اس وقت کہاں پر کھڑے ہیں۔ نعرے کی جو سترہ قسمیں ہم نے ایجاد کر لی ہیں۔ اس کے سوا بھی ہمارے پاس کچھ ہے۔

"دوستو! جماعتیں فقط نعروں کے سہارے زندہ نہیں رہتیں بلکہ نعروں کے پیچھے کچھ بنیادی اور ٹھوس حقائق ہوتے ہیں۔ اگر آپ ایک زندہ قوم کی حیثیت سے جینا چاہتے ہیں تو وہ اسلوب زندگی

اختیار کیجئے جو ایک زندہ قوم کی نشانی ہے۔ اسباب ووسائل سے منہ موڑ کر جینے کی آرزو کرنا، ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے مترادف ہے۔"

(ماہنامہ جام نور کلکتہ، شمارہ نومبر ۶۸ء)

وہ کیسے لوگ تھے جو نان جویں پر قناعت کر کے زندہ تھے اور دنیا کو زندگی کا سلیقہ بخش رہے تھے۔ اور ایک ہم ہیں کہ شراب مستی لٹا کر قوم کو صرف مدہوش کرنا جانتے ہیں۔ اور اس مدہوشی سے فائدہ اٹھا کر اپنی تن آسانی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ جب آدمی پر خودغرضی کا نشہ چڑھ جاتا ہے تو پھر امتیاز خیر وشر باقی نہیں رہتا۔

چار راستے

قوموں کے اندر زندگی کی حرارت پیدا کرنے، انہیں ہمہ دم بیدار رکھنے اور ان کے سینوں میں درد ملت کی روح پھونکنے کے لئے چار مراکز ہیں۔

(۱) خانقاہ —— (۲) درس گاہ —— (۳) عبادت گاہ —— (۴) جلسہ گاہ ——

ان چاروں کا راستہ مدینہ سے سیدھے ہم تک پہونچتا ہے۔ مسجد نبوی بیک وقت مقدس ترین عبادت گاہ، قابل فخر دینی درس گاہ، رشد و ہدایت کی مرکزی خانقاہ اور امت کی اصلاح اور تربیت کے لئے ایک بہترین جلسہ گاہ تھی۔ ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی مقام پر جلوہ بار ہو کر چاروں مراکز کے جملہ تقاضے پورا فرمایا کرتے تھے۔ اور اصحاب رسول اپنے اپنے ظرف کے مطابق اکتساب فیض کر کے امت کے لئے نمونۂ عمل بنا کرتے تھے۔

دوصدی سے پیشتر تک اسلاف امت کا بھی یہی معمول رہا۔ ولی اللہی درس گاہ ہو یا حضرت چراغ چشت کی خانقاہ، ایک محور سے چاروں مراکز کے تقاضے کماحقہٗ پورے کئے جاتے۔ درس وتدریس کا مشغلہ رہتا، رشد وہدایت کا سلسلہ رہتا، ذکر وفکر کی تعلیم دی جاتی اور دلوں میں عشق رسول کی جوت جگائی جاتی۔ وہاں کے فیض یافتہ افراد عالم وفقیہ بھی ہوتے اور صوفی وزاہد بھی۔ وہ اخلاق وکردار کے دھنی بھی ہوتے اور فکر وشعور کے بحر ناپیدا کنار بھی۔ جب وہ اپنے مرکز سے جدا ہوتے تو جس جگہ جاتے شمع محفل بن جاتے۔ جہاں بیٹھ جاتے پروانوں کی انجمن آباد ہو جاتی۔ دامن جھاڑ دیتے تو فکر وفن کے موتی برسنے لگتے اور اگر قدم آگے بڑھا دیتے تو راستے کی تمام رکاوٹیں خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتیں۔

رفتہ رفتہ حالات بدلے، قوم کے رجحانات میں تبدیلی آئی لوگ الگ الگ راستوں کے جویاں ہوئے۔ وقت کے ان تقاضوں کے پیش نظر، صوفیاء طالبان حق کی آسودگی کے لئے خانقاہ نشین ہو گئے۔ علماء، تشنگان علم کی سیرابی کے لئے مسند آراء درس ہوئے۔ قوم کی اصلاح وہدایت کے لئے ائمہ مساجد نے منبر رسول سنبھال لیا۔ اورعوامی قیادت کی زمام خطباء کے ہاتھوں میں آئی۔ اوران میں سے ہر ایک کمال دیانت اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنے اپنے فرائض منصبی کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔ للّٰہیت، خلوص اور احساس مسئولیت کچھ عرصہ پہلے تک ان کے اعمال کا نگراں اور ان کے فرائض کا محافظ رہا۔ لیکن آیئے اب ہم ہر ایک کا نمبروار جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ اب ان کی کارکردگی کہاں تک درست اور ان کی خدمات کا دائرہ کس

حدتک کامیاب ہے۔ آج اکثر خانقاہیں خواہ مخواہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ بالکل خال خال خانقاہ ایسی ملے گی، جہاں اب تک اسلاف کی روش باقی ہے اور ان کی تعلیمات زندہ ہیں اور وہاں سے خانقاہ کا اصل مشن جاری ہے۔ ورنہ عام خانقاہوں کا حال خود ماتمی ہے، پیری مریدی محض رسماً جاری ہے۔ گدی نشین عقیدہ وعمل میں خود ہی اصلاح طلب ہیں۔ وہ بے چارے امراض دل کا حال کیا جانیں۔ پہلے تو مجھے بہار اور یوپی ہی کے مشائخ کا حال قابل رحم نظر آتا تھا۔ لیکن کرناٹک اور آندھرا پردیش کے وارثین خانقاہ سے سابقہ پڑا تو مجھے بالکل ایسا محسوس ہوا کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی روح کہیں پاس ہی میں کھڑی کہہ رہی ہے ؎

وراثت میں ملی ہے، انہیں پیر کی گدی
زاغوں کے تصرف میں ہیں، عقابوں کے نشیمن

(۲) مشہور اور معیاری درس گاہیں، جہاں آج بھی تعلیمی نظام بہتر ہے۔ طلباء کے لئے سہولتیں مہیا ہیں۔ ان کے پاس اتنی آمدنی نہیں کہ وہ تعلیمی اخراجات پورا کرنے کے بعد جماعتی زندگی کے لئے بھی کچھ کرسکیں۔ کیونکہ ہمارے کسی بھی ادارے کو غیر ملکی امداد حاصل نہیں ہے۔ الجامعۃ الاشرفیہ واحد ادارہ ہے جس نے اشاعتی فنڈ قائم کر کے ماہنامہ اشرفیہ جب سے جاری کیا ہے آج تک اسی نہج پر جاری رکھے ہوا ہے۔ ہمارے یہ ادارے اپنی شناخت قائم رکھے ہوئے ہیں، یہی بہت کافی ہے۔

چھوٹے مدارس جو جگہ جگہ کثرت سے قائم ہیں۔ ان میں غیر ضروری اداروں کی لمبی فہرست ہے۔ جن کا دائرۂ کار، لاؤ، کھاؤ اور کھلاؤ تک محدود ہے۔ یہ

بڑے ادارے کا حق مارنے کے سوا کچھ نہیں کر رہے ہیں۔اب رہ گئے وہ ادارے جو ضرورت کے تحت قائم ہیں۔ان پر بھی ادبار طاری ہے۔کبھی مدرس غائب ہے،تو کبھی طلباء بھاگے جا رہے ہیں اور کبھی مدرسہ کا بجٹ جواب دے چکا ہے۔ مدارس کی بہتات نے عوام کو بے توجہ،طلباء کو خودسر اور ذمہ داروں کو بے غرض بنا دیا ہے۔

معلمین کا حال بھی کچھ نہ پوچھئے! بس کلاس میں بیٹھ کر پڑھا دیا اور ان کی ڈیوٹی ختم، کیونکہ وہ تنخواہ اسی کام کی پاتے ہیں۔ان کا مزاج یہ ہے طلباء کی ذہن سازی میرا کام نہیں،ان کی تربیت پر نظر کرنا میری ذمہ داری نہیں،عوام سے رابطہ کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں،قوم کے اندر مسلکی خوبو پیدا کرنا ہماری ڈیوٹی نہیں اور مسلم نوجوانوں کو جماعت سے قریب کرنے کے لئے ہمارے پاس ٹائم نہیں، جب کہ اوقات درس کے بعد کھانے اور پڑے رہنے کے سوا کوئی کام بھی نہیں ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نائب رسول کی حیثیت سے ملی خدمات کے لئے صرف مہتمم جواب دہ ہوگا۔

(۳) مساجد کے ائمہ کا حال تو اور بھی برا ہے،اساتذہ تو بے چارے کم از کم مدارس کے آئین کے پابند تو ہوتے ہیں،مگر آج کل کے امام تو بالکل ہی بے لگام ہیں اوقات مقررہ پر نماز پڑھا دینے کے بعد حجرہ بند کر کے سونا کام ہے۔دو چار جگہ گھوم گھوم کر ٹیوشن پڑھا دینا یا عورتوں کی بھیڑ لگا کر تعویذ لکھنا،ان کا محبوب مشغلہ ہے۔لوگ تبلیغی نصاب پڑھ رہے ہیں تو پڑھیں،ہم کو فیضان سنت پڑھنے کا موقع نہیں ہے۔حدیث و تفسیر کا وہ درس کیوں دیں، انتظامیہ کی طرف سے اس کا الگ سے معاوضہ مقرر نہیں ہے۔راہ سے بے راہ ہو جانے والے مقتدیوں کی اصلاح سے ان کو غرض نہیں۔ محلے

کے طلباء اور نوجوانوں کی ذہن سازی ان کا مزاج نہیں۔تقاضائے وقت اور حالات حاضرہ کے مطالبے پر جمعہ میں خطاب کرنے کی صلاحیت ہے اور نہ ہی مطلب۔

الا ماشاء اللہ! آج بھی علمی صلاحیت اور فکری قابلیت کے مالک جو ائمہ مساجد ہیں،اگر وہ دردسنت سے لبریز دل بھی رکھتے ہیں تو ان کے پاس قوم کی اصلاح وہدایت کے لئے سب سے مضبوط پلیٹ فارم مساجد کے منبر ہیں۔ جہاں سے انہوں نے قوم کے دلوں کے دریچے کھول دیئے ہیں۔اور انہیں حقائق کے اجالے میں لا کھڑا کیا ہے۔مگر افسوس یہ ہے کہ ایسے ائمہ اب ڈھونڈنے سے ملتے ہیں۔کہیں علم ہے تو اخلاص نہیں۔اور اخلاص ہے تو علم ندارد۔پھر بھی جن مسجدوں کو ایسے امام میسر ہیں، وہاں کی آبادی پر دشمن کی چھاپہ ماری کے سارے حربے ناکام ہیں۔اسی لئے دشمنوں کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ ہمارے پاس یہ پلیٹ فارم رہنے ہی نہ دیں۔اس کے لئے وہ جنگ وجدال اور خون خرابہ تک پر اتر آئے ہیں جس کی ہمارے سامنے بے شمار نظیریں موجود ہیں۔

اور جہاں زور وزبردستی کا موقع نہیں ہوتا وہاں خرید وفروخت کا دھندہ شروع کر دیتے ہیں۔ابھی ۱۰؍مئی ۲۰۱۳ء کو دوبئی سے واپسی پر جناب نسیم الحق اصدقی لیبر کمشنر کی دعوت پر میرا پونے جانا ہوا تو وہاں مولانا تنویر احمد تنویر مبارک پوری سے ملاقات ہوئی۔انہوں نے بتایا کہ میں ایک چھوٹی سی مسجد میں امامت کرتا ہوں جو کافی خستہ حال ہے۔تبلیغی جماعت والوں کی طرف سے بار بار پیش کش ہوئی کہ ہم اس مسجد کی کچھ اراضی بڑھا کر عظیم الشان مسجد بنوا دیں گے۔صرف یہ اگریمنٹ ہونا چاہئے

کہ یہ مسجد جماعت کے تصرف میں رہے گی اور جماعت یہاں ٹھہرا کرے گی۔ امام آپ ہی رہیں گے۔ لیکن الحمدﷲ! ہماری انتظامیہ کمیٹی ایمان وعقیدے کے اس سودا کے لئے آمادہ نہیں ہوئی۔

یہ ابھی سامنے کی ایک مثال ہے۔ ورنہ میرے حافظے میں ایسی درجنوں حکایات ہیں۔ مسجدوں کی خریداری کا یہ دھندا بہت پرانا ہے۔ مسجد میں صرف پڑاؤ مقصود نہیں ہے۔ اس حیلے سے اہل محلّہ کے عقیدے پر نقب زنی مطلوب ہے۔ پھر وہاں نہ مولانا تنویر نظر آئیں گے اور نہ ان کی انتظامیہ۔ اس حربہ کے ذریعہ جس مسجد و مدرسہ کی خریداری میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہاں یہی نتائج دیکھنے میں آئے ہیں۔ رب بے نیاز انہیں غم روزگار سے آزاد فرمائے۔ جنہوں نے ان کے کھنکتے درہم و دینار پر نظر نہ کی اور اپنی بوسیدہ مسجد کی چٹائی کو ہی اپنے رب کی رضا پانے کے لئے کافی سمجھا۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

سیاسی مبصرین اور اخبار نویسوں کی کوتاہ نظری پہ مجھے بے حد افسوس ہے۔ انہیں صرف اتنا ہی دکھائی دیتا ہے کہ فلاں مسجد سے تبلیغی جماعت کو نکال دیا گیا یا فلاں معروف شخصیت کو مسجد میں آنے سے روک دیا گیا۔ مگر انہیں یہ کیوں نظر نہیں آتا کہ تفریق کے اس زمانے میں جب مسجدیں تقسیم ہو چکی ہیں تو پھر دہلی کے فقیر تبلیغ کے نام پر سنی ہی مسجد میں ہلّہ بولنے کیوں آجاتے ہیں اور اس معروف شخصیت کو سنیوں ہی کی مسجد میں اجتماع کی

کیوں سوجھتی ہے۔ کیا ہے کسی میں دم، جو دلیل کی زبان میں یہ ثابت کر سکے کہ اہل سنت نے کبھی بھی جتھا باندھ کر کسی دیوبندی مسجد پر یلغار کیا ہو یا میلاد وسلام کے نام پر ان کی مسجد میں جا کر کبھی کوئی ہنگامہ برپا کیا ہو۔ سچ کہا ہے کسی شاعر حق گو نے ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

(۴) جلسہ ——— تعلیم بالغاں کے لئے بہترین ذریعہ تھا، جو لوگ پڑھنے پڑھانے کی منزل سے گذر چکے ہیں۔ ان کی دینی معلومات کا واحد راستہ تھا۔ اسی لئے مقرر قوم کی اصلاح وہدایت کا تصور لے کر اسٹیج پر کھڑا ہوتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ علماء کی فکر انگیز تقریروں سے کتنوں کے ڈگمگاتے قدموں کو راہ استقامت مل جاتی تھی اور ان کے ایمان افروز بیانات سے وادیٔ ضلالت میں پھرنے والے ہزاروں افراد شاہراہ ہدایت پا جاتے تھے۔ اسی اہم ذمہ داری کے پیش نظر ہر مقرر خود کو اپنے بڑوں کے سامنے جواب دہ باور کرتا تھا۔ چاہے اس کی علمی پایہ گاہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو۔

اس کی ایک چشم دید مثال یہ ہے کہ جون ۱۹۸۰ء میں ہادی ہاشمی ہائی اسکول کے کمپاؤنڈ میں اہل سنت کا عظیم الشان جلسہ تھا۔ جس میں خود میں بھی مدعو تھا، مولانا شاہ مبین الہدیٰ نورانی جلسہ کے روح رواں تھے۔ میری تقریر کے بعد، بحر العلوم مفتی عبدالمنان صاحب اعظمی کی بصیرت افروز تقریر ہو رہی تھی ''اسباب زوال مسلم'' موضوع تھا حضور مفتی اعظم ہند اور حضرت مولانا شاہ سراج الہدیٰ قادری گیاوی علیہم الرحمہ اسٹیج پر رونق افروز تھے۔ علماء اور دانشوروں سے اسٹیج بھرا ہوا تھا۔ مسلمانوں کے

عہد رفتہ کی روشن تاریخ بتاتے ہوئے، حضرت بحر العلوم نے فرمایا ''مگر آج کا بدنصیب مسلمان''، مفتی اعظم نے آواز دی، مفتی صاحب! حضرت مفتی بحر العلوم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حضور مفتی اعظم نے فرمایا ''اسلام و ایمان کی دولت اتنی عظیم ہے کہ اسے پالینے کے بعد کوئی مسلمان بدنصیب نہیں ہوسکتا۔

یہ سن کر بحر العلوم نے فرمایا حضور مفتی اعظم فرما رہے ہیں کہ مسلمان کو بدنصیب نہیں کہنا چاہئے۔ لہٰذا میں اپنا جملہ واپس لیتا ہوں۔ یہاں تک تو مجمع میں یک گونہ سناٹگی رہی، لیکن فوراً ہی بحر العلوم نے بات میں بات پیدا کرتے ہوئے فرمایا، لوگو! آپ خود ہی انصاف کرو، بریلی کا تاجدار جب ایک مسلمان کو بدنصیب کہنے پر راضی نہیں ہے۔ تو بھلا وہ کسی مسلمان کو کافر کیسے کہہ سکتا ہے۔ اس نکتہ آفرینی پر ایسا شور برپا ہوا کہ کان دھرنا مشکل ہوگیا۔ دیر تک نعروں کی گونج میں بحر العلوم کو خاموش رہنا پڑا۔ پھر فرمایا، کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ بریلی والے سارے مسلمانوں کو کافر جانتے ہیں، بس اسی سے آپ اندازہ کرلو کہ ان باتوں میں کتنی صداقت ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ حضرت بحر العلوم کی یہ برمحل سخن سنجی نے بہتوں کے سوچنے کا انداز بدل دیا اسی کو قرآن حکیم نے کہا ہے ''**وجادلهم بالتی هی احسن**''، یعنی بہ طریقۂ احسن لوگوں سے اپنی باتیں منواؤ۔ اکثر دیکھا گیا ہے پھوہڑ انداز کلام لوگوں کی برگشتگی کا سامان بن جاتا ہے۔ یہاں ایک بات اور توجہ طلب ہے۔ وہ یہ کہ حضرت بحر العلوم نے کوئی شرعی غلطی نہیں کی تھی۔ حضور مفتی اعظم نے جو کچھ فرمایا وہ ان کا تقویٰ تھا۔ مگر حضرت بحر العلوم نے اپنے جملے پر قائم رہ کر کوئی دلیل پیش نہیں فرمائی، بلکہ بلاچون وچرا اپنا جملہ واپس لے لیا۔ یہ تھی اہل سنت کے اسٹیج کی شان احتیاط، اور یہ تھا

اپنے بڑوں کا کمال احترام۔ جو ہمیشہ ہماری سرخ روئی کا سامان بنا ہے، رسوائی کا ہرگز نہیں۔ آج بڑوں کی اصلاح کو ہم اپنے کسر شان سمجھنے لگے ہیں۔

کوئی واقعہ، بلا سند و تحقیق درج کتاب کردیا جائے، یہ بات قابل افسوس ہے۔ میں نے بعض ثقہ اہل قلم کی تحریروں میں یہی واقعہ کافی ردوبدل کے ساتھ دیکھا ہے، جو یقیناً عینی شاہد یا کسی راوی سے سنے بغیر لکھا گیا ہے۔ اس دور قحط الرجال میں ایک بڑی بیماری یہ چل پڑی ہے کہ جو بات کسی کرامت کی نہیں ہوتی، اسے کھینچ تان کر باب کرامت میں بیان کرتے ہیں۔ اور جو بات کسی کے کسر شان کی نہیں ہوتی اسے زبردستی ہتک حرمت کا عنوان بناتے ہیں۔ ایسی صورت میں محتاط اہل قلم کو بہت زیادہ چھان پھٹک کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نفس کی شرارتوں سے محفوظ رکھے اور ایک بزرگ کی تعریف کے پردے میں دوسرے بزرگ کی توہین سے بچائے ؎

مقدور ہوتو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تونے وہ گنج ہائے گرا نمایہ کیا کئے

یہی اسٹیج، آج ہر طرح کی لغو بیانی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اسٹیج پر ایسی ایسی بے پر کی باتیں سننے کو ملتی ہیں کہ الامان والحفیظ۔ ہر مقرر اسٹیج پر اس تصور کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے کہ میری واہ واہی کی دھوم مچ جائے اور تمام بولنے والے میرے مقابلے پر پھیکے پڑ جائیں۔ جلسہ کرنے والوں کو بھی پند ونصائح درکار نہیں ہوتے، انہیں تقریروں میں بس مزہ ملنا چاہئے۔ اس کے لئے گویّا، لطیفہ باز، اور چترویدی کے نام پر بکواسی مقرر کی تلاش رہتی ہے۔ دو گھنٹے کی تقریر میں بس ہنسی ٹھٹھا اور قہقہہ بازیوں کے سوا کچھ ملنے کو

نہیں۔یعنی یہ جلسے آج صرف تفریح طبع کا سامان بن کر رہ گئے ہیں۔

ذی علم، محتاط اور ذمہ دار مقررین کم ہوتے جارہے ہیں یا قدر دانی میں کمی آجانے کے سبب سمٹتے جارہے ہیں۔جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شعور مند، دانش ور، ذی ہوش، تعلیم یافتہ اور باوقار افراد کی جلسوں سے دلچسپی تقریباً ختم ہوتی جارہی ہے۔اگر منتظمین جلسہ کے اصرار پر کچھ لوگ پہونچ بھی گئے تو اکتاہٹ محسوس کر کے جلد ہی لوٹ جاتے ہیں۔اب پنڈال میں رہ گئے، رکشے والے، ٹھیلے والے، قلی، کباڑی اور فٹ پاتھ کے باشی، ان ہی کے درمیان کھڑے ہو کر بے سند مقرر دو گھنٹے تک ایران توران کی اڑاتا رہا اور زبردستی نعرے لگواتا رہا۔اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ اسٹیج سے اتر کر کہتا ہے کہ آج تو ہم نے فتح کر لیا۔افسوس! اس سے بڑھ کر بے غیرتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اقلیم دل پر سکہ دوسروں کا چل رہا ہے اور فاتح آنجناب ہیں۔ جماعت کے ان ٹھیکیداروں کے دل سے جماعت کے لئے کچھ کر گذرنے کا جذبہ تو محو ہو ہی چکا تھا اب احساس زیاں بھی جاتا رہا۔خدارا آپ ہی بتائیے کہ اب ہمارے جینے کی راہ کیا ہے۔

قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ، جماعت کے ان سوداگروں کا شکوہ کرتے ہوئے، ماہنامہ جام نور کلکتہ کے شمارہ نومبر ۱۹۶۸ء میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

’’سچ پوچھئے تو اغیار کی بہ نسبت ہمارے لئے جماعتی تنظیم کا کام بہت آسان ہے۔کیونکہ کروڑوں اکائیوں میں ہمارے افراد پہلے سے موجود ہیں، صرف انہیں ایک رشتے میں منسلک کرنا ہے

تنظیم نہ ہونے کے باعث ہم اجتماعی زندگی کے مسائل سے فرار کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔اور اس کے نتیجے میں ہم قوم سے دن بدن دور ہوتے جارہے ہیں۔عوام کے ساتھ ہمارا رشتہ صرف اسٹیج تک رہ گیا ہے۔اور اسٹیج پر بھی ہم دینی رہنما کے بجائے، ایک چرب زباں خطیب، ایک پیشہ ور واعظ اور ایک فنکار مقرر کی حیثیت میں زیادہ نمایاں ہوتے جارہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جو قوم ہمارے اسلاف کے قدموں کے نیچے اپنا دل بچھاتی تھی، آج وہ ہمارے ساتھ ایک فنکار کی طرح سلوک کر رہی ہے۔نہ ہماری اپیلوں کا کوئی بھرم باقی ہے اور نہ ہماری آواز میں کوئی کشش رہ گئی ہے۔‘‘

اللہ غریق رحمت کرے بڑی سچی بات کہی ہے حضرت علامہ نے—— ہماری پکار پر قوم کا لبیک کہنا درکنار، اسٹیشن پہونچا دینے کے بعد اگر ٹرین لیٹ ہو گئی تو دس منٹ ساتھ دینے کو قوم تیار نہیں ہے۔اس لئے کہ لفافہ کھول کر ہم نے رقم چیک کر لی ہے اور اسے مطالبے کے مطابق پا کر ہی جیب میں رکھا ہے۔قوم کا خیال غلط نہیں ہے کہ ہم نے فنکار کی فیس ادا کر دی ہے، اب نیاز مندی کا ہے کی۔اور اس کے پیچھے اپنے وقت کی قربانی کس لئے؟ آپ کو مدعو کرتے وقت نہ اس کے ذہن میں عقیدت کا کوئی تصور تھا نہ رخصت کرتے وقت محبت کا کوئی شائبہ موجود ہے۔اس نے تو مدعو کیا تھا۔ داد سخن کیلئے اور آپ نے بھی دعوت قبول کی تھی محض لذت کام و دہن کیلئے نہ ادھر للّٰہیت

کا کوئی جذبہ تھا اور نہ ادھر خدمت کا کوئی عنصر دامن گیر۔

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں، روشِ بندہ پروری کیا ہے

اسٹیج کے دوسرے مہرہ ہیں شعراء۔ قوم کی بدذوقی سے جنہیں اب اولیت حاصل ہوتی جارہی ہے۔ شعراء اسلام بھی قوم کے اندر بیداری پیدا کرنے میں کبھی عمدہ کردار ادا کرتے تھے مگر اب یہ مہرہ بھی پٹ چکا ہے۔ احساس ذمہ داری تو بہت پہلے دم توڑ چکا تھا، اب ان کی غیرت بھی بالکل مرچکی ہے۔ خاص کر جب سے چھوٹ کا چلن چل پڑا ہے، مائک پر کھڑا ہونے والا ہر نعت خواں سامعین کی جیب پر نظر رکھتا ہے اور کھوج ڈھونڈھ کر ایسا کلام پیش کرتا ہے، جس پر لوگ مچلیں، رقص میں آئیں اور کود کود کر اس تک نوٹ پہونچائیں۔ شاعر تو ہیں نہیں، آواز نے شاعر بنا دیا۔ بے بحر بے لہر، صرف لحن اور راگ پر واہ واہی لوٹ رہے ہیں۔ چاہے غالبؔ اور اقبالؔ کی روح ماتم کر رہی ہو۔ اتنے پر ہی بس نہیں ہے۔ مشہور فلمی گانوں پر تک بندی کر کے اشعار بنا لئے گئے ہیں اور اسلامی اسٹیج پر کھڑے ہو کر اسی لے اور اسی دھن پر گایا جا رہا ہے۔ آوارہ گرد، اوباش، رنگروٹ اور سینما باز نوجوان چمک چمک اور تھرک تھرک کر نوٹ پھینک رہے ہیں اور نوٹوں کی یہ بارش دیکھ کر آنجناب پر مستی طاری ہے۔

ڈوب مرنے کی بات تو یہ ہے کہ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے مولوی حضرات بھی داد و تحسین پیش کر رہے ہیں۔ کون ان سے پوچھے کہ جس پلیٹ میں آپ کے سامنے سور کا گوشت کھایا گیا ہے، صرف دھو کر اسی پلیٹ میں آپ کو بکرے کا گوشت پیش کیا جائے تو

آپ کیوں نہیں کھائیں گے۔ آپ کا وجدان اگر اسے قبول نہیں کرتا تو میرا وجدان بھی ہرگز اس کو قبول نہیں کرسکتا کہ جو طرز آوارگی ذہن کیلئے اپنایا جا چکا ہے، وہی طرز بارگاہِ عالم پناہ میں اظہار عقیدت کیلئے اختیار کیا جائے۔ خاص کر ایسی صورت میں کہ پراگندہ دل نوجوان، معانی اشعار پر نہیں فلمی طرز پر جھوم رہے ہیں۔ ابھی چند دنوں قبل ایک جگہ میں دستار بندی کے جلسہ میں شریک ہوا تھا۔ ایسا ہی ایک شاعر وہاں پہونچا ہوا تھا، اسٹیج پر آکر اس نے اپنا ایک بے بحر کلام سنانا شروع کیا جب عوام کی طرف سے داد و تحسین نہیں ملی تو آج کل کے شاعروں کا نوایجاد ڈھرّہ شروع کر دیا۔ کہو سبحان اللہ! بولو ماشاء اللہ! ایک بار جھوم کر کہہ دو الحمدللہ! جب اس سے بھی کام نہیں چلا تو کہنے لگے افسوس ہے میری آواز پھنسی ہوئی ہے ورنہ میں اپنا رنگ دکھاتا۔ میں نے کہا یہ رنگ دکھانے کا میدان نہیں ہے میرے بھائی! یہ قوم کو اسلامی مزاج دینے کا پلیٹ فارم ہے۔

اگر کچھ سنجیدہ مزاج شاعر یا مدارس کے پڑھے لکھے علم عروض سے واقف نعت گو ہیں تو ان بیچاروں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا اسٹیج پر پہونچ کر اپنا حلیہ تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ عوام کو اشعار کی معنویت سے سروکار نہیں ہے انہیں تو بھڑک دار آواز اور لہر دار انداز چاہئے۔ افسوس اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب خواص بھی کلام کی خوبی پر نظر نہ کر کے آواز کی ساحری میں گم ہو جاتے ہیں۔ یعنی جس طرح باوقار علماء اسٹیج کی اس گراوٹ سے پریشان ہیں۔ اسی طرح قادر الکلام شعراء بھی کلام کی ناقدری سے دکھی دل ہیں۔ بڑی اچھی بات کہی ہے کسی شاعر نے۔

آج خوبی پہ جاتی ہے بھلا کس کی نظر
بازار میں جو چل جائے وہ مال اچھا ہے

میرے یہ تلخ گھونٹ اگر آپ کے حلق کے نیچے نہ اتر سکیں تو آپ مجھے جی بھر کے کوس لیجئے گا بخدا مجھے کچھ ملال نہ ہوگا۔لیکن خدا کیلئے گذشتہ صفحات میں جن لوگوں کا جغرافیہ بیان کیا گیا ہے، آپ ملک کے طول وعرض میں گھوم گھوم کر ہوش وخرد کی آنکھوں سے ان کا جائزہ لیں، پھر آپ کو میری اس تلخ نوائی پر کوئی صدمہ نہ ہوگا۔ جو تصویریں آپ کو دکھائی گئی ہیں اس کے پیچھے کوئی عصبیت کارفرما نہیں ہے اور نہ اس میں معاذ اللہ! نفس بلاخیز کا کوئی دخل ہے۔صرف اور صرف جماعت کی اکھڑتی ہوئی ساکھ کا غم اور افراد جماعت کے بکھرتے ہوئے شیرازے کا درد شامل ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ اگر آپ ان چاروں خانے کا گہری نظر سے سروے کریں گے، تو ہر خانے میں آپ کو صرف پچیس فی صد ہی مخلص، متدین، محنتی اور دردسنیت سے لبریز دل رکھنے والے افراد ملیں گے۔جن کے دم قدم سے آج بھی اقطار ہند میں سنیت کی بہار قائم ہے۔اگر جماعت کے ہر فرد کے دل میں دین کی تڑپ یکساں طور پر راہ پاجائے، اپنے مسلک کی بقاء کیلئے بے لوث قربانیوں کا جذبہ بیدار ہوجائے۔ جماعت کی رگوں میں خون فراہم کرنے کے لئے اپنا خون نذر کر دینے کا حوصلہ جاگ اٹھے۔غیروں کی چنگل سے اپنی قوم کے جیالوں کو نکال لانے کا سرور چڑھ آئے تو باور کیجئے کہ کویتی سکے اور سعودی ریال کو پامال کرنے میں ہمیں کچھ دیر نہیں لگے گی۔اور کسی میدان میں دشمن ہم کو زک نہیں دے سکے گا۔

جماعتی ذوق کا فقدان

انفرادی کام چاہے کتنی ہی معروف اور مقبول عام شخصیت کے ہاتھوں، کیوں

نہ انجام پائے۔وہ اجتماعی کام کا مدِ مقابل نہیں گردانا جاسکتا، کیونکہ انفرادی کام کا دائرہ بہر حال ایک ذات سے جڑے ہوئے افراد کے گرد گھومتا ہے۔جب کہ اجتماعی کام، جماعت سے منسلک تمام لوگوں کو محیط ہوتا ہے۔عین ممکن ہے کہ کسی فرد کو تنظیم کے کسی عہدیدار سے اختلاف ہو۔مگر اس کو تنظیم کے کاز سے بیزاری نہیں ہوسکتی۔کیونکہ اس عہدیدار کا نام تنظیم نہیں ہے۔جبکہ انفرادی کاموں کا معاملہ بالکل برعکس ہے، جس دن سربراہ سے بگاڑ پیدا ہوا آدمی اس کی حمایت سے فوراً دست بردار ہوجاتا ہے۔مگر اسے کم نصیبی ہی کہئے کہ ہمارے یہاں اجتماعی کاموں کا کوئی تصور نہیں ہے۔کوئی کسی کی بالادستی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی فکر میں مگن ہے۔

ہوسکتا ہے، جماعت کی تشکیل کے بعد، تقسیم کار کے دوران، ایک کم دائرہ اثر رکھنے والا شخص، کسی کلیدی عہدے پر مامور ہوجائے اور اس کے بالمقابل زیادہ بااثر شخص منتخب ہونے سے رہ جائے۔ایسی صورت میں جماعتی مفاد کے پیش نظر اس انتخاب کو بہ طیب خاطر قبول کر لینا چاہیے اور یہی کام ہمارے جماعت کے سربراہوں سے نہیں ہوسکتا، نتیجتاً دوسری تنظیم وجود میں آجاتی ہے اور حاصل اسکا صفر نکلتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بار بار متعدد ناموں سے تنظیم بنتی رہی اور وہ ایک ہی ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گئی۔ ہر تنظیم کیلئے سب سے پہلے دستور اساسی مرتب ہونا ضروری ہے۔ اور عہدیداروں کو اسی دستور کے حصار میں رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔تب کہیں تنظیم دیرپا ہوتی ہے اور مؤثر بھی ——لیکن ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے ہر تنظیم کے صدر کا خود اپنا مزاج دستور اساسی ہے، وہ جو طریقۂ کار چاہے اپنائے۔ظاہر ہے پوری قوم ایک

مزاج کے تابع تو نہیں ہوسکتی۔ ہاں! ایک نظام عمل کے تحت ضرور متحد ہوسکتی ہے۔

آپ ہماری جسارت معاف فرمائیں تو میں یہ عرض کروں کہ نومبر ۱۹۸۳ء میں ادارہ شرعیہ پٹنہ میں بہار صوبائی نشست ہوئی تھی، جس میں پوری ریاست سے تقریباً تیس نمائندہ، بہ شمول حضرت مفتی شاہ انیس عالم صاحب، حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب قادری، حضرت مولانا محمود احمد صاحب رفاقتی اور حضرت مولانا محمد شبنم کمالی صاحب شریک ہوئے تھے۔ ادارۂ شرعیہ کے علماء بورڈ کی انتخابی کاروائی چل رہی تھی لیکن مرتب شدہ دستور اساسی سے بالکل پرے ہٹ کر۔ میں نے عرض کیا یہ انتخابی کاروائی، دستور اساسی کی راہ سے ہٹ کر چل رہی ہے۔ حضرت علامہ نے اسے بے جا مداخلت سمجھا اور چیں بہ جبیں ہوکر فرمایا، دستور اساسی منزل من السماء نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا جی ہاں! دستور اساسی میں ترمیم ہوسکتی ہے لیکن اصولاً پہلے دستور اساسی میں ترمیم ضروری ہے بعد میں اس کی روشنی میں انتخابی کاروائی درست ہوگی۔ میری یہ آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی اور انتخابی کاروائی پر جوش نعروں کی گونج میں مکمل ہوگئی۔ نتیجہ جو کچھ بھی سامنے آیا وہ سب کو معلوم ہے، نہ کسی نے خود کو دستوری عہدیدار سمجھا اور نہ کبھی دستور کے حصار میں رہ کر کسی کو خدمت انجام دینے کی توفیق ہوئی۔ اسلئے کہ مزاج و طبیعت کی حکمرانی اور ہے اور دستور وقانون کی بالادستی کچھ اور۔ کسی بھی کل ہند یا صوبائی تنظیم کیلئے ضروری ہے کہ پہلے ایک ضابطہ اور ایک دستور کافی غور وفکر کے بعد مرتب کیا جائے پھر تنظیم کے اغراض ومقاصد اپنے دائرۂ عمل کے اندر متعین کئے جائیں۔ اس کے بعد صوبائی ہے تو اندرون صوبہ سے اور اگر کل ہند ہے تو حدود مملکت سے ایسے افراد منتخب

کئے جائیں جو علمی اور فکری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ تنظیمی مزاج اور جماعتی خدمت کا ذوق بھی رکھتے ہوں۔ پھر تفویض عہدہ کے وقت انہیں باضابطہ آئین ودستور کا پابند بھی بنایا جائے۔ اب یہ آپ کی تنظیم کے لئے بنیادی ستون ثابت ہوں گے۔

دوسری چیز، تنظیم کی افادیت ہے۔ اس کے لئے فرزندان اسلام کے قلوب و اذہان کو تنظیم کے دفعات اور اس کے اغراض ومقاصد سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ ان کے فکر وشعور کو تنظیم کے لئے ہموار کرنا پڑے گا۔ تب کہیں جا کر وہ آپ کا جھنڈا لیکر میدان عمل میں اترینگے۔ اور آپ کی تنظیم صوبائی خدمت کا احاطہ کر سکے گی۔ اور کل ہند تنظیم پورے ملک پر اپنی گرفت مضبوط بنا سکے گی۔ سنی نوجوان صرف آپ کا نام سن کر، بنام سنیت آپ کا جھنڈا ڈھونے کیلئے دوڑ پڑے گا یہ خیال خام ہے۔ اتنا دم خم آپ کے اندر ہے تب تو آپ کی تنظیم کی ساکھ مضبوط رہے گی۔ ورنہ دروازے پر آل انڈیا کا بورڈ لگا کر کمرے میں بیٹھ جایئے۔ کوئی آپ کا بورڈ اتارنے نہیں آئے گا۔ ہماری جتنی بھی آل انڈیا تنظیمیں وجود میں آئیں ان کے دستور اساسی تو ضرور مرتب ہوئے مگر اس پر عمل درآمد نہیں ہوسکا۔ افراد کے انتخاب میں بھی محض شہرت کو اولیت دی گئی۔ تنظیم کے نمائندوں کی ٹیم تو بالکل ہی تیار نہیں کی گئی۔ ورکروں کے بغیر محض شہرت یافتہ افراد کے بل پر تنظیمیں پنپ نہیں سکیں۔ نتیجہ جو سامنے آنا تھا وہ آیا۔ قائدین کے ساتھ ساتھ تنظیمیں بھی موت کی آغوش میں پہونچ گئیں۔

حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ، جو جماعتی زندگی کیلئے تا حیات کوشاں رہے اور اپنی بساط سے بڑھ کر عمل کے میدان میں گھوڑے دوڑاتے رہے۔

اورتن تنہا بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ جماعتی بے حسی کا شکوہ کرتے ہوئے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں جس سے جماعتی قیادت کی نااہلی بالکل نمایاں ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں ہر جگہ اہلسنت و جماعت کی عظیم اکثریت ہے۔اس کا اندازہ ان مذہبی اور روحانی تقریبات سے ہوتا ہے۔ جو یکساں طور پر ہندستان کے سارے طول وعرض میں منائی جاتی ہیں۔ جبکہ اہل سنت کے علاوہ کوئی فرقہ انہیں اپنی مذہبی تقریب قرار نہیں دیتا۔لیکن ہم تعداد کے اعتبار سے اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی اپنے اثر کے لحاظ سے قطعاً اقلیت میں ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اب تک ہم اپنے قرار واقعی وجود کا یقین ہی نہیں دلا سکے ہیں۔ دنیا کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ہمارے یہاں چار متوازی جماعتوں کی تنظیم ہے۔ پھر بھی ہم منظّم نہیں ہیں۔ ہر جماعت کی ناکامی کے بعد ایک نئی جماعت اس امید کے ساتھ وجود میں لائی گئی کہ شاید اس کے ذریعہ ہمارا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے۔ لیکن وہ بھی کچھ دنوں کے بعد اپنے پیش روؤں سے جا ملی۔

اس خطرناک اور نتائج آزمودہ اقدام کیلئے میں ہرگز رائے نہیں دوں گا کہ اپنے جماعتی مسائل سے نپٹنے کیلئے اب کوئی پانچویں جماعت بنائی جائے۔آج کی صحبت میں صرف اپنی

ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے یہاں کچھ ایسی چیزوں کا ضرور فقدان ہے جو کسی بھی جماعتی تنظیم کے لئے ناگزیر ہے۔مثال کے طور پر ہم ملک میں ذہنی اعتبار سے کارکنوں کا کوئی دستہ تیار کئے بغیر کل ہند سطح پر اپنی جماعتوں کے پروگرام کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں صرف مذہبی اعتقاد کی یک جہتی کسی بھی دستوری جماعت کا بوجھ اٹھانے کے لئے کافی ہے۔ حالانکہ مذہبی خیالات کی یگانگت اور کسی تنظیمی جماعت کے اغراض سے اتفاق ، دونوں میں نہایت واضح فرق ہے۔کسی بھی جماعت تنظیم کو بروئے کار لانے کیلئے جب تک افراد کے درمیان نظام جماعت کے ساتھ ذہنی ارتباط، جذباتی لگن، والہانہ آمدگی، باطنی اخلاص اور قربانیوں کی سچی تڑپ موجود نہ ہو،عوامی سطح پر کسی مضبوط قیادت کی نمود اور بکھرے ہوئے شیرازوں کی یکجائی ناممکن ہے۔

(جام نور کلکتہ، مارچ ۱۹۶۷)

۴۶ سال قبل حضرت علامہ مرحوم نے جن چار تنظیموں کا ذکر اپنی تحریر میں فرمایا ہے۔میرے علم کے مطابق وہ چار تنظیمیں یہ ہیں۔

۱۔کل ہند جماعت رضائے مصطفےٰ (بریلی شریف) اس کے صدر برہان ملت حضرت مولانا مفتی برہان الحق صاحب جبل پوری علیہ الرحمہ اور جزل سیکریٹری

ریحان ملت حضرت مولانا ریحان رضا خان صاحب بریلوی علیہ الرحمہ تھے۔

۲-آل انڈیا سنی جمیعۃ العلماء (ممبئی) اس کے بانی وصدر سید العلماء حضرت مولانا سید شاہ آل مصطفٰے صاحب برکاتی مارہروی علیہ الرحمہ اور جزل سیکریٹری خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد صاحب نظامی علیہ الرحمہ تھے۔

۳-آل انڈیا تبلیغ سیرت (الہ آباد) اس کے بانی وصدر مجاہد ملت حضرت مولانا شاہ محمد حبیب الرحمٰن صاحب دھام نگری علیہ الرحمہ اور جزل سیکریٹری شمش العلماء حضرت مولانا محمد نظام الدین صاحب الہ آبادی علیہ الرحمہ تھے۔

۴-آل انڈیا مسلم متحدہ محاذ (کوٹہ راجستھان) اس کے بانی وصدر قائد ملت حضرت سید شاہ اسرار الحق صاحب شاہجہاں پوری علیہ الرحمہ اور جزل سیکریٹری مجاہد دوراں حضرت مولانا سید مظفر حسین صاحب کچھوچھوی علیہ الرحمہ تھے۔

کل ہند جماعت رضائے مصطفٰے غالبًا اہلسنت کی سب سے پہلی تنظیم تھی، لیکن میرے عہد طالب علمی تک اس کی سرگرمی ماند پڑ چکی تھی۔ اور وہ بالکل سرد خانے میں چلی گئی تھی۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت، مسلمانان ہند کی منزل بہ منزل رہنمائی کر رہی تھی، جس کے پاداش میں حضور مجاہد ملت کو سلاخوں کے پیچھے بھی جانا پڑا تھا۔ آل انڈیا مسلم متحدہ محاذ پر سیاسی رنگ غالب تھا اور یہ اپنے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے حقوق اور ان کے مسائل کے حل کا مطالبہ لگاتار کر رہی تھی چونکہ ایوان حکومت تک اس کے قائدین کی پہنچ بھی تھی۔ لیکن ان میں سے کسی کا بھی دائرہ کار ہندوستان گیر نہیں تھا۔

اس کی دو بنیادی وجہ تھی۔ ایک یہ کہ کسی بھی تنظیم نے ملک گیر پیمانے پر

کارکنوں کی کوئی ٹیم نہیں تیار کی تھی۔ جو اس کے پروگرام کے تحت سرگرم عمل نظر آتی۔ اور اہل زمانہ سے اپنے وجود کا لوہا منواتی اور ذرائع ابلاغ کے سہارے دنیا میں اپنی کارگزاریاں پھیلاتی —— دوسری وجہ یہ کہ ملک کی ہر ریاست یا کم از کم بیشتر صوبوں سے تنظیم کے عہدیدار اور نمائندے منتخب نہیں کئے گئے تھے۔ جو اپنی اپنی ریاست میں تنظیم کے کاز سے لوگوں کو متعارف کرا سکتے اور ان کے ذہنوں کو تنظیم کی رفاقت کے لئے ہموار کر سکتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تنظیم چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی۔ اور کاغذ پر کل ہند اور آل انڈیا لکھی جاتی رہی۔ اور بعد میں انجام کار یہ ہوا کہ ؂

یہ بزم مئے ہے یہاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

وقتی مطالبہ سے غفلت

ہماری ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ جب حالات اور وقت کے تقاضے ہمارے موافق ہو جاتے ہیں اور بڑے سے بڑا کام نہایت آسانی سے کر گزرنے کا موقع ہاتھ آ جاتا ہے تو ہم سست روی اور سرد مہری کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اور وقت سے فائدہ اٹھانے کا یہ قیمتی چانس کھو کر کف افسوس ملتے ہیں۔ اسی وقت اگر ہم اپنی رفتار تھوڑی تیز کر لیتے اور مالی و بدنی قربانی کے لئے خود کو آمادہ کر لیتے تو ایسا عظیم الشان کام انجام کو پہونچ جاتا جس کے اثرات صدیوں باقی رہتے۔ مثال کے طور پر میرے عہد طالب علمی میں غالبًا ۱۹۶۲ء کا زمانہ رہا ہوگا۔ مسلمانوں کے ملی مسائل کے

حل کے لئے آل انڈیا سنی جمیعۃ العلماء بمبئی کے جھنڈے کے نیچے کانپور میں ایک عہد ساز کانفرنس، حضرت مولانا محبوب اشرفی علیہ الرحمہ کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ مبارکپور، جونپور، بنارس، بھدوہی اور الہ آباد وغیرہ اضلاع سے سینکڑوں بسیں پہونچی تھیں۔ دور دراز شہروں سے ٹرینوں کے ڈبے ریزرو کئے گئے تھے۔ اس عظیم الشان اجلاس کی پورے ملک میں دھمک محسوس کی گئی تھی۔

کانپور کے اجلاس کے قبل و بعد اسی زمانے میں آل انڈیا مسلم متحدہ محاذ کے جھنڈے کے نیچے دہلی میں ایک تاریخ ساز سنی اوقاف کانفرنس، مولانا امداد صابری مرحوم کی مدد سے منعقد ہوئی تھی۔ یہ مہتم بالشان اجلاس اجمیر شریف کے عرس کے موقع سے دہلی جامع مسجد میں ہوا تھا۔ اس لئے ملک بھر کے لاکھوں افراد شریک اجلاس ہوئے تھے۔ یہ اجلاس پورے ملک میں سنی اوقاف پر وہابیوں کی اجارہ داری کے خلاف ایک طرح کا اعلان جنگ تھا۔ یہ دونوں کانفرنسیں اپنے اپنے مقاصد کے اعتبار سے مثالی کامیاب رہی تھیں۔ ان کے اثرات پورے ملک میں محسوس کئے گئے تھے۔ غیروں میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ مخالفین سراسیمگی کے عالم میں تھے۔ سواد اعظم اہل سنت کی اجتماعی قوت کا حکومت وقت کو بھی خوب خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ خاص کر سنی اوقاف کانفرنس کے زلزلہ بردوش دھماکے نے دیوبندیوں میں ہیجان برپا کر دیا تھا۔ اور ان کی تمام جماعتوں میں اتھل پتھل کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس لئے کہ حکومت پر یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ خانقاہوں، درگاہوں، تاریخی مسجدوں اور قدیم

اداروں کے اصل وارث سواد اعظم اہل سنت ہیں۔ لہٰذا تمام سنی اوقاف کا نظام ہمارے ہاتھوں میں آنا چاہئے۔ درگاہی نظام اور خانقاہی رسوم کے جو لوگ دشمن ہیں انہیں سنی اوقاف کا کلید بردار بنا دینا، حکومت کی سراسر لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ اور حکومت ہند نے ان اوقاف پر اہل سنت کو بتدریج قبضہ دلانے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔

لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ کانفرنسوں کے اثرات سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے لئے جس طرح کی مثبت کاروائی کی ضرورت پڑتی ہے اور مقصد کا حصول، جیسی مشغولیت وانہماک کا تقاضہ کرتا ہے۔ اسی سے ہماری جماعت کوسوں دور ہے۔ ہماری سیمابی کیفیت ہمیں ایک راہ پر سبک روی سے چلنے نہیں دیتی۔ برسوں کی محنت اور لگاتار کوشش کے بعد اغیار جس منزل تک پہونچ پاتے ہیں ہم منٹوں اور سکنڈوں میں وہاں پہونچ جانا چاہتے ہیں۔ اگر ذرا سی دیر ہوئی یا کوئی معمولی اڑچن بھی سامنے آئی تو ہم فوراً اپنا رخ بدل دینے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ اگر ہمارے بڑے اپنی جدوجہد جاری رکھتے اور راستے کی تمام رکاوٹوں کو پامردی کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کرتے تو بلاشبہ آج سنی اوقاف کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اور ایوان حکومت میں ہمارا غلغلہ بھی ضرور سنائی دیتا۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۴ء تک میں جامعہ شرفیہ عماد پور رفیع گنج میں تھا۔ ان دنوں مدرسہ میں شیر محمد نامی ایک شخص آیا جایا کرتے تھے۔ اکثر وہ مودودی صاحب کی کوئی نہ کوئی کتاب بلا طلب لا کر دیا کرتے تھے اور ان کی کوشش رہتی تھی کہ ہم مودودی صاحب کی دعوت سے متأثر ہوں۔ مودودی صاحب کی کوئی

کتاب تو مجھے متاثر نہ کرسکی لیکن میں شیر محمد کے ایک عمل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ شخص محلّہ عماد پور کی چھوٹی مسجد میں ہر اتوار کو بعد نماز مغرب مودودی صاحب کی تفسیر بالرائے ''تفہیم القرآن'' کا درس اپنے دو رفیق کو ساتھ لے کر دیا کرتا تھا۔ انیس برسوں میں کوئی چوتھا ہم درس نہ بنا سکا۔ تین کے تین ہی رہے۔ لیکن تعریف ہے اس شخص کی کھانا ناغہ ہو جاتا مگر درس موت کے بعد ہی ناغہ ہوا۔ اور ایک ہماری مسجد کے امام صاحب ہیں ہزار جتن کے بعد مسجد میں دینی مسائل کا درس شروع کیا۔ اور دس دنوں بعد بند کر دیا۔ جب کسی نے پوچھا امام صاحب درس کیوں بند کر دیا۔ تو جواب ملا کہ درس شروع ہوا تو دس آدمی تھے اور آج بھی دس ہی آدمی ہیں۔ تو ایسے بد ذوقوں کے درمیان درس دینے کا کیا حاصل۔ یہ افسانہ نہیں ہے میرے بھائی! حقیقت ہے۔ اور سینکڑوں جگہ کا میرا ذاتی مشاہدہ ہے۔ یہ شعر کبھی ہمارے حسب حال تھا اب دوسروں کے عزائم کا عکاس ہے ۔

ہزار بار نتائج سے ہو کے بے پروا
اسی کا نام لیا، جس کا نام لینا تھا

اکیلے کی راہ

اکیلے کی راہ بہت کٹھن ہے اور راستے کی کٹھنائیوں کی صورتیں مختلف ہیں پھر بھی ہماری جماعت کے افراد اکیلے ہی اکیلے کام کر رہے ہیں اور ان کی انفرادی خدمات بڑی حد تک قابل اعتماد اور لائق تحسین ہیں۔ صاحبان خانقاہ ہوں یا اہل مدارس، مساجد کے ائمہ ہوں یا اسٹیج کے خطباء ان میں جو مخلص ہیں وہ اپنے اپنے

دائرۂ عمل میں رہ کر لائق تقلید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مولائے قدیر بکرم حبیبہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کوششوں کو بار آور فرمائے۔ اور ان کے دم قدم سے دین وسنیت کی بہار قائم ودائم رکھے۔

اس راہ کی دو رکاوٹیں، مشاہداتی ہیں جن سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اولاً یہ کہ جن کے پاس سرمایہ ہے یا جن کی ایک آواز پر زرکثیر جمع ہوسکتا ہے وہ کچھ کرنا نہیں چاہتے —— وہ عالم ہوں یا پیر، اپنے کار و بنگلہ میں مگن ہیں۔ اور عیش و نشاط ان کے پیروں کی بیڑی بنی ہوئی ہے۔ اب رہے وہ لوگ جو کچھ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو ان بے چاروں کے پاس سرمایہ نہیں ہے۔ ثانیاً یہ کہ ہمارے سرمایہ داروں کے پاس دلوں کے درد کو ناپنے کا آلہ نہیں ہے۔ وہ تن وتوش، اونچا نام، لمبی ٹوپی اور چرب زبانی پر مدہوش ہو کر اپنی تجوری خالی کر ڈالتے ہیں۔ اور جب دربدر کی خاک چھانتا ہوا کوئی بیمار غم، ان کی چوکھٹ پر، دین کا درد لے کر پہونچتا ہے تو اسے بڑی صاف گوئی سے آگے کا راستہ بتا دیتے ہیں۔ وہ بیچارے کیا جانیں کہ اس گدڑی میں لعل ہے اور اس کمخاب میں سنگ خارا۔

''زر ندارم، جامہ از کجا آرم'' کے دلدل میں پھنسا ہوا دردمند عالم، ہزار جانفشانیوں کے باوجود سالوں میں وہ کام نہیں کر پاتا جو مہینوں میں ہونا چاہئے تھا۔ ایسے موقعوں پر بار بار میرا دل زخمی ہوا ہے۔ جب ایسے ادارے میرے معائنہ میں آئے ہیں جن کی پورے علاقے کو سخت ضرورت ہے مگر وہ مدتوں سے

ایک ہی حالت میں پڑے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے پاس ترقی کے ذرائع و وسائل نہیں ہیں۔ ایسا بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے بے سروساماں اداروں پر غیروں کی عقابی نظر رہتی ہے اور ایسے افراد جن کی مسلکی گہرائی و گیرائی تک رسائی نہیں ہے، انہیں کھنکتے سکے دکھلا کر ادارے کو خریدنے کی تدبیر کی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے اسے آپ ایک کہانی سمجھیں مگر میرے مشاہدات اس کے گواہ ہیں کہ بہت سے مقامات پر ان کی یہ کوششیں بارآور ہوگئیں ہیں۔

اپنے محاسبۂ عمل میں یہ بات بھی اولین توجہ کی مستحق ہے کہ انفرادی کاموں میں جو جذبۂ معاونت ہمارے بڑوں میں تھا اس کا عشر عشیر بھی ہم میں باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ہم نے بہت قریب سے انہیں ایک دوسرے کے کاموں میں جس طرح ہاتھ بٹاتے ہوئے دیکھا ہے۔ آج ہم اپنے میدان عمل میں اپنے ساتھیوں سے اس طرح کے تعاون کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اس کی انتہائی سبق آموز مثال جس کو سن کر مجھے سخت تعجب ہوا تھا۔

۱۹۷۹ء میں جمشید پور ہندو مسلم فساد کی پاداش میں علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ گرفتار کر لئے گئے۔ ان دنوں میں ادارہ شرعیہ پٹنہ میں بحیثیت مہتمم کار گزار تھا۔ فیض العلوم سے فون آیا کہ علامہ کی گرفتاری کے بعد فیض العلوم میں کوئی بھاری بھرکم شخصیت موجود نہیں ہے۔ جس وجہ کر شہر پر سراسیمگی طاری ہے۔ آپ فوراً جمشید پور آجایئے۔ میں نے جمشید پور پہونچ کر حضرت علامہ سے ساکچی

جیل میں ملاقات کی۔ انہوں نے فرمایا اچھا ہوا آپ آگئے۔ آج کل جمشید پور میں روزانہ نیتاؤں کی آمد ورفت جاری ہے اور جو آتا ہے وہ فیض العلوم ضرور جاتا ہے۔ آپ کی موجودگی سے لوگوں کو تقویت رہے گی۔

دو دنوں کے بعد، قائد ملت حضرت مولانا سید شاہ اسرار الحق ایم پی اور مجاہد دوراں حضرت مولانا سید مظفر حسین ایم پی بھی وہاں پہونچ گئے اور تین دنوں تک دونوں نے فیض العلوم میں قیام فرمایا۔ ان ہی دنوں مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی ایک دن فرمانے لگے کہ فیض العلوم کی اس پر شکوہ عمارت کی تعمیر میں میری قربانی بھی شامل ہے۔ ارشد القادری نے مجھے خط لکھا کہ بڑی کوششوں کے بعد ٹاٹا کمپنی نے مدرسہ کے لئے زمین الاٹ کر دی ہے اور میں نے جشن سنگ بنیاد کی تاریخ کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ ابھی طلباء تو ہیں نہیں جو میرے کاموں میں مددگار بنیں، کافی مشکلات کا سامنا ہے۔ میں نے جواب دیا، گھبراؤ نہیں میں ایک ہفتہ قبل پہونچ رہا ہوں۔ جب میں جمشید پور پہونچا تو پوسٹر چھپ کر آچکا تھا۔ مگر اس کو چسپاں کرنے والے ورکر نہیں تھے۔ ہم نے کہا چلو یہ کام بھی ہم ہی دونوں مل کر کر لیتے ہیں۔ اس زمانے میں جمشید پور اتنا مصروف شہر نہیں تھا۔ ۱۰ بجے رات میں ہم دونوں ایک سائیکل لے کر شہر میں نکلتے تھے۔ علامہ ارشد پوسٹر اور گوند کا ڈبہ لے کر آگے بیٹھ جاتے اور میں سائیکل چلاتا۔ اس طرح دو تین راتوں میں پوسٹر پورے شہر میں چسپاں ہوگیا اور کوئی جان نہ پایا کہ پوسٹر کس نے

چسپاں کیا۔ پھر ہنس کر یہ لطیفہ سنایا کہ یہ نیا شہر اور میں راستے سے واقف نہیں، ایک رات میرا بیلنس بگڑ گیا اور سائیکل ایک بڑے نالے میں پھسل کر جا گری۔ نیچے علامہ ارشدان کے اوپر سائیکل اور اس کے اوپر ہم۔ کسی طرح اس میں سے نکلے اور بھاگ کر قیام گاہ پر پہونچے۔

سبحان اللہ! آج ہم ایک دینی ادارے کے قیام کے لئے ایسی صعوبتوں کو گوارا کر سکتے ہیں۔ اور ہمارا کوئی ساتھی محض دوستانہ میں ایسی بے مثال قربانی پیش کر سکتا ہے۔ بہار صوبائی سنی کانفرنس سیوان منعقدہ مئی ١٩٦٨ء میں حضرت مظفر میاں مرحوم کو میں نے دو بجے شب میں اپنے ہاتھوں سے کھونٹے گاڑتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ ہمارے بڑے جو کر گذرے ہیں وہ ہم سے نہیں ہوسکے گا۔ اس لئے کہ ہماری ملی حرارت نقطۂ انجماد پر پہونچ چکی ہے۔

☆☆☆

ہمارے چند معروضات

خانقاہ کے مسند نشینوں سے خطاب

حضور والا! کبھی کبھی آپ اپنے مریدوں کی جھرمٹ سے نکل کر باہر کے حالات پر بھی نظر ڈالئے۔ اور عقیدت مندوں کے عزیز واقرباء کی روش بھی معلوم کیجئے۔ باپ آپ کی دہلیز پر جبیں سائی کر رہا ہے اور بیٹا دوسروں کا بقچہ ڈھوتا پھر رہا ہے۔ جس گاؤں میں کل تک لوگ آپ کے سامنے پرے باندھے کھڑے رہتے تھے، آج وہاں کی آدھی آبادی چلت پھرت کا دھندہ شروع کر چکی ہے۔ وابستگان سے وابستہ لوگوں کو راہ حق کی طرف لگائے رکھنا، آپ کی منصبی ذمہ داری ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ کے مریدوں کے لڑکے بدعقیدہ اداروں میں پڑھ رہے ہیں۔ مولوی بننے کے بعد اگر وہ آپ کا منہ نہیں چڑائیں گے تو کم از کم آپ کا اثر توڑنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ میں نے ایسے بدنصیب پیروں کو بہت دیکھا ہے کہ مریدوں کے لڑکے کو دیوبند اور ندوہ جانے کا مشورہ دیدیا اور جب وہ وہاں سے آنے کے بعد ان ہی کو انگوٹھے دکھانے لگا تو کف افسوس مل رہے ہیں کہ ہائے ہائے! یہ تو میری راہ کا روڑہ بن گیا۔ بند کمرے میں بیٹھ کر گنڈہ وتعویذ لکھنے سے دنیا کا حال معلوم نہیں ہوسکتا۔ صدیاں گذر جانے کے بعد اگر آج بھی آپ کی مسند آباد ہے تو اپنے بعد بھی آباد رکھنے کی سبیل پیدا کرنا آپ کی موروثی

ذمہ داری ہے۔جس کے لئے آپ کو اپنے اسلاف کے حضور جواب دہ ہونا پڑے گا۔مریدوں کی اولاد تو درکنار،اب تو اپنے ہی بچوں پر گرفت ڈھیلی ہوتی جارہی ہے۔میں نے بہت سے پیروں کے لڑکوں کو مغرب زدہ ہی نہیں تو ہب زدہ بھی پایا ہے۔جب پیرزادوں ہی کی روش بگڑ جائے گی تو مریدزادوں کی ڈگر کی نگرانی کیوں کر ممکن ہے۔موروثی علم سے صرف نظر کر کے اپنے بچوں کو اسکول و کالج میں پڑھانے کا شوق ہے تو کم از کم یہ بھی دیکھئے کہ کون کیا پڑھ رہا ہے۔جو آپ کر رہے ہیں اس سے آپ کا فرزند مطمئن بھی ہے یا محض دل پر جبر کر کے آپ کے سامنے بیٹھ گیا ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنی تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

مدارس کے اساتذہ سے خطاب

میرے محترم! طلباء جو آپ کے زیر درس ہیں،انہیں اسلاف کی روش کا سچا نمونہ بنانا،آپ کی ذمہ داری ہے۔آپ اگر منطق وفلسفہ کی گتھیاں سلجھا سکتے ہیں،اقوال فقہاء میں قول راجح پر بحث کر سکتے ہیں،حدیثوں کا تعارض دور کرنے کے لئے دلائل کا انبار لگا سکتے ہیں تو بلاشبہ ان طلباء کی ذہنی تربیت بھی کر سکتے ہیں۔ان کے اندر حرکت وعمل کی قوت پیدا کرنا بھی آپ کے لئے ممکن ہے۔جماعتی درد

اور حق کی پاسداری کا جذبہ بھی ان کے اندر جگا سکتے ہیں۔اور اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ یہ طلباء کا آپ کے اوپر حق ہے۔

ان طلباء میں سب آپ کی طرح درسگاہی نہیں ہوں گے۔ان میں خطباء ومقررین بھی ہوں گے۔ان میں قلم کار اور صحافی بھی ہوں گے۔ان میں ادارہ کے مہتمم اور مساجد کے ائمہ بھی ہوں گے۔اور ان میں بلند بام خانقاہوں کے سجادہ نشین بھی ہوں گے۔آپ ان کا جیسا ظرف تیار کریں گے،میدان عمل میں اترنے کے بعد ان سے ویسا ہی کارنامہ ظہور پذیر ہوگا۔آج مولوی بننے کے بعد جو لوگ سوداگری کا دھندہ کر رہے ہیں اور ہفتہ میں ایک بار مسجد کا منہ دیکھتے ہیں۔ان کی کوتاہیوں میں آپ کی کمزوری بھی شامل ہے یا نہیں۔

آپ کلاس میں بیٹھ کر گھنٹی کے مطابق صرف پڑھا لینا کافی سمجھیں گے۔طلباء کی چال چلن پر تنبیہی نظر نہیں رکھیں گے،ان کی کوتاہیوں پر گرفت نہیں فرمائیں گے،انہیں للٰہیت،خلوص اور خدا ترسی کے اسباق نہیں پڑھائیں گے تو پھر وہ بازاری فکر لے کر گھر سے نکلیں گے اور دین فروشی کا دھندہ شروع کر دیں گے۔جس کا عملی نمونہ مسجد،مدرسہ،اسٹیج اور خانقاہ ہر جگہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔مولائے قدیر و کارساز ہمیں دین وسنیت کی سچی خدمت کا جذبۂ صادق مرحمت فرمائے۔

☆☆☆

ائمہ مساجد سے خطاب

گرامی وقار! مقررین کسی شہر یا کسی گاؤں میں سالوں کے بعد بلائے جاتے ہیں اور آپ بن بلائے ہر وقت موجود ہیں، مقررین آخری ٹرین سے پہونچتے ہیں اور پہلی بس سے واپس ہو جاتے ہیں۔ انہیں آبادی کا حال نہیں معلوم، وہ لوگوں کے مزاج سے آشنا نہیں، ان کو اپنے اور بیگانے کی پہچان نہیں۔ آپ کو اپنی آبادی کا جغرافیہ معلوم ہے، آپ کو اپنے اور پرائے سب پہچانتے ہیں۔ آپ کے پاس دوست اور دشمن کے شناخت کی کسوٹی موجود ہے۔

مسجدیں اپنی آواز قوم کے کانوں تک پہونچانے کے لئے بہترین پلٹ فارم ہیں۔ اور یہ پلیٹ فارم آپ کے قبضے میں ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اس کا فائدہ اٹھا کر قوم کے فرزندوں کی جو اصلاح و تربیت کر سکتے ہیں وہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ فجر، عصر وغیرہ مناسب وقتوں میں درس کا سلسلہ جاری فرمائیں، اپنی نجی مجلسوں میں گپ شپ کے بجائے ہمیشہ ذہن ساز گفتگو کریں۔ باذوق اور تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنے مسلک سے روشناس کرانے والی کتابیں پڑھوائیں اور سنوائیں تو میرا دعویٰ ہے کہ انقلاب کی حد تک ان کے رجحانات کا پانسہ پلٹ سکتے ہیں۔

میں خود یہ کام پہلے کر کے بعد میں آپ کو مشورہ دے رہا ہوں۔
۶۹-۱۹۶۸ء میں مدرسہ عزیزیہ پنجراواں ضلع جہان آباد میں تھا۔ مسجد کا منبر میرے

قبضے میں تھا۔ میں نے ان ہی تین کاموں کے ذریعہ اپنے ہم عمر جوانوں سے لے کر ان کے باپ، داداؤں تک کی زندگی کا رخ بدل دیا تھا۔ علاقہ بھر کے دیابنہ میرے کارناموں پر حیرت زدہ تھے۔ اب تک وہاں کے لوگ مجھے بھولے نہیں۔ ہاں! یہ کام آپ اسی وقت کر سکتے ہیں، جب آپ کے سینے میں جماعت کا کچھ درد بھی ہوگا۔ اسلئے کہ مسجد کی انتظامیہ ان خدمتوں کا آپ کو کوئی معاوضہ نہیں دے گی۔

☆☆☆

خطباء و مقررین سے خطاب

جناب من! میں بھی اسٹیج کی دنیا سے الگ نہیں ہوں اس لئے آپ میری باتوں کا برا نہ مانئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اگر زبان و بیان کی قوت بخشی ہے تو اسے شکم پروری تک محدود نہ رکھئے۔ جذبۂ مسابقت سے پرہیز کیجئے۔ اور شہرت اور ناموری سے بالاتر ہو کر اپنے جماعتی مشن کو آگے بڑھایئے۔ موقع مصلحت کو دیکھ کر سنجیدہ اور مؤثر گفتگو کی کوشش کیجئے۔ نعروں کے چکر میں پڑ کر عوام کو ذہنی عیاشی میں مبتلا کرنے سے گریز کیجئے۔ علم کلام کے ذریعہ مردہ دلوں میں احساس کی چنگاری پیدا کی جا سکتی ہے۔

میری آنکھوں سے اس وقت خون کے آنسو ٹپک پڑے جب ایک کثیر آبادی والے گاؤں کے لوگوں نے مجھے یہ غمناک خبر سنائی کہ ایک دیوبندی

مولوی کی زہر میں بجھی ہوئی تقریر اور جماعت والوں کی مسلسل یلغار سے میرے گاؤں کا اتحاد غارت ہوگیا۔ جب دفاعی اقدام کی غرض سے ہم لوگوں نے اپنے مقررین وشعراء سے رابطہ قائم کیا تو ان کی طرف سے ایسے مطالبات سامنے آئے جنہیں ہم پورا نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ مالدار لوگ پہلے ہی ہم سے کٹ چکے تھے اور بیچ بیچ میں رہنے والوں کو جوابی کاروائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم تھوڑے لوگ جو کمر بستہ ہوئے تھے۔ان کا جوش، مقررین کے حاصلہ شکن جواب سے سرد پڑ گیا۔اور اب ہم چند گھروں میں سمٹ کر رہ گئے ہیں۔

ایسے نازک حالات اور سنگین موقعوں پر بھی گاؤں والوں کے علاوہ کیا ہماری کوئی جماعتی ذمہ داری نہیں ہے۔ ہمیں ہر حال میں بھرپور معاوضہ ہی چاہئے۔ کمانے کی تو بہت سی راہیں تھیں۔ دین کے نام پر آخر سودابازی کی کیا ضرورت ہے۔ کبھی اس نہج پر سوچنے کی کوشش کیا کیجئے کہ اسی طرح ہماری آبادی اگر ہمارے ہاتھوں سے نکلتی رہی تو پھر آپ کے قیمتی سودوں کا خریدار کون ہوگا۔

غالباً ١٩٧٦ء میں حضور امین شریعت مولانا شاہ رفاقت حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ احمد آباد سے بذریعہ ہوائی جہاز پٹنہ تشریف لائے اور سیدھے ادارۂ شرعیہ پہونچے۔ میں نے اچانک تشریف آوری کا سبب پوچھا تو فرمانے لگے میرے علاقے میں ایک جلسہ ہے۔ لوگوں نے اصرار کر کے وعدہ کرا لیا تھا۔ احمد

آباد سے ہوائی جہاز کا کرایہ دینا تو ان بے چاروں کے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر حسب وعدہ میرا پہونچنا ضروری تھا۔ دین وسنیت کے لئے تو تھوڑی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ پھر اپنے علاقے کی بھی بات تھی اس کے بعد فرمایا کہ اکیلے جانا ذرا دشوار معلوم ہو رہا ہے۔ آپ اگر فرصت میں ہوں اور میری وجہ سے کوئی زحمت نہ ہو تو ساتھ چل چلیں۔ میں نے عرض کیا زہے نصیب! میں ضرور ساتھ چلوں گا۔

دوسری صبح کو میں حضرت کی معیت میں چل پڑا۔ حضرت کے دولت کدہ سے چند کیلو میٹر کے فاصلہ پر یہ جلسہ تھا۔ جب ہم لوگ موضع مور نصف پہونچے جہاں سے قریب ہی جلسہ تھا، تو دو چار پائی لگائی گئی۔ ایک اونچی اور بڑی حضرت کے لئے، دوسری چھوٹی اور نیچی میرے لئے۔ حضرت نے یہ دیکھ کر فرمایا یہ کیا، اسی سائز کی بڑی چارپائی لاؤ اور جب تک میرے لئے متوازی بڑی چارپائی نہیں لائی گئی، اپنی چارپائی پر تشریف رکھنے کے بجائے کھڑے رہے۔ چارپائی آگئی تو مجھے بیٹھا کر، خود بیٹھے۔ آہ! ایسی خردہ نوازی اب تصور میں بھی نہیں آسکتی۔

اس کے بعد مولانا مطیع الرحمٰن صاحب مظفر پوری کو بلا کر فرمایا کہ یہ سید صاحب ادارۂ شرعیہ کے مہتمم اور کامیاب مقرر ہیں۔ اور لوگوں کے بعد ان کی تقریر ہوگی۔ اس کے بعد میں بولوں گا۔ صبح کو واپسی کے وقت جب منتظمین جلسہ نذرانے کا لفافہ لے کر حاضر ہوئے تو ان کے ہاتھوں سے میرا لفافہ بھی خود ہی

لے لیا۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے بعد میرا لفافہ کھول کر دیکھا پھر اپنے لفافے سے رقم نکال کر اس میں اضافہ فرمایا۔ اس کے بعد اپنے ہاتھوں سے مجھے عنایت کیا گیا۔ میں بت بنا، چشم حیرت سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ زبان سے بولنے کا کچھ یارا نہ تھا۔ آج ستائیس برسوں کے بعد یہ واقعہ رقم کر رہا ہوں تو دل کانپ رہا ہے، آنکھیں پرنم ہیں اور قلم کی سیاہی کہہ رہی ہے ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

ہوائی جہاز کا کرایہ تو طلب کرنا درکنار، یہ بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی کہ کس طرح یہاں پہونچا ہوں۔ اور میرے سفر پر کتنے اخراجات پڑے ہیں۔ اس پر طرفہ تماشا یہ کہ جو حقیر سی رقم لفافہ میں اراکین جلسہ کی طرف سے پیش کی گئی اس میں سے بھی کمی کر دی۔ حالانکہ آپ کی نظر میں اگر رقم میرے لفافہ میں کم تھی تو مجلس انتظامیہ سے کہہ کر بھی اس میں اضافہ کرا سکتے تھے۔ جبکہ قطعاً اس کی بھی ضرورت نہ تھی۔ میں تو حضرت کو پہونچانے کے ہی ارادے سے گیا تھا۔ اگر مدعو ہو کر بھی جاتا تو لفافہ کی کمی بیشی پر میری نظر نہ کبھی رہی اور نہ انشاء اللہ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ اسلاف کی سی للٰہیت ہمیں عطا فرمائے اور دین وسنیت کی خدمت کے لئے دلوں کے دروازے کھول دے۔

☆☆☆

اہلسنت کے سرمایہ داروں سے خطاب

بندہ پرور! اپنی کمائی میں آپ اللہ اور اس کے رسول کا بھی اگر کچھ حصہ سمجھتے ہیں تو از راہ کرم اس کا محل استعمال بھی جاننے کی کوشش کیجئے۔ دوسری جماعتوں کے اہل دول اپنی رقمیں مسلکی اشاعت اور اپنے جماعتی مشن پر خرچ کر رہے ہیں۔ ان تک اگر ہمارا آدمی پہونچ جاتا ہے تو قیل وقال کر کے ٹال جاتے ہیں۔ اور اگر تعلقاتی لوگ پہونچ جاتے ہیں تو ایک حقیر سی رقم دے کر ٹرخا دیتے ہیں۔ خود مجھے اس کا ذاتی طور پر بار بار تجربہ ہو چکا ہے۔ اور آپ کا حال یہ ہے کہ اپنے اور بیگانے کی تمیز کئے بغیر دونوں ہاتھوں سے لٹا رہے ہیں۔ قرآن حکیم کا حکم ہے **تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان** نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں مدد پہونچاؤ، گناہ اور سرکشی کے راستوں میں مددگار نہ بنو۔

آنے والا لمبا چوڑا تعمیراتی منصوبہ لے کر آیا ہے تو صرف نقشہ اور اسٹمٹ ہی نہ دیکھئے۔ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس کارخانے میں مال کیا تیار ہوگا۔ اگر وہ شخص سواد اعظم اہل سنت سے عناد رکھتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ ظالم ہماری مدد سے ہماری ہی جڑ کھودنے کی سازش رچا رہا ہے۔ یہ اپنے ادارہ سے ایسے افراد پیدا کرنا چاہتا ہے جو کل مراسم اہل سنت کے خلاف، حربہ وہتھیار لے کر صف آراء ہوسکیں۔ اس نزاکت پر ہمارے جو سرمایہ دار نظر نہیں رکھتے ہیں ان

سے بڑی بڑی رقمیں لوٹ کر یہ لے جاتے ہیں اور اپنا مورچہ مضبوط کر لیتے ہیں۔

اگر کھاتا بہی لے کر آنے والا صحیح العقیدہ سنی ہے تو یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ یہ دین وسنت کے لئے کچھ کر بھی رہے ہیں یا محض اپنا ایک کاروبار کھڑا کر لیا ہے کیونکہ اس دور کساد میں شکم پروری کے لئے کسی بھی راہ کو اختیار کرنے سے لوگوں کو گریز نہیں ہے۔ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ فرضی ادارہ کے نام سے سارے کھاتے تیار کر لئے گئے ہیں اور ملک بھر میں گھوم گھوم کر پیٹ کا ایندھن جمع کیا جا رہا ہے۔ یہ کتنا بڑا ستم ہے کہ ایک ادارہ اپنی دینی وملی خدمات کی بنیاد پر پورے ملک میں جانا پہچانا جا رہا ہے۔قومی ترقی کے اس کے قیمتی منصوبے ادھورے پڑے ہیں اور آپ کی ساری توجہات غیر ضروری اداروں کی طرف ہیں اس سے دین کا ناقابل تلافی نقصان ہو رہا ہے۔

ہماری جماعت کو صرف درگاہوں، مزاروں اور باباؤں کی چوکھٹوں سے دلچسپی ہے۔ دیگ چڑھا رہے ہیں، لنگر لٹا رہے ہیں، گنبد و مینار بنوا رہے ہیں۔ جو بے چارہ سڑک کے کنارے ایک پلیٹ میں کتے کے ساتھ کھاتا تھا اس کی قبر کو جنت نشان بنانے کے لئے موزائک اور ٹائلس لگوا رہے ہیں۔ ان سے اگر مدرسہ اور مسجد کی تعمیر کے نام پر کچھ طلب کر لیجئے تو پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں۔ اور جان چھڑانے کے لئے بہتّر حیلے تلاش کرتے ہیں۔

ہمارے کچھ دولت مندوں کو جلسہ وجلوس اور واہ واہی سے بڑا شغف ہے۔ ایک شب کے جلسہ کے لئے ہزار روپے بڑے شوق سے دے دیں گے۔ جلسہ گاہ میں آنے کے بعد اسٹیج کے سامنے کرسی بچھا کر بیٹھ جانا اور سو سو روپے کا نوٹ شاعر کو چھوٹ دینا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ہاں اسی اسٹیج پر رکھے ہوئے کسی دینی رسالے کے لئے زر سالانہ سو روپے کا مطالبہ کر دیجئے، تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان پر کوئی پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ کیونکہ اسے وہ بالکل غیر ضروری اور مدزائد گمان کرتے ہیں۔

قومیں چادر وگاگر سے نہیں، حرکت وعمل سے زندہ رہتی ہیں۔ مسلک کا تحفظ گنبد و مینار سے نہیں، مساجد ومدارس کے ذریعہ ممکن ہے۔ خانقاہوں کا مشن درگاہوں کی آرائش سے نہیں، کتب ورسائل کے بل بوتے پر جاری رکھا جا سکتا ہے۔ آپ وہ سب بھی کیجئے مگر اس کو سب کچھ نہ سمجھ لیجئے۔ جو کام ہمارے لئے بیخ وبن کی حیثیت رکھتے ہیں ان سے صرف نظر کرنا، اپنی ہلاکت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ پہلے تو ہمیں اپنے جینے کی تدبیر کرنا ہے، تب کہیں زندگی کے خوش گوار تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ دین وشریعت کی کھیتی ہری رکھنا، ہماری پہلی ذمہ داری ہے۔

اے گردش زمانہ کبھی رائیگاں نہ کرنا
ہیں بہت لطیف و نازک، غم دل کی وارداتیں

☆☆☆

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم بسم اللہ الرحمن الرحیم

سونا جنگل، رات اندھیری، چھائی بدلی کالی ہے
سونے والو جاگتے رہیو، چوروں کی رکھوالی ہے
آنکھ سے کاجل صاف چرالیں، یاں وہ چور بلا کے ہیں
تیری گٹھری تاکی ہے، اور تونے نیند نکالی ہے

حضرت رضا بریلوی

خطرات کے بادل

حصہ دوم

گیارہ فکر انگیز مقالات پر مشتمل جن کی سطر سطر حالات اور تقاضے سے غافل جوانوں کو مہمیز کرتی ہے

از قلم

سید رکن الدین اصدق چشتی

سعودی عرب میں

ملازمت کرنے والے جوانوں کے نام

اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں مکلّف مخلوق جن وانس ہیں۔جیسا کہ **وما خلقت الجن الانس الا لیعبدون ہ** کی آیت کریمہ سے ظاہر ہے۔پھر نوع انس دوقوموں میں تقسیم ہوئی۔قوم عرب،قوم عجم۔قوم عجم،شوکت وسطوت،تہذیب و تمدن اور ملک رانی و جہاں بانی میں اگر چہ مشہور ہے بایں ہمہ قوم عرب کو ان پر تین وجوہ سے برتری حاصل ہوئی جس کا اعتراف عالمی تاریخ دانوں کو بھی ہے۔

(۱) عرب نہایت غیور اور شجاع قوم ہے (۲) نہایت فیاض اور مہمان نواز قوم ہے (۳) زبان و بیان کے اعتبار سے سب سے برتر قوم ہے۔اس قوم کے یہ فطری خواص تھے جو بیان ہوئے۔ان کے علاوہ دیگر تین دینی خوبیاں بھی انہیں اقوام عالم سے ممتاز کرتی ہیں۔اولاً یہ کہ پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم قوم عرب میں پیدا ہوئے۔ثانیاً یہ کہ رسول عربی پر کلام الٰہی زبان عربی میں نازل ہوا۔ثالثاً یہ کہ ہر شخص کی زبان جنت میں عربی ہی ہوگی۔

خواجہ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رنگ ونسل کے تعصب سے امت مرحومہ کو دور رہنے کی ہمیشہ ہدایت وتاکید فرمائی ہے۔بالخصوص عربوں سے ان کی قومیت کی بناء پر نفرت کرنے سے ممانعت کے یہی تین اسباب بیان فرماتے ہیں ”**احب العرب لثلث** “لوگو! عربوں سے ان کے تین خصوص کی بناء پر محبت کرو۔”**لانی عربی** “اس لئے کہ تمہارا نبی قوم عرب سے ہے ”**و کلام اللہ عربی** “اور حق تعالیٰ کا کلام عربی

زبان میں ہے ”**و کلام اهل الجنة عربی** “اور جنتیوں کی زبان بھی عربی ہوگی یعنی اگر فضل الٰہی سے تم بھی حقدار جنت ہوئے تو تمہاری زبان بھی عربی ہوگی۔

خاتم پیغمبراں صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد حرم کعبہ کے سامنے جو تقریر فرمائی اور حج الوداع کے موقع پر میدان عرفات میں جو آخری خطبہ دیا،اس سے ظاہر ہے کہ اسلام نے ملک وقوم اور رنگ ونسل کے جھگڑوں کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا ہے۔صحیح بخاری باب حجۃ الوداع میں خطبہ نبوی کے یہ الفاظ موجود ہیں۔”**الا کل شئی من امر الجاهلية تحت قدمی موضوع** “لوگو! جاہلیت کی ہر ایک بات میں اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد آپ یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ بر بنائے قومیت اور زبان عربوں سے نفرت کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ان کے عقائد فاسدہ اور خیالات باطلہ سے بھی اجتناب نہیں کیا جائیگا۔یا ان کے قبیح افعال اور ناقص کردار بھی تمام عالم کے مسلمانوں کے لئے قابل عمل قرار پائیں گے۔خواجہ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ شیطان اس بات سے مایوس ہوگیا ہے کہ اب وہ بلاد عرب میں کبھی پوجا جائے گا۔اس کے معنی بس اس قدر ہیں کہ دیار عرب میں بتوں کی پوجا اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی اور ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ بلاد عرب میں بتوں کے پرستار نہ آج ہیں،اور نہ کبھی ہوں گے۔لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ عربوں میں گمراہی اور بے دینی کبھی نہیں آئے گی۔

اگر منشائے حدیث یہی ہوتا تو قرون اولیٰ اور عہد صحابہ ہی میں روافض،خوارج اور

سبائی فرقہ کا وجود نہ ہوتا۔قتل عثمان سے لے کرقتل حسین تک بے دینوں کی جو قطار نظر آتی ہے اور جن کے نامبارک وجود کے سبب اسلام کا دامن تقدس داغدار ہوا، یہ دیکھنے میں نہ آتے۔

عربوں میں گمرہی -حدیث کذاب کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس میں خطۂ ارضی کا کوئی تعین نہیں ہے۔**سیکون فی آخر الزمان دجالون کذابون** یعنی آخر زمانے میں جھوٹے دجال پیدا ہوں گے۔وہ کہیں بھی پیدا ہو سکتے ہیں لیکن حدیث ذوالخویسرہ اور حدیث فتن تو زمین عرب کی تعیین کرتی ہے۔اور یہ باور کراتی ہے کہ بلا شبہ یہ فتنے عرب کے ذریعہ زمین عرب میں برپا ہوں گے۔ مشہور روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے۔خویسرہ نامی ایک شخص مجلس سے اٹھا اورنہایت بے باکی سے بول پڑا،**اعدل یا محمد**"اے محمد!انصاف سے تقسیم کرو۔اس جسارت بے جا پر سرکار دو عالم ﷺ نے ناگواری کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کرفرمایا۔برا ہو تیرا،اگر میں انصاف نہ کروں گا تو دوسرا کون ہے جو انصاف کر سکے گا۔عمر فاروق، جو مجلس میں موجود تھے تلوار بے نیام کر کے عرض کیا، یارسول اللہ!حکم ہو تو اس گستاخ کی گردن ماردوں۔آپ نے فرمایا،اسے چھوڑ دو۔اس کی نسل سے ایک جماعت پیدا ہوگی جو میری محبت لوگوں کے دلوں سے دور کرے گی۔

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔اولاً یہ کہ اگر شخص مذکور غیر مہذب اعرابی ہوتا اور بارگاہ نبوی میں گفتگو کے ادب سے نابلد ہوتا اور اپنا حصہ کم گمان کر کے اضافے کی نیت سے کچھ عرض کرتا تو کم از کم "اعدل یا رسول اللہ" ضرور کہتا۔مگر سرکار کا نام پاک لے کر پکارنا صاف بتا رہا ہے کہ سینے میں نفاق پوشیدہ تھا۔اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

پر اس کا جملہ گراں خاطر گذرا۔اور آپ نے اسے آداب گفتگو کی تعلیم نہ فرمائی۔

ثانیاً یہ کہ جب خواجۂ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ شخص مذکور کی نسل سے ایک بے دین جماعت پیدا ہوگی تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اجازت دے کر اس کا صفایا کیوں نہ کرا دیا۔جواب یہ ہے کہ نوشتۂ تقدیر پر حکم شریعت نافذ نہیں ہوتا۔اور مشیت یزدانی میں نبی ہوں یا ولی، دخل انداز نہیں ہوتے۔بلکہ راضی برضا اور صابر بہ قضا رہنا تصوف کی اصل روح ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور نظر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر روز ولادت ہی دے دی گئی تھی مگر آپ مشیت رب پر راضی رہے اور حضرت امام کے لئے مصائب کربلا سے نجات کی دعا نہ کر کے بس اسی قدر دعا فرمائی" **اللھم اعط الحسین صبرا و اجرا** "

حدیث فتن میں ہے کہ سرکار کی مجلس نور میں شام و یمن کے صحابہ موجود تھے اور خواجۂ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان سبھوں کے لئے خیر و برکت کی دعائیں کر رہے تھے۔ اس موقع پر مجلس میں نجد کے کچھ صحابہ بھی تشریف رکھتے تھے۔انہوں نے درخواست کی کہ نجد کے لئے بھی دعا کی جائے۔حضور نے اعراض فرمایا۔جب دعا کے لئے ان کا بار بار اصرار ہوا تو غیب داں پیغمبر نے فتنوں کی ان الفاظ میں نشاندہی فرمائی۔"**ھناک الزلازل والفتن و بھا یطلع قرن الشیطان** "یعنی وہاں سے زلزلے اور فتنے اٹھیں گے اور وہیں سے شیطان کی سینگ ظاہر ہوگی۔جمہور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ درعیہ نجد سے شیطان کی سینگ بن کر محمد بن عبدالوہاب نجدی ظاہر ہوا۔اور اسی ظالم نے سلطنت عثمانیہ کے باغی قبیلے کے سردار محمد بن سعود سے سانٹھ گانٹھ کر کے اس کی طاغوتی

فوج کی مدد سے حجاز مقدس کو پامال کیا۔اور حجاز ویمن کا نام مٹا کر" **المملكة السعودية**" اس کا نام رکھ دیا۔اور یہی خطہ بنام" **الرياض** " آج تک اس کا پایۂ تخت بنا ہوا ہے۔

بدقسمتی سے آج یہی آل سعود اور آل شیخ (**محمد بن عبدالوہاب کا خاندان**) مقامات مقدسہ پر قابض ہے۔جو عقیدہ کے اعتبار سے غالی قسم کے غیر مقلد وہابی ہیں ۔جنہوں نے اپنے بدبودار عقیدے کو عالم اسلام کے سر تھوپ دینے کے لئے اپنے خزانے کا دہانہ کھول رکھا ہے۔بدعقیدگی کی آلائش پھیلانے کے لئے جو تیل کی دولت صرف ہو رہی ہے اس کی یہ تین صورتیں ہیں

(الف) باطل نظریات پر مشتمل کتابوں کی اشاعت۔اور ہندو پاک کے ایجنٹوں کے ذریعہ ہزاروں کی تعداد میں ان کی مفت تقسیم۔

(ب) زرخرید مبلغین کا اہم مقامات پر تقرر۔جن کا کام سادہ لوح مسلمانوں کی ذہن سازی کر کے یعنی ان کا ذہن پراگندہ کر کے ان کو اپنے عقیدے کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔

(ج) گمراہ اور گمراہ گر مقررین کی زہر آلود تقریروں کا کیسٹ تیار کر کے نہایت چابکدستی سے اسے گھر گھر مفت پہونچانے کا انتظام۔

صحیح العقیدہ مسلمانوں کو اپنے دام میں لانے کے لئے جو تین طرح کے جال بنے گئے ہیں ان کے استعمال کے لئے دو قیمتی مواقع ان ظالموں کو از خود میسر آجاتے ہیں۔

ایک موقع حج ہے۔جب پوری دنیا سے مسلمان حرمین شریفین کی طرف بہ ارادۂ حج و زیارت سمٹتے ہیں۔تو انہیں اپنے عقیدے کے جال میں پھانسنے کے لئے ان

کی کارروائی تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔حجاج میں بیشتر جہّال ہوتے ہیں۔خاص کر ہندو پاک کے حاجیوں کا حال تو اور بھی برا ہے۔کوئلہ کان سے ریٹائرڈ ہوئے،پیسہ ڈھیر سا ملا تو حج کو نکل پڑے۔دو نمبر کے دھندے میں جم کر کمائی ہوئی تو پکنک کی سوجھی۔اس کے لئے سب سے حسین راستہ حج کا دکھائی دیا۔بس بلا تاخیر نکل کھڑے ہوئے۔

ایسے لوگ وہاں کے ضلالت بردوش مبلغین کو غیبی فرشتہ سمجھتے ہیں۔وہاں تقسیم ہونے والی ایمان شکن کتابوں کو صحیفۂ آسمانی تصور کرتے ہیں اور وہاں سے دستیاب شدہ زہر میں بجھے ہوئے کیسٹ کو وحی الٰہی کی دوسری قسم گمان کرتے ہیں ۔وطن لوٹنے کے بعد ہی سے پرچار شروع ہو جاتا ہے کہ وہاں ہم نے یہ نہیں دیکھا،وہ نہیں دیکھا۔وہاں ہم کو ایسا بتایا گیا،ویسا بتایا گیا۔یہ کتابیں پڑھو۔کیسٹ میں بھری ہوئی یہ تقریر سنو۔ایسے ناکندہ تراش لوگ جنہوں نے نہ دین کو جانا نہ دین کے تقاضوں کو سمجھا زندگی بس دنیا کمانے میں گذاری۔حج میں جا کر گمراہ ہوئے اور اب کنبہ،قبیلہ اور اہل خاندان کی گمرہی کا سبب بن رہے ہیں۔

دوسرا موقع وہ ہے،جب ہندو پاک کے ضرورتمند نوجوان بغرض ملازمت عرب امارت کی دھرتی پر بوجھ بن کر اترتے ہیں۔دو دن کی مہلت دیئے بغیر ان کے پیچھے چنڈال چوکڑیوں کی ٹولی چھوڑ دی جاتی ہے۔جو اپنی فریب کمپنی کا ہر مال ان تک پہونچاتی ہے۔اور اس کی تعریف کا راگ الاپ کر انہیں مدہوش کرنے میں کوشاں رہتی ہے۔دو ماہ میں نہ سہی تو دو سال میں ضرور انہیں اپنے شیشے میں اتار لیتی ہے۔اس لئے کہ یہ نوجوان عقائد اہل سنت اور باطل نظریات کا کوئی مطالعہ نہیں رکھتے اور ان کی اپنی کوئی ٹھوس فکر نہیں ہوتی۔ان میں

اکثر ماحول کے بندھن میں رہ کر وہ سب کچھ کرتے ہیں جو انہیں کرنا چاہئے۔ایسے ہی طلباء اور نوجوان غیروں کی جھرمٹ میں پہونچ کر اپنی ڈگر بھول جاتے ہیں ۔ہندو پاک کی سرحدوں میں پھیلے ہوئے تبلیغی لٹیرے بھی ایسے ہی طلباء اور نوجوانوں کو راستے سے اٹھا لے جاتے ہیں اور پھر ان سے اپنی بُقچہ برداری کا کام لیتے ہیں۔

آج عالم اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے یورپ و امریکہ کے خطرناک اقدامات کا جو عالمی منظر نامہ ہمارے سامنے ہے اس سے کہیں زیادہ خطرناک عزائم سواد اعظم اہل سنت کے خلاف حکومت سعودیہ رکھتی ہے۔وہ ہر ذہن میں وہابیت کا زہر گھول دینا چاہتی ہے۔ہر نوجوان کو تارک سنت دیکھنا پسند کرتی ہے۔ہر مسلمان کو مسلک احناف کا دشمن بنا دینے کے درپے ہے۔جب روح ایمانی ہی ہمارے سینے سے نکل جائے گی تو عبداللہ اور عبدالرحمٰن نام والے جسم کو امریکہ رکھے یا مار ڈالے، فرق کیا پڑتا ہے۔

ذیل کی سطروں میں حضرت بدرؔ اورنگ آبادی کی یہ تحریر چشم خوں ناب سے پڑھئے ۔جس نے اس مضمون کے لکھنے پر ہمیں آمادہ کیا۔موصوف کی یہ تحریر جام شہود شمارہ اپریل تا جون ۲۰۰۶ء تأثرات کے کالم میں شائع ہو چکی ہے۔تحریر فرماتے ہیں۔

''اور محترم! اب تو ہر گھر میں یہ ''نجدی نقوش'' بڑی آسانی سے درآمد ہو رہے ہیں۔سعودی عرب میں ملازمت کے سلسلے میں ہمارے جو نوجوان ہیں، وہ جب چھٹیوں پر آتے ہیں تو ان کے ذہن بالکل بدلے ہوئے ملتے ہیں۔وہ نیاز و فاتحہ، میلاد النبی، بزرگان دین کے مزارات پر حاضری اور ایصال ثواب کے لئے

چہلم و چہارم وغیرہ کی بڑے جارحانہ انداز میں مخالفت کرتے ہیں اور جواب بس ایک ہی ہے کہ عرب میں ایسا نہیں ہوتا۔

کتابوں کے حوالہ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کیجئے تو وہ برجستہ ہی سوال کر دیں گے کہ کیا عرب کے لوگ مسلمان نہیں ہیں؟ اس سیلاب کو روکنے کے لئے ہم کیا کر رہے ہیں یہ نوجوان ایک اور مزیدار بات سناتے ہیں کہ عرب کی مسجدوں میں تو نماز فرض کے بعد کوئی نہیں رہتا۔میں نے اسے کچھ نوجوانوں سے جب کہا کہ لوگ گھر جا کر سنت پڑھتے ہونگے تو یہ بات ان کے پلّے نہیں پڑی۔اللہ رحم کرے''۔

اب آپ حضرت بدرؔ اورنگ آبادی کی تحریر کے تناظر میں ایک طویل بحث گہری توجہ کے ساتھ پڑھنے کے لئے تیار ہو جائیے۔لیکن اس سے پہلے میں عرب امارت کے پروردہ نوجوانوں سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ قرآن کریم کے تیس پاروں میں کوئی ایسی بھی آیت ہے جو مسلمانان عالم کو عربوں کی اہل حرمین ہی کی پیروی کی ہدایت دیتی ہو یا صحاح کی کئی ہزار حدیثوں میں کوئی ایسی حدیث موجود ہے جو دنیا بھر کے مسلمانوں پر متولیان حرم کی تقلید کو واجب قرار دیتی ہو یا کم از کم عربوں کے معتقدات و معمولات کو مسلمانوں کے لئے نمونہ ہی بتاتی ہو۔اگر بطور سند ایسی کوئی آیت و حدیث پیش نہیں کی جاسکتی تو پھر یہ اصرار کیوں ہے کہ عرب میں کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔اور جو عرب میں ہوتا ہے وہی ہونا چاہئے۔

مطاع العٰلمین :مسلمان دنیا کے کسی بھی خطہ سے تعلق رکھتا ہو،قرآن کے بعد رسول کی سنت اس کے لئے واجب العمل ہے۔یہی فرمان رب ہے اور یہی مدار نجات ہے۔**من یطع الرسول فقد اطا ع الله** کہہ کر قرآن نے اس خیال کو رب کی رضا کی سند بخش دیا ہے۔**لقد کان لکم فی رسو ل الله اسوة حسنة** کا بزبان قرآن اعلانیہ جاری فرما کر طریقۂ نبوی کی مخالفت کرنے والوں کے منہ پر قفل ڈال دیا۔

سلطان المحققین حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحیٰ منیری رضی اللہ عنہ مکتوبات دوصدی مکتوب ۱۰۲ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اے بھائی! باوجود اس کے کہ لا الٰہ الا اللہ حقیقت ہے اور محمد الرسول اللہ شریعت ہے۔کیا کہتے ہو اگر کوئی شخص ایک ہزار سال تک لا الٰہ الا اللہ کہتا رہے اور محمد الرسول اللہ قصداً نہ کہے تو کیا وہ مسلمان ہے؟ ہرگز نہیں، اس کا ایمان درست نہیں۔اگر ایسا ہوتا تو یہودی ونصرانی بھی مسلمان ہوتے۔اس لئے کہ یہ لوگ بھی لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں اور محمد الرسول اللہ نہیں کہتے۔جس طرح بغیر رسول اللہ کا اقرار کئے ایمان نہیں ہوتا اسی طرح حضور کی شریعت کے بغیر دین واسلام نہیں ہوتا۔

جب تک علم وعقل باقی ہے۔شرع کی ذمہ داریاں بھی باقی ہیں۔مشائخ اور علماء رضوان اللہ اجمعین کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ اس کا جو منکر ہے وہ دین اسلام سے خارج ہے۔(صفحہ ۳۰۴)"

حیرت ہے کہ ان آیات کے ہوتے ہوئے خود کو اہل قرآن کہنے والا فرقہ رسول

کی پیروی کا کھلا انکاری ہے اور احادیث نبویہ کو یکسر نا قابل عمل قرار دیتا ہے۔دوسری طرف خود کو اہل حدیث گردانںے والے لوگ سنن ونوافل کے کھلے عام تارک ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ فرائض پنجگانہ ہمارے لئے بہت ہیں۔جو نمازیں رسول نے پڑھی ہیں وہ ہمارے لئے کچھ ضروری نہیں۔اس لئے نوجوانوں کا کہنا صحیح ہے کہ عرب میں فرض نمازوں کے بعد مسجدیں خالی ہو جاتی ہیں۔یہ بدر صاحب کی خوش فہمی تھی جو انہوں نے کہا کہ وہ لوگ گھر جا کر سنتیں پڑھتے ہونگے۔نوجوان کو یہ بات پلّے اس لئے نہیں پڑی کہ وہ ان کے درمیان رہ کر ان کے احوال سے باخبر ہو چکا تھا۔البتہ یہ اس کی بدنصیبی ہے کہ وہ ان ہی گمراہ عربوں کے طریقے کو صحیح سمجھتا ہے اسے ہندوستان کے علماء ومشائخ کا عمل نظر نہیں آتا۔

دور جانے کی ضرورت نہیں۔ہندوستان میں بھی نجدیوں کے بہت سارے ایجنٹ موجود ہیں جن کے ادارے عربوں کے ریال کے سہارے چلتے ہیں۔وہاں بھی طلباء کو فرض نمازوں کے بعد مسجد سے جبراً اٹھا دیا جاتا ہے۔میرے پاس ستم رسیدہ طلباء یہ شکایت لیکر پہونچے ہیں۔اسے ہم امتداد زمانہ کا کرشمہ ہی کہہ سکتے ہیں کہ آج ایسے ہی لوگوں کے پیچھے قوم ریال وڈالر کی چمک دمک دیکھ کر بھاگی دوڑی جارہی ہے۔یہ زمانے کی ستم ظریفی ہی تو ہے کہ جن لوگوں کی زندگی سنت نبوی سے اس درجہ بیزار ہے۔آج ہندوسندھ کا مسلمان عاقبت سنورنے کی امید میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے کاش اسے معلوم ہوتا کہ جن لوگوں کے سینوں میں محبت رسول کا چراغ گل ہو گیا ہے وہ کسی کے لئے مینارۂ نور کبھی نہیں بن سکتے۔ان کا ہر ہر قدم تاریکی میں ہے۔

جناب قسیم گیاوی نے بڑا اچھا شعر کہا ہے ۔

زندگی جس کی ، نبی کی سنتوں سے دور ہے
دور اس سے رحمت عالم کا داماں کیوں نہ ہو

خلفائے راشدین :پیغمبر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت علی منہاج النبوۃ کا زمانہ تیس سال رہا۔ یہ تیس سالہ دور حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے شش ماہہ دور خلافت پر تمام ہوا ۔علی الترتیب یہ پانچ اصحاب رسول خلفائے راشدین میں شمار ہوتے ہیں ۔جن کے متعلق خواجہ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔**علیکم سنتی و سنة خلفاء الراشدین المهدیین** یعنی میری سنت کے بعد میرے خلفائے راشدین کے طریقہ کو لازم پکڑو۔ بے شک ان کا ہر عمل خدا کے نزدیک مقبول ومحمود تھا اوران کی اتباع ہم کم نصیبوں کے لئے ہدایت وکامیابی کا سامان ہے۔

اصحاب عدول : اسے نبی کے چشمۂ فیضان کی برکت ہی کہئے کہ اصحاب بدر سے لے کر اصحاب طلقاء تک کسی بھی صحابی رسول کی پیروی ہمیں راہ ضلال پر نہیں ڈال سکتی۔ کیونکہ وہ بارگاہ نبوی سے ہدایت یافتہ ہونے کی سند پا چکے ہیں۔ ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔**اصحابی کالنجوم کلهم عدول فبایهم اقتدیتم اهتدیتم** یعنی میرے اصحاب مثل ستارے راہنما ہیں ان میں ہر ایک کی پیروی سبب ہدایت ہے۔

ارباب حل وعقد صحابہ نے جو اختلاف رائے رکھا اس کے پیچھے ان کی للٰہیت اور اخلاص کارفرما تھا۔ وہ سب کے سب عنداللہ ماجور ہیں اوران کے نقوش قدم امت کے لئے نشان راہ ہیں ۔ نہ انہوں نے طریقہ نبوی سے زندگی بھر سرمو انحراف کیا اور نہ

کبھی دین میں مداہنت کو روا رکھا۔جن لوگوں نے سرکار کی صحبت زیادہ پائی ان کی زندگی زیادہ تابناک دیکھی گئی یہ الگ مسئلہ ہے۔اسے فیض صحبت کا نام دیا جائے گا۔

اھل تطھیر : بزرگ زادگی کی نسبت بھی بڑی عظیم نعمت ہوتی ہے۔ خون کا رشتہ بہرحال رنگ لاتا ہے۔اوراس کے مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جولوگ آغوش نبی میں پلے بڑھے تھے، انگشت رسول پکڑ کر گلی کوچوں میں چلے پھرے تھے، خانۂ نبوی کے صحن میں کھیلے کودے تھے انہیں پاکیزگی کی سند خود رب تبارک وتعالیٰ عطا فرما رہا ہے۔**یرید الله لیذهب عنکم الرجس اهل البیت و یطهرکم تطهیراً** ط

ان ہی اہل بیت عظام سے رشتۂ محبت استوار رکھنے کی تعلیم دیتے ہوئے خواجۂ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔'' **اهل بیتی کسفینة نوح من رکبها نجیٰ و من تخلف عنها غرق** ''یعنی جس طرح قوم نوح کشتی میں سوار ہو کر ہی طوفان کے عذاب سے نجات پاسکی اسی طرح میری امت بھی میرے اہل بیت کے دامن میں پناہ لے کر رضائے مولیٰ کی راہ پا سکے گی ۔قرآن و حدیث کی ان وضاحتوں کے بعد بھی اگر کوئی بغض اہل بیت کا چور اپنے سینے میں چھپائے بیٹھا ہے تو اسے خارجی ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

صوفیاء و صالحین : فاتحۃ الکتاب میں انعام یافتہ لوگوں کی راہ چلانے کی دعا کی تعلیم دی گئی ہے۔اور ہر مومن صالح اپنے رب کے حضور بار بار اس دعا کی تکرار کرتا ہے۔اور انعام یافتہ لوگوں میں بلاشبہ شہیدان محبت اور صلحائے امت ہی ہیں۔جنہوں نے دنیا اور لوازمات دنیا سے بے نیازی اختیار کی۔خوف ورجا کے

درمیان ثابت قدم رہے۔مصیبت پر صبر اور نعمت پر شکر ادا کیا۔اللہ تعالیٰ نے اس کے صلے میں اپنی محبوبیت سے انہیں سرفراز فرمایا اور قبول خلق کی دولت بخش دی ہے۔

صوفیاء وصالحین کی پوری زندگی شریعت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔اوران کا ہر گام راہ مستقیم پر ہوتا ہے۔اس لئے ان کی اتباع اور پیروی امت کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔مخدوم جہاں حضرت شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری قدس سرہ العزیز ہدایت فرماتے ہیں۔

”لازم ہے کہ نیکوں اور اس راہ کے واقف کار بزرگوں کی صحبت اختیار کرو
بروں اور جاہلوں کی صحبت سے دور رہو“(مکتوبات دوصدی-۳۲۹)

قوم کے فرزندوں کے نام : ملت کے جوانو!اسلام نے جن لوگوں کے نقوش قدم کو ہمارے لئے نشان راہ بتایا ہے۔ان کا ایک سرسری جائزہ ہم نے تمہارے سامنے پیش کر دیا۔اب تم اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ کیا اسی طرح کا کوئی فرمان آل شیخ (محمد بن عبدالوہاب کی اولاد) اور آل سعود (سعودی سربراہان) کے نام ملتا ہے؟ اگر نہیں اور ہرگز اللہ ورسول کا ایسا کوئی فرمان موجود نہیں ہے تو پھر یہ کیوں اصرار ہے کہ ہم وہی کریں گے جو آج عرب والے کررہے ہیں۔عرب والوں کا طریقہ ہمارے سر نہیں تھوپا گیا ہے بلکہ اللہ والوں کا دامن ہمیں تھمایا گیا ہے۔

اگر تمہاری آنکھوں پر پردہ نہیں پڑ گیا ہے اور تمہارے دلوں کو مہر نہیں کر دی گئی ہے تو ٹھنڈے دل سے سوچو کہ ظہور اسلام کو چودہ سو چوالیس ۱۴۴۴ سال ہوئے۔ساڑھے تیرہ سو سال تک حجاز ویمن میں وہ سب کچھ ہوتا رہا جو آج ہندو پاک کے سواد اعظم اہل سنت کر رہے ہیں۔صرف پون صدی پہلے گروہ وہابیہ کا زمین نجد پر ظہور ہوا

اور بلاد عرب پر ان کے غاصبانہ قبضہ کے بعد اہل سنت کے معمولات وہاں شرک و بدعت قرار پائے۔حق و باطل کو پرکھنے والی عقل کی کسوٹی اگر تمہارے پاس ہے تو اب یہ فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے کہ سابقین اسلام ہمارے لئے نمونۂ عمل ہیں یا جمہور اسلام سے بالکل الگ راہ اختیار کرنے والے گروہ وہابیہ کی روش قابل تقلید ہے۔

غیرتمند جوانو! — تم اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر سرحد پار دنیا کمانے کے لئے گئے ہو۔نجدیوں کے ہاتھوں اپنا عقیدہ بیچ کر عاقبت برباد کرنیکے لئے نہیں۔وہ دنیا جو آخرت کے بدلے خریدی جائے اللہ ورسول کے نزدیک مبغوض ہے۔قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے۔ **اولٰئک الذین اشتروا الضلالة بالھدیٰ فما ربحت تجارتھم و ما کانوا مھتدین** ط(یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے)ان کا دیا ہوا مال دنیا میں ختم ہو جائے گا۔اور ان کا لادا ہوا عقیدہ طوق بن کر محشر میں بھی گردن کا بوجھ بنا رہے گا۔ڈاکٹر اقبال نے سچ کہا ہے۔

من کی دنیا ، ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دنیا، چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

عیش دنیا کی خاطر اپنے دین کا سودا کرنے والوں کی اس دور میں کوئی کمی نہیں ہے۔سلمان رشدی،عبدالرحمٰن افغانی،امینہ ودود،تسلیمہ نسرین،اور ظاہرہ شیخ ،جیسے افراد چھپے ہوئے اور ظاہر ہر جگہ موجود ہیں۔میری یہ تحریر ان جیسوں کے نام نہیں ہے۔میرے مخاطب تو وہ سادہ دل نوجوان ہیں جو اپنی کج فہمی سے ہندو پاک کے علماء و

مشائخ کو کم رتبہ سمجھ رہے ہیں۔ زمین عرب اور مقامات مقدسہ سے مرعوب ہو کر وہاں کے زرخرید مبلغین کو حق کا پاسدار گمان کر رہے ہیں۔ اور عرب کے عیاش مزاج حکمرانوں کو سچائی کا علمبردار خیال کر رہے ہیں۔

اپنے دین وایمان کو ریال وڈالر کی میزان پر رکھ کر جنہوں نے بیچ دیا ہے۔ ان سے کچھ کہنا اندھیرے میں لاٹھی گھمانے کے مترادف ہے۔ مجھے تو اپنے ان نوجوانوں سے جو اپنی اور اپنے اقرباء کی ضرورتوں کے پیش نظر وطن سے دور محنت و مزدوری کر کے چند سکے کمانے گئے ہیں، صرف اتنا کہنا ہے کہ — میرے پیارے ! جو دولت، دین ہاتھ سے دے کر ہاتھ آئے، وہ نعمت نہیں ہزیمت ہے۔ لعنت ہے ان پیسوں پر جو ہمیں دین سے بیگانہ اور اپنے اسلاف کا باغی بنا دیں۔ خدا رحمتوں کے پھول برسائے لسان القوم ڈاکٹر اقبال کی قبر پر، کتنا سچ کہا ہے۔

دین ہاتھ سے دے کر ، اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں ، مسلمان کا خسارہ

ملت کے جوانو!

تم پیدا ہوئے ہندوستان کی دھرتی پر۔ پلے بڑھے ہندوستان کی نگری میں۔ شعوری دور میں تم نے قدم رکھا تو دادا بزرگوار کی میلاد خوانی دیکھی، ہوشمند ہونے کے بعد تم نے دادی محترمہ کو فاتحہ کا اہتمام کرتے دیکھا، جوانی کی عمر تک رحمت بردوش باپ اور شفیق چچا کو تم نے محرم اور شب برآت کے انتظام میں مصروف پایا ۔ خاندان کے بڑے بوڑھوں کو تم نے صلاۃ وسلام کی عظمتوں اور درود و دعا کی برکتوں کو

سمیٹتے دیکھا۔ بزرگان طریقت کے قدم تمہارے گھروں پہ آتے جاتے رہے۔ اپنے شہر اور محلّہ کی مسجد کے عالم باعمل امام اور اپنے ملک کے مقتدر علماء و مشائخ کی روح پرور تقریریں تم سنتے سناتے رہے۔ ابھی تمہیں سعودی عرب گئے ہوئے پورے دو سال بھی نہیں گذرے۔ اتنی ڈھیر سی یادیں تمہارے حاشیۂ ذہن سے کیسے محو ہو گئیں۔

دیار نجد کے ان سفید پوشوں میں تم نے کیا کچھ دیکھا کہ اس قدر ان پر ریجھے ہوئے ہو۔ ہوش کے ناخن لو اور دیکھو۔ جبہ ان کا ریا کی گرد سے آلودہ ہے۔ داڑھی ان کی خلاف سنت اور بے نور ہے۔ دل ان کا یاد رسول سے خالی ہے۔ نمازیں ان کی بے حضور اور امام ان کا بے شعور ہے۔ احترام کعبہ کا جذبہ ان میں مفقود ہے۔ انہدام گنبد خضریٰ ان کا اصل مقصود ہے۔ آثار صحابہ مٹانا انہیں مطلوب ہے۔ اور اہل نجد کی یادگاریں قائم کرنا ان کو محبوب ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جنہیں ہر آنکھ دیکھ رہی ہے پھر حق معلوم کرنے کے لئے تمہارے دلوں کے دریچے بند کیوں ہیں۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے ، سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی ، گھر کے چراغ سے

اپنے اسلاف کی تاریخ اٹھا کر دیکھو، وہاں تمہیں یہ نمائشی توپ نہیں ملیں گے ۔ اور ان کے پیچھے عیش پرستی کی حیا سوز داستانیں دکھائی نہیں پڑیں گی۔ ان کا دل خشیت الٰہی کا جلوہ گاہ نظر آئے گا۔ ان کے سینے میں عشق رسول کا سوز و گداز دکھائی دے گا۔ ان کی پیشانی پر ریاکاری کا دھبہ نہیں، اخلاص کا نور نمایاں ہوگا۔ ان کی زندگی سامان راحت کی خوگر نہیں، ریاضت کی سنگلاخ وادی سے گذرتی دکھائی دے گی۔ ان

کے معمولات میں فرائض وواجبات کے ساتھ ساتھ سنن ومستحبات کی بہاریں بھی ملیں گی۔وہ ہرقدم اٹھانے سے پہلے اپنے اگلوں کا نشان قدم دیکھتے تھے۔

ملت کے جوانو! اگر تمہاری غیرت مر نہیں گئی ہے تو اندھیرے سے باہر آؤ۔ اور خانقاہ کے بوریا نشینوں کو دیکھو، ان کی درویشانہ زندگی میں وہ سب کچھ مل جائے گا جو قرون اولیٰ کے نیک سیرت مسلمانوں کی بے داغ زندگی میں دیکھا جا چکا ہے۔ **اصحابی کالنجوم** کہہ کر جن کی زندگی اقوام عالم کے لئے میزان ٹھہرائی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے یہاں سجدوں کا نور بھی ملتا ہے اور عشق کا سرور بھی۔ حق اللہ کی رعایت بھی نظر آتی ہے اور حق العباد کی پاسداری بھی۔ دین پروری کا ذوق بھی دکھائی دیتا ہے اور دین داروں کی حاجت برآری کا جذبہ بھی۔

انہوں نے گرتوں کو ہمیشہ سنبھالا بھی ہے اور ڈوبتوں کو تیرایا بھی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ خیر کر کے خیر کی راہ دکھائی ہے اور بدوں کی بدی کا انجام کف دست پر دکھا کر انہیں بدی کے دلدل سے نکالا بھی ہے۔ ان کی دہلیز پر کوئی پہرہ نہیں تھا۔ ان کی بزم میں من وتو کی تمیز نہیں تھی۔ ان کے یہاں کسی طرح کا بھید بھاؤ نہیں تھا۔ انہوں نے شاہ وگدا کا فرق مٹا کر اہل زمانہ کو مساوات کا درس دیا تھا۔

ان کا نظریہ تبلیغ اچھوتا اور نرالا تھا۔ جبری تبلیغ کا کوئی تصور وہاں نہیں تھا۔ وہ اپنا عقیدہ دوسروں پر مسلط کرنے کے لئے کبھی تشدد پہ آمادہ نہ ہوئے۔ اعتدال ان کی راہ تھی۔ اخلاص ان کا ہتھیار تھا۔ للّٰہیت ان کی پونجی تھی، اسوۂ رسول ان کا پیمانہ تھا۔ خود پرستی کبھی ان کے راہ میں حائل نہ ہوئی اور تقاضائے نفس ان کے راستے کا روڑا نہ بن

سکا۔ انہوں نے اقرباء کو کبھی کوئی آزار نہ پہونچایا۔ ان کی روش پڑوسیوں کے لئے صدمے کا باعث نہ بنی۔ ان کے ساز نئے سے ہمیشہ یہ آواز آتی تھی۔

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

اے غافل! زندگی کے دن کو غنیمت جان اور کچھ نیکی جمع کر لے۔ اس خبر کے پھیلنے سے پہلے کہ فلاں اب دنیا میں نہیں رہا۔ انہوں نے یہ سبق اہل زمانہ کو صرف پڑھایا ہی نہیں تھا۔ اپنی زندگی اسی سانچے میں ڈھال کر ہدایت خلق کا بیڑا اٹھایا تھا۔ انہوں نے مکاری سیکھی نہیں تھی۔ عیاری انہیں آتی نہیں تھی۔ شرائع واحکام کے عامل بن کر انہوں نے بندگان خدا کو راہ مستقیم دکھائی تھی۔ انکی دکھائی ہوئی راہ پہ چلنے والوں کو جو قبول خلق حاصل ہوا وہی ان کے وصول حق کی سند ہے۔ ریال وڈالر کی چمک دمک صداقت کی دلیل نہیں ہے۔ میرے پیارے قصر ومحل کی رنگینی اگر انعام خداوندی ہوتی تو فرعون دریائے نیل مین غرق نہ ہوتا۔

ملت کے جوانو! جن بزرگان علم وفضل کی پاک وستھری زندگی کی کچھ جھلکیاں دکھائی گئیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سونچو کہ ان کے معتقدات کے پیمانے کتنے شفاف رہے ہونگے۔ ان کے نظریات کس قدر بے داغ رہے ہوں گے۔ ان کے پرکھ کی کسوٹی کس درجہ نفیس اور پرکشش رہی ہوگی۔ ان کی فکر وفہم کا زاویہ کتنا روشن وتابناک رہا ہوگا۔ ان کے اصلاح وہدایت کی میزان کتنے راست کانٹے کی حامل رہی ہوگی۔ انہی پاکان امت کی مقدس تعلیمات کا قیمتی سرمایہ تمہارے بزرگوں تک سینہ بہ سینہ

پہونچا تھا اور وہ زندگی بھر اس کے محافظ وامین رہے تھے۔ یہ آبائی دولت تمہیں ورثہ میں ملی تھی جسے بحفاظت تمہیں اپنے بعد آنے والی نسل کو منتقل کرنا تھا۔ مگر ہائے افسوس! تم نے سعودی عرب جا کر چند سکوں کے عوض یہ انمول سرمایہ دو ہی سال میں کھو دیا۔ اور وہاں سے کھوٹا مال لا کر ہندوستان میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا لیبل چسپاں کر کے گلی گلی اور نگر نگر پھیلاتے پھر رہے ہیں۔ نوشتۂ تقدیر کو تو میں نہیں مٹا سکتا۔ لیکن میرے پیارے! میری اس تحریر کو دل کی عینک سے پڑھنے کی کوشش ضرور کرنا

ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ تم نے میری اس تحریر کے مطالعہ کے وقت اہل عرب کے اس مقولہ ''**انظر الیٰ ماقال ولا تنظر من قال**''یعنی یہ دیکھو کہ کیا کہا جا رہا ہے، یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے۔ کو پیش نظر رکھا اور تعصب کی عینک اتار کر دل کی عینک سے پڑھنے کی کوشش کی تو انشاء اللہ حق تمہارے قلب وسینہ میں اتر جائے گا۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

☆☆☆

انکار دعا کا فتنہ

دعا،عبدومعبود کے درمیان اس رابطے کا نام ہے، جو بندے کو اپنے رب کے حضور عاجزی اور نیازمندی پر آمادہ کر کے اس کی حاکمیت کبریٰ اور قدرت کاملہ کے آگے جھکا دیتی ہے۔اور یہ سعادت بڑی نعمت بلکہ بندگی کی معراج ہے اسی لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ **الدعاء مخ العبادة** یعنی عبادت کا مغز دعا ہے اور مغز کی قدر و قیمت سب کو معلوم ہے۔

ابوالبشر سے لے کر خیر البشر تک ہر نبی و رسول کو، جن کے مقبول رب ہونے میں ہرگز کوئی کلام نہیں، اپنے خالق و پروردگار کے روبرو ہاتھ اٹھائے دیکھا گیا ہے۔ اگر ایک نے اپنی امت کی باغیانہ روش سے تنگ آکر ان کے لئے ہلاکت کی دعا کی تو دوسرے نے اپنی امت کی اصلاح وہدایت کے سارے جتن کر لینے کے بعد دعائے ہدایت فرمائی، اور جو چاہا اپنے رب کی عطا سے پالیا۔قرآن حکیم میں بے شمار ایسے شواہد موجود ہیں کہ قوموں نے اپنے اپنے نبیوں سے اپنی حاجات بیان کر کے دعا کی درخواست کی اور مقصود ومراد کو پہونچی۔

در کریم سے بندے کو کیا نہیں ملتا
جو مانگنے کا طریقہ ہے اس طرح مانگو

دعا ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر اولین وآخرین سب کا اجماع رہا ہے۔اور ہر زمانے میں بندگان خدا نے گریہ وزاری کر کے اپنے رب کی رحمتوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔عالمی شہرت یافتہ حضرت شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مقبول زمانہ کتاب

کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

’’یکے از بندگان گنہ گار، پریشان روزگار، دست انابت بامید اجابت، بدرگاہ خداوند جل وعلا بردارد، ایزد تعالیٰ درو نظر نہ کند، بازش بخواند، بار دیگر اعراض، فرماید، بازش باتضرع وزاری بخواند۔حق سبحانہ وتعالیٰ گوید، **یا ملائکتی قد استحییت من عبدی و لیس له غیری** دعوتش راا جابت کردم وامیدش برآوردم کہ بسیاریٔ دعا وگریۂ بندہ ہمی شرم دارم۔‘‘

یعنی گنہ گار بندوں میں سے ایک زمانے سے پریشان ہو کر رجوع کا ہاتھ قبولیت کی امید میں بزرگ و برتر کی بارگاہ میں اٹھاتا ہے۔لیکن رب تعالیٰ اس کی طرف نظر نہیں کرتا ہے۔ بندہ اپنے رب کو پھر پکارتا ہے۔دوسری بار بھی خدا بے تعلقی کا اظہار فرماتا ہے۔ بندہ رو رو کر پھر اس کی رحمت کو آواز دیتا ہے۔حق سبحانہ تعالیٰ اب فرشتوں سے کہتا ہے اے فرشتو! میں نے اپنے بندے کی دعا قبول کر لی اور اس کی امید پوری کر دی اس لئے کہ اس کی مسلسل دعا اور گریہ وزاری سے مجھے شرم آتی ہے۔

مخدوم جہاں حضرت شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری رضی اللہ عنہ کی مکتوبات صدی کے ص۔۲۵۴ پر بھی یہ حدیث پاک مذکور ہے۔قرآن کریم میں جو یہ فرمایا گیا ہے۔**لا تقنطوا من رحمة الله** اس کے یہی معنی ہیں۔اس حدیث پاک کے پس منظر میں حضرت شیخ شیوخ العالم اپنے ملفوظات میں، جسے حضور محبوب الٰہی نے جمع فرمایا ہے اور خواجہ امیر خورد کرمانی نے جسے سیر الاولیاء میں نقل کیا ہے، فرماتے ہیں۔ **الله يستحى من العبد ان يرفع اليه يدية و يرد هما خائبين** ص۔۱۲۷ یعنی

اللہ رب العزت اپنے اس بندے سے شرم فرماتا ہے جو کہ اپنے دونوں ہاتھ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں اٹھائے اور خدا اس کو ناکام رد کردے۔

اسلام و کفر کے درمیان پہلے معرکہ کے موقع پر جب بدر کے میدان میں مومنین و کفار آمنے سامنے ہوئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کافروں کی کثرت اور ان کے سامان حرب وضرب اور مسلمانوں کی قلت اور ان کی بے سروسامانی کو دیکھ کر اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوگئے اور انتہائی الحاح کے ساتھ بقاء اسلام کی دعا فرمائی۔ دعا کے الفاظ سن کر آج بھی آنکھیں پرآب ہو جاتی ہیں۔اس وقت رب تعالیٰ کی طرف سے بشارت آئی **سیھزم الجمع و یو لون الدبر** یعنی دشمنوں کو ہزیمت ہوگی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہونگے۔

یہ بشارت کس طرح پوری ہوئی، بدر کی تاریخ گواہ ہے۔اور آج تک عالمی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔قرون اولیٰ کے مقدس اصحاب نے اہل بیت اطہار کا توسل پکڑا اور دعا کے ہر مرحلے میں شادکام ہوئے۔سلاطین اسلام نے صالحین امت کے مبارک پیرہن کو سامنے رکھ کر دعا مانگی اور فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوئے۔المختصر یہ کہ ڈیڑھ ہزار سال کی اسلامی تاریخ میں بندوں کی طلب اور خدا کی عطا کا سلسلہ ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔

قرآن کریم میں دعا کی تعلیم دی گئی۔دعا کے الفاظ سکھائے گئے۔دعا کے اسلوب وآداب بتائے گئے۔سورۂ فاتحہ کی ترتیب فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔کوئی بھی گدا، کسی بادشاہ کی دہلیز پر جاتا ہے تو پہلے اس کی بڑائی بیان کرتا ہے۔اس کی

فیاضی کا گن گاتا ہے۔پھر اپنا استحقاق بتا کر دست طلب پھیلاتا ہے۔اور اس طرح اونچے دربار سے کچھ پا کر ہی واپس لوٹتا ہے۔سورۂ فاتحہ جس کا ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھنا واجب ہے۔ابتدائی آیات میں حمد وثنا ہے۔**مالک یوم الدین** میں حاکمیت وفیاضی کا اعتراف ہے۔**ایاک نعبد و ایاک نستعین**، بیان استحقاق ہے۔**اھدنا الصراط المستقیم**، سوال وطلب ہے۔اس فرمان عالیشان سے روز روشن کی طرح یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ رب تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کو امیدوار مغفرت اور طلب گار رحمت دیکھنا پسند فرماتا ہے۔

موتی سمجھ کر شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

دعا میں تامل: -متقدمین صوفیاء کے ایک گروہ نے دعا میں تامل فرمایا ہے۔مگر اس کی وجہ وہ نہیں جو آج کے بے دین کہتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ جس بندے نے نفس کی خواہش، طبیعت کی چاہت اور اپنی حاجت وطلب کو مشیت کی قربان گاہ میں ذبح کر ڈالا ہے، اور تسلیم ورضا کے صحراء میں چل پڑا۔اور اتنی دور نکل گیا کہ رب تعالیٰ اسے بلا کر یہ ارشاد فرمائے کہ اے بندے! تیری ایک ہزار سال کی بے ریا عبادت کے بدلے تجھے جہنم کا مژدہ دیتا ہوں تو وہ اتنا ہی خوش ہو جائے جتنا جنت کی بشارت سن کر۔راضی بہ رضا اور صابر بہ قضا رہنے والے بندگان خدا کی شان ہی نرالی ہی ہوتی ہے۔وہ مقام ومنزل کو نہیں دیکھتے۔ان کی نظر فرمان رب پر ہوتی ہے۔اور اسی کو وہ محبوب رکھتے ہیں۔

سلطان المحققین حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحیٰ منیری رضی اللہ عنہ نے ان ہی غواص بحر معرفت صوفیاء کے حسب حال ایک حدیث قدسی بیان کی ہے جو مکتوبات صدی کے ص۔۲۵۲ پر مذکور ہے۔ **من شغلہ ذکری عن مسئالتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین** یعنی جس شخص کو ہمارا ذکر سوال کرنے سے باز رکھے، ہم اس کو سوال کرنے والوں سے کہیں زیادہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

میں نے ایک مجلس میں والد بزرگوار کو یہ کہتے سنا تھا کہ یہ مقام تسلیم ورضا کا شعر ہے۔ مولویوں کے فہم سے بالا ہے۔ عجب اتفاق کہ میں نے مبارکپور کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔ تقریر کے بعد ایک مفتی صاحب نے یہ کہتے ہوئے میری اصلاح فرمائی کہ اس شعر میں بندے کے آگے خدا کا عجز ثابت ہوتا ہے۔ اس شعر کو پڑھنے سے پرہیز کیجئے گا۔ یہ بات مجھے ہضم نہیں ہوئی۔ دوران درس حضور حافظ ملت سے بیان کیا۔ آپ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ یہ شعر مفتی صاحب کے سر سے گذر گیا۔ یہ مقام تسلیم ورضا کا شعر ہے۔ حافظ ملت کے اس ارشاد کے بعد مجھے کسی کی پرواہ نہ رہی۔

حضرت مخدوم جہاں نے دعا کو محبوب عبادت تسلیم کرنے کے باوجود، اعتدال کی ایک حسین راہ پیدا فرمائی ہے۔ بڑے ہی خوبصورت انداز میں بیان فرماتے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ لکھتے ہیں۔

”اگر طالب اپنے دل میں اشارہ دعا کی طرف پائے تو دعا کرنا بہتر ہے۔ اور اگر چپ رہنے کی رغبت ہو تو سکوت افضل ہے۔ بزرگوں کا خیال ہے کہ اگر دعا کرنے میں بسط پیدا ہو اور وقت خوش ہو تو دعا کرنا مناسب ہے۔ اگر دعا کے وقت اپنے دل میں رکاوٹ پائے تو ترک دعا اولیٰ ہے۔ اور اگر ایسا موقع آجائے کہ دل کو بسط ہو نہ قبض۔ ایسی صورت میں دونوں برابر ہیں۔ ہاں اس وقت علم کا غلبہ ہو تو دعا کرے۔ کیونکہ دعا عبادت بھی ہے۔ اور اگر اس وقت معرفت کا غلبہ ہو اور حال غالب ہو تو سکوت بہتر ہے۔ (ترجمہ مکتوبات صدی، ص۔۲۵۳)“

مگر یہ ساری تصریحات سالکین کے لئے ہیں۔ مبتدی بے چارے کی یہاں تک رسائی کہاں۔ ہم جیسوں کو تو در کریم پر دستک دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معاملات میں ہمیشہ راضی بہ رضا رہے۔ اور اپنی غریب امت کیلئے دست بدعا ہوئے عشق کی جولان گاہ میں دوڑ لگانے والے جب خود خاموشی کے سمندر میں ڈوب گئے تو وہ دعا بھول گئے۔ اور جو **الشیخ فی قومہٖ کالنبی فی امتہٖ** کے رمز سے آشنا ہوئے، انہوں نے خیر کثیر کیلئے فضل رب کی دہلیز پر ہاتھ پھیلایا۔

دعا کے انکاری :- پانی پہلے پشتہ میں سوراخ کرتا ہے۔ اور بہاؤ تیز ہو جانے کے بعد پشتہ ہی کو الٹ دیتا ہے۔ اسی طرح فتنہ، پہلے چور دروازے سے داخل ہوتا ہے اور قوت پا جانے کے بعد کھلے میدان میں خم ٹھونکتا ہے۔ لہٰذا روز اول فتنوں کا سد باب ضروری ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر نے اگر زکوٰۃ کے

منکرین کے ساتھ نرمی کوراہ دی ہوتی توروزے کے انکارکادروازہ کھل جاتا۔اور پھر نمازتک نوبت پہونچتی۔لیکن صدیق اکبر کی صائب رائے اور غیر متزلزل فیصلے نے ہمیشہ کیلئے فتنے کا سدباب کردیا۔

پہلے انبیاء واولیاء سے توسل کوحرام ٹہرا کر وسیلے کی دعا ناجائز بتائی گئی۔اس کے بعد غیراللہ سے استمداد کوشرک قرار دے کرمحترم مقامات پر دعا کو حرام بتایا گیا۔حتیٰ کہ نقوش وتعویذات سے حصول برکت کے تصورکوشرک سے تعبیر کیا گیا۔اوراب مطلقاً خدا ہی کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھانے کومہمل،لغواور بے سود کہا جارہا ہے۔اوراتنا ہی نہیں، دعا سے باز نہ رہنے والوں پر مسجدوں کا دروازہ بند کیا جارہا ہے۔ ع چہ دلاوراست دزدے کہ بکف چراغ دارد

عقائد فاسدہ کا فتنہ عرب کے خطۂ نجد سے ظاہر ہوا۔اورایک شاطر دماغ کے ذریعہ غیر منقسم ہندوستان تک پہونچا۔اورآج بھی اس خام مال کی درآمد وہیں سے ہو رہی ہے۔اوردن بہ دن اس میں تیزی آتی جارہی ہے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ ہندی نژاد اور پاکستانی نوجوان جو وہاں دنیا کمانے جاتے ہیں وہ وہاں پہونچتے ہی ہندوپاک کے مقتدرعلماء ومشائخ کوبھول جاتے ہیں۔ان کی ستھری اور باعمل زندگی انہیں یادنہیں رہتی۔عیاش عربوں اورفساق شیوخ کے اندرہی ان کوسارا دین نظر آنے لگتا ہے۔ چنانچہ جب وہ وطن لوٹ کرآتے ہیں تواپنے ساتھ دو بیماری ضرورلاتے ہیں۔

(۱)نماز پڑھنے کیلئے ٹوپی کی ضرورت نہیں (۲)نماز پڑھنے کے بعد دعا کی حاجت نہیں۔

آج جن لوگوں کوانبیاء واولیاء کے توسل کے بغیر بھی خدا کے حضور ہاتھ پھیلانے میں عارمحسوس ہوتا ہو،ایسے لوگ ملعون رب نہ ہوں تو اور کیا ہوں۔اور باد صرصر ایسے افراد کوسمندری جھاگ کی طرح کنارے نہ ڈال دے تواور کیا کرے۔آج جودنیا بھر سے عربوں کی ساکھ اکھڑ چکی ہے اوران کی تاریخی عظمت کا سورج گہن آلود ہے۔یہ ان کے اپنے کرتب کی بدّیا ہے۔

زمانہ پھر گیا ، چلنے لگی ہوا الٹی
چمن کو آگ لگا کر جو باغباں نکلا

اگرآپ میری کچھ سننے کوتیار ہوں تومیں یہ عرض کروں کہ وہ سارے عقائد و اعمال جوسواداعظم اہل سنت کے یہاں جاری وساری ہیں،روس وامریکہ سے نہیں آئے ہیں۔وہ بھی حجاز ویمن ہی سے دریافت ہوئے ہیں۔تاریخ بتاتی ہے کہ ہرقل بادشاہ روم نے حضرت فاروق اعظم کوخط لکھا کہ میرے سر میں درد رہتا ہے اورکوئی علاج سودمند نہیں ہوتا آپ کوئی مؤثر علاج بتایئے۔ جناب فاروق اعظم نے ایک ٹوپی بھیج دی کہ اسے پہن لیا کرے،دردنہیں ہوگا۔ ہرقل نے جب اسے پہنا درد غائب ہوگیا۔اور جب جب اسے پہنتا درد غائب ہوجاتا۔ایک دن اس نے سوچا کہ ٹوپی میں کیا خوبی ہے کھلوا کردیکھا تو اندرایک پرچی تھی۔جس میں بسم اللہ شریف لکھی تھی۔تعویذ جومشائخ امت شفاء کے لئے دیتے رہے ہیں اس میں اس کے سوااور کیا ہوتا ہے۔

ایک بارعین جنگ کی حالت میں سالارفوج حضرت خالد بن ولید کچھ

ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔ اختتام جنگ کے بعد لوگوں نے پوچھا کہ تلواروں کے سائے میں خطرے سے بے خوف ہو کر آپ کس چیز کی تلاش میں پریشان تھے۔ فرمایا کہ میں اپنی ٹوپی ڈھونڈھ رہا تھا۔ احباب نے پوچھا اس ٹوپی میں کیا خاص بات ہے۔ جواب دیا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک اس ٹوپی میں محفوظ ہے۔ جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ مجھے ہر جنگ میں فتح یاب کرتا ہے۔

کیا کہیں گے آپ! حضرت خالد بن ولید کا ایمان مشکوک تھا؟ اگر نہیں تو آج کس کی شریعت نے اس اعتقاد کو شرک لکھ دیا۔ مجھے کہنے دیجئے کہ جن لوگوں کو اسلاف کرام کی پرنور زندگی داغدار نظر آرہی ہے۔ اور بزرگوں کے رہنما اصول اختراع اور بدعت دکھائی پڑ رہے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر موڑ پر رسوا ہو رہے ہیں۔ زمانے کی ٹھوکروں نے انہیں خزف کی جگہ ڈال دیا ہے۔ پھر بھی ہوش کے ناخن لینے کو کوئی تیار نہیں۔

ایک طرف مغربیت کی ہوا بہہ رہی ہے۔ آزاد خیالی ہے۔ دین بیزاری ہے۔ الحاد کی طرف میلان ہے۔ قرآن کی آیات میں فقہ کے اصول میں ترمیم کا مطالبہ ہے۔ اور ماڈرن لائز اسلام کی تلاش ہے۔ دوسری طرف توہب ہے۔ رہبانیت ہے۔ روحانیت سے دوری ہے۔ صوفیاء کی روش سے بیزاری ہے۔ اور دین و شریعت کی خود ساختہ تفہیم وتشریح ہے۔

صحراء پہ لگے پہرے اور قفل پڑے بن پر
اب شہر بدر ہو کر، دیوانہ کدھر جائے

ایک آخری بات: غیر مقلد کا بچہ رفع یدین نہیں بھولتا۔ شیعہ کا لڑکا امامیہ مشن سے چمٹا رہتا ہے۔ قادیانی نوجوان مرزا غلام احمد قادیانی سے اپنا رشتہ یاد رکھتا ہے۔ آپ ہی کا فرزند، ڈگرے کا بیگن کیوں ہے۔ جسے لوگھڑنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی اگر آپ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے تو میں آپ کو بتاؤں- آپ نے اپنے بچوں کو دین کی ٹھوس تعلیم نہیں دلائی۔ اسے اپنے رسول کی عظمتوں سے آشنا نہیں کیا۔ اس کے دل میں اسلاف کی محبت اور بزرگوں کی عقیدت راسخ نہیں کی۔ اسے اپنے بنیادی عقائد میں پختہ نہیں بنایا۔ حتیٰ کہ قرآن اور دینیات سے بھی بے بہرہ رکھا۔ زبان گویا ہوئی بس پیٹھ پر بستہ لاد کر اسکول کا راستہ بتا دیا گیا۔

بے چارہ اسکول کی چہار دیواری سے باہر آیا تو کالج کی بلڈنگ میں ٹھکانہ ملا۔ پھر ترقی کر کے یونیورسیٹی کیمپس تک پہونچا ڈگری لے کر گھر واپس آیا تو انگریزی اخبار دیکھا، ہندی رسالہ پڑھا۔ اور جب زندگی کی ضروریات نے پیچھا کیا تو ریال و ڈالر کمانے نکل کھڑا ہوا۔ جب کچھ عرصہ بعد دیار غیر سے وطن واپس لوٹا تو کبھی الحاد اور کبھی وہابیت کی آلائش عقیدے کی پلوتھین میں بھر کر لے آیا۔ اس لئے کہ دینیات سے اس کی ملاقات نہیں تھی۔ مذہبیات کا اس کے پاس مطالعہ نہیں تھا۔ وہابیت کے مہلکات سے اس کی آشنائی نہیں تھی اور گھر کا ماحول بھی دین دارانہ نہ تھا۔

فرمان رب ہے- **یا ایھا الذین آمنوا قوا انفسکم و اھلیکم نارا** اے ایمان والو، اپنی ذات اور اپنی آل اولاد کو نار جہنم سے بچاؤ۔ آپ نے قرآنی احکام کو پس پشت ڈالنے کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس لئے بیٹے کی بے راہ روی میں

آپ حصے دار ہیں۔اس کے گناہوں میں آپ کا ساجھا ہے۔اس نے گھر کے شفاف ماحول میں بدعقیدگی کا زہر گھولا، وبال آپ کے سر ہے۔اس نے اہل خاندان کو گمراہی کا راستہ دکھایا، مواخذہ آپ سے ہوگا۔اس نے عقیدہ باطلہ کی اشاعت پر زرکثیر خرچ کیا، حساب آپ کو چکانا ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ نتائج کی ان ہولناکیوں سے آپ قطعاً بے خبر تھے۔آپ کے پیش نظر صرف دنیا کی منفعت تھی عیش ونشاط کی زندگی کا خواب دیکھ کر آپ نے بیٹے کو وہاں تک پہونچایا، لیکن دین کی حفاظت کی طرف سے پہلوتہی، یہ آپ کا جرم عظیم ہے۔دین کی دولت کے ساتھ اگر متاع دنیا ہاتھ آئے تو نعمت ہے کیونکہ وہ خیر کثیر کا ذریعہ ہے۔اور اگر آخرت کی پونجی ضائع کر کے سرمایۂ دنیا آسمانی اولوں کی طرح برس پڑے تو مومن کے لئے نقصان کا سودا ہے۔اس لئے کہ مال جو دین وایمان کے زوال کا سبب بنے وبال ہے۔شاعر قوم کی قبر پر رب کریم رحمتوں کے پھول برسائے۔کتنا سچ فرمایا ہے ۔

دین ہاتھ سے دے کر، اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلمان کا خسارہ

☆☆☆

غیر مقلدین کے لئے کشادگی راہ

زمانے کی کوکھ سے مذہب کے نام پر اب تک جتنی جماعتوں نے جنم لیا ہے ان میں سے جماعت اہل حدیث کیلئے اس زمانے میں سب سے زیادہ فضا سازگار ہے ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے وہابیہ اور دیابنہ دودھ بھائی کی حیثیت سے حکومت سعودیہ کی خیرات میں حصہ دار تھے ۔جب غیر مقلدین کو یہ خیال ستانے لگا کہ اہل دیوبند اور ارباب ندوہ اپنے بڑے بڑے اور مشہور اداروں کی بنیاد پر سعودیہ ۔کی خیرات لوٹنے میں ہم سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں تو انہیں گرا کر خود آگے بڑھ جانے کی ان کو سوجھی ۔لہٰذا انہوں نے بہت دور کا پانسا پھینکا اور بازی لے گئے ۔

وہ اس طرح کہ غیر مقلدین نے سعودی ارباب حکومت کو یہ باور کرایا کہ اہل دیوبند کچھ عقائد میں ہمارے ساتھ ہو کر اگر چہ بریلی کے خلاف ہیں لیکن نماز روزہ وغیرہ تمام طریقۂ عبادت میں اہل بریلی کے ساتھ ہیں اور امام اعظم ابوحنیفہ کے مقلدین کی صف میں شامل ہیں ۔ہندوستان کے اندر تقلید کا انکار کر کے وہابی تحریک کو قوت پہونچانے والے اصلاً ہم سلفی لوگ ہی ہیں ۔یہ تیر نشانے پر لگا اور غیر مقلدین کی چاندی ہوگئی ۔خیرات بانٹنے میں اب حکومت سعودیہ کا تیور بدل گیا اور نصف سے زائد کے حقدار غیر مقلدین قرار پائے ۔۱۹۹۱ء کے بعد اہل دیوبند پر نوازش کے دروازے کوتاہ کئے گئے اور غیر مقلدین پر داد و دہش کا دروازہ کشادہ کیا گیا ۔پھر تو ہندوستان میں غیر مقلدین کے بلند بام ادارے کھلنے لگے ۔تعلیم نسواں کے نام پر مدرسۃ البنات

جگہ جگہ قائم ہونے لگے اور غیر مقلد بنانے کے لئے مقلدین کی آبادیوں سے بچوں بچیوں کی تحصیل شروع ہوگئی ۔سعودی سرمائے سے طلبا کے لئے ایسی سہولیات فراہم کی گئیں کہ بچوں کے سرپرست انہی میں گم ہو کر رہ گئے ۔انہیں عقیدہ وعمل کا نقصان نظر ہی نہ آیا جاہل عوام ویسے بھی گہرائی میں اتر کر کسی چیز کو دیکھنے کے عادی نہیں ہوتے ہیں اس طرح مقلدین کے گھروں میں غیر مقلدیت داخل ہونے لگی ۔

دوسری طرف علم وعقل سے کورے افراد تلاش کر کر کے ان پر غیر مقلدیت کی چھاپ چڑھائی جانے لگی ۔سعودی ریال کی چمک دکھلا کر لوگوں کی فکروں کو متاثر کیا جانے لگا ۔رفتہ رفتہ جب چند گھروں میں ہم خیال پیدا ہو گئے تو فوراً سعودی سرمایہ سے قیمتی زمین خرید کر عالیشان مسجد کی تعمیر کرا دی گئی اور اب باضابطہ غیر مقلدیت کی تبلیغ شروع ہوگئی ۔نتیجہ ظاہر ہے جو جماعت کھانے میں نمک کے برابر تھی وہ آبادی کا ایک حصہ نظر آنے لگی ۔

اس طرح کی دراندازی حلقہ مقلدین مین بیزاری کا سبب بنی ۔سواد اعظم اہل سنت میں پائی جانے والی بے چینی تو خالصاً لوجہ اللہ تھی کیونکہ سنی نوجوانوں میں وہابی عقیدے کی زہرافشانی ائمہ کرام کی حرمتوں پر پے بہ پے حملے ،کھلے سر نماز پڑھنے کی ترغیب دینا اور سنی مسجدوں میں پہونچ کر آمین بالجہر کا شور برپا کرنا ایسے امور تھے جو برداشت کے قابل نہ تھے ۔لیکن اہل دیوبند کی بیزاری کے دو بنیادی اسباب تھے ۔

پہلا سبب تو یہی مسئلہ تقلید تھا ۔ائمہ امت کو تنقید کا نشانہ بنانا ،سر راہ تقلید کا استہزا کرنا اور دیوبندی نوجوانوں کو غیر مقلدیت کی طرف لے جانا ،ظاہر ہے کہ ان کو بھی یہ گوارا نہ ہوا ۔

چنانچہ ایک دیوبندی فاضل غیر مقلدیت کے فتنے سے اس طرح خبردار کرتے ہیں ۔

''غیر مقلدین جسے وہ لوگ اب سلفیت سے تعبیر کرتے ہیں اس دور کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اس فتنے کی سرکوبی کرنا اور آنے والی نسلوں کو غیر مقلدیت کے سنہرے طلسم سے دور رکھنے کی جدو جہد کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ خدا کے فضل سے ہماری جماعتیں وقت کا یہ تقاضا سمجھ گئی ہیں۔'' (ترجمان دیوبند اپریل ۲۰۰۱ء)

اور دوسری وجہ حکومت سعودیہ کی طرف سے ملنے والے وظیفے میں کٹوتی تھی۔
اہل دیوبند کو جو خساروں سے دوچار ہونا پڑا تھا اس کے محرک یہی غیر مقلدین تھے۔ ان ہی کی شرانگیزیوں نے ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی تھیں۔ ظاہر ہے اس نقصان کا درد اتنا ہلکا نہ تھا جسے سینے میں دبا لیا جاتا اور کسی طرح سے اس کا اظہار نہ کیا جاتا۔ دیوبندی فاضل مولانا نورالدین اعظمی درد کے ماروں میں ایک ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں وہ درد کا اظہار کن لفظوں میں کرتے ہیں۔

''غیر مقلدیت عصر حاضر کا بہت بڑا فتنہ ہے۔ قرآن وحدیث کا نام لیکر اس جماعت نے شریعت اسلام پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر، فقہاء ومحدثین پر، اولیاء اللہ اور بزرگان دین پر شب خون مارنے کی تگ ودو میں اپنی پوری طاقت جھونک دی ہے۔ عربوں کی دولت ان کو بے تحاشہ مل رہی ہے جس کا یہ ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

عرب بے چارے اپنی سادہ لوحی سے ان کو دین اسلام اور کتاب وسنت کا خادم سمجھے ہوئے ہیں اور اپنی دولت ان کے لئے انڈیل دی ہے۔ انہیں کیا پتہ کہ جن کو ہم نے رہنما سمجھا

ہے وہ ڈاکو ہیں۔ وہ دین پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں، شب خون مار رہے ہیں۔'' (مقدمہ غیر مقلدین کی ڈائری)

پہلے حوالہ میں فاضل مضمون نگار سے میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ آپ کی جماعت کو اتنی دیر میں ہوش کیوں آیا۔ اور ہوش کی دوا سعودی ریال کی بندی کیوں بنی اور دوسرے حوالہ میں اعظمی صاحب سے یہ دریافت کرنا فضول سمجھوں گا کہ عرب والے کیا دین کا خادم سمجھ کر سادہ لوحی ہی میں آپ کے لئے بھی اپنی دولت کا دہانہ کھولے ہوئے تھے۔ ہوشمند ہونے کے بعد انہوں نے آپ پر دروازہ بند کر دیا تو غیر مقلدوں کے لئے یہ سادہ لوحی کیوں باقی رہی۔ یہ سب کچھ نہیں بات دراصل یہ ہے میرے بھائی! کہ اپنے وہابی مشن کا سچا خادم سمجھ کر وہ آپ لوگوں کو بھی دے رہے تھے اور اب پورا اعتماد قائم ہو جانے کے بعد انہیں دے رہے ہیں۔

یہی وہ اسباب تھے جن کے نتیجے میں دہلی کے اندر جمیعۃ العلماء کے جھنڈے کے نیچے مولانا اسعد مدنی کی صدارت میں ملک گیر پیمانے پر غیر مقلدین کے خلاف تحفظ سنت کانفرنس کے نام سے ۲۔۳ مئی ۲۰۰۱ء کو دوروزہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔ جس میں غیر مقلدین کو گمراہ، بے دین اور خارج از اسلام فرقہ قرار دیا گیا تھا اور مسلم عوام کو ان سے دور و نفور رہنے کی ہدایت وتاکید کی گئی تھی اور ان کے خلاف چند اہم تجاویز بھی سامنے لائی گئی تھیں۔ نہایت طویل خطبہ صدارت کی چند ابتدائی سطریں ملاحظہ فرمائیں۔

''مسلمانوں کے عہد زوال میں جب سامراجی سازشوں کے تحت جماعت مسلمین میں اختلاف وانتشار پیدا کرنے کی غرض سے

مذہبی فرقہ بندیوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تو فقہ اسلامی وفقہائے اسلام، بالخصوص امام اعظم ابوحنیفہ اوران کے متبعین ومقلدین کے خلاف عدم تقلید کا نعرہ لیکر ایک نئے فرقے نے سر اٹھایا۔''

یہاں ہم یہ نہیں کہیں گے کہ مولانا اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی ان ہی سامراجی سازشوں کا شکار ہوئے اور سواد اعظم اہل سنت کو مشرک وبدعتی ہونے کا فتویٰ دیا اور نوبت جدال وقتال تک پہونچی۔ نتیجتاً دونوں مارے گئے، لیکن جس فرقہ کو وہ جنم دے گئے تھے وہ زندہ رہا۔ مجھے اس بحث میں پڑنا نہیں ہے کہ دیوبندی اتنے لمبے عرصے تک انتہائی خاموشی کے ساتھ غیر مقلدین کے شانہ بہ شانہ کام کیوں کرتے رہے اور سعودی وظیفہ میں کمی واقع ہوتے ہی اچانک ان کا تیور بدل گیا۔ بلکہ میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ سعودی کی انبوہ دولت کے بل بوتے پر غیر مقلدین کی یلغار ہندوستان کی ہر ریاست میں یکبارگی بڑھ گئی اور وہ جارحانہ اقدام پر اتر آئے جو عام بیزاری کا سبب بنا۔

سنتے ہیں کہ سعودی عرب میں تبلیغی جماعت کو تبلیغ کی جو کھلی جھوٹ تھی وہ بھی اب نہیں ہے۔ اسی لئے ہندو پاک کے جو نوجوان بغرض ملازمت سعودی عرب جاتے تھے وہ عموماً تبلیغی جماعت کے زیر دام ہو کر آتے تھے مگر اب وہ آٹھ رکعت تراویح والوں کے اسیر دیکھے جا رہے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں کا رویہ صرف ہندو پاک میں ہی تبدیل نہیں ہو چکا ہے بلکہ انہوں نے اندرون ملک بھی دیوبندیوں کی نکیل کس دی ہے۔ اگر اس کا مزید ثبوت چاہتے ہیں تو مولانا اسعد مدنی کے خطبہ صدارت کے یہ الفاظ پڑھئے۔ عرب کے اداروں سے اپنی بے دخلی کا کس طرح ماتم کرتے ہیں۔

''اور اسی مشرک ساز فرقہ کے علماء آج الجامعۃ الاسلامیہ (مدینہ منورہ) کے تعلیمی شعبوں پر قابض ہیں اور تنگ نظری اور فکری آوارگی کی بنا پر افتراق بین المسلمین کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور الجامعۃ الاسلامیہ سے ایسے علماء وفضلاء اطراف عالم میں بھیجے جا رہے ہیں جو اپنے انہی اساتذہ کے طرز عمل پر پوری دنیا میں تفریق بین المسلمین کی تخم ریزی کرتے ہیں اور فتنہ وفساد پھیلاتے ہیں۔'' (افتراق بین المسلمین۔۱۵۵)

دو حصہ دار آپس میں سمجھوتہ کر کے لمبی مدت تک خدمت انجام دیتے رہے۔ ان میں سے ایک نے اپنا کھونٹا مضبوط کر کے غداری کی اور دوسرے کی ساکھ اکھاڑ دی تو اپنے حریف پر اتنا نزلہ اتارنا تو ضروری ہی تھا۔ سواد اعظم اہل سنت کیلئے تو دونوں ہی صورتیں انتہائی خطرناک تھیں اور بربادی کا سامان بھی۔ سعودیہ جانے والے نوجوان تبلیغی بن کر آئیں چاہے غیر مقلد میرا تو نقصان ہی نقصان ہے۔ الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ کے تعلیمی شعبوں میں دیوبندی اساتذہ رہیں یا غیر مقلدین میرا تو کسی میں بھلا نہیں ہے۔

لیکن دیوبندی جماعت کیلئے یہ دوسری صورت بہر حال تشویشناک ہے۔ مگر ان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ حکومت سعودیہ کے خلاف نہیں بول سکتے۔ وہ آج بھی حضور سرکار کہہ کر کچھ عرض کرنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ ڈر ہے کہ بچی کھچی خیرات بھی ان پر بند نہ ہو جائے۔ لہٰذا ہندوستان کے غیر مقلدین ہی سے بھڑ کر اپنی بھڑاس نکال رہے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ناموس رسالت سے کھیلنے والے یہ بزدل شاہان عرب سیاسی

اور مذہبی دونوں میدانوں میں اسلام اور مسلمانوں کو شدید نقصان پہونچا رہے ہیں۔

سیاسی میدان میں امریکہ کی غلامی قبول کر کے انہوں نے مسلمانوں کی آبرو کا سودا کر دیا ہے اور مذہبی دنیا میں اپنے ناپسندیدہ خیالات اور فاسد عقیدے مسلمان پر تھوپنے کے لئے دولتوں کا استعمال کر کے اسلامی وحدت کا شیرازہ منتشر کر رہے ہیں۔ گنبد خضریٰ پر کندہ کی ہوئی عظمت رسالت اور فضیلت اہل بیت کی ساری حدیثیں کھرچ ڈالی گئیں۔ مسجد حرام اور مسجد نبوی سے ''یا محمد'' کی تختی ہٹادی گئی۔ حجاز و یمن سے اسلامی ادوار کی تمام مقدس یادگاریں مٹادی گئیں اور ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ یادگاروں کو بدعت کہنے والے شاہ سعود، شاہ فیصل اور شاہ فہد کی یادگاریں قائم کر رہے ہیں۔

ابھی حالیہ دنوں میں ابوظہبی، شارجہ، اور دوبئی کے تبلیغی دورے پر میں گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے جگہ جگہ شاہراہوں پر'' شارح عمر بن الخطاب'' اسی طرح ''شارح خالد بن ولید'' وغیرہ اصحاب رسول کے ناموں کی نیم پلیٹیں لگی ہوئیں دیکھیں۔ مگر دوران حج ان بزرگوں کا اپنی سرزمین میں کہیں کوئی نام کندہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ہر جگہ غاصب حکمرانوں ہی کے ناموں کی تختی لگی ہوئی ہے۔

افسوس صد افسوس! جن لوگوں کے اندر ان سرکشوں کو لگام دینے کی قوت تھی وہ چپ سادھے بیٹھے رہے اور ہمارا سینہ جل رہا ہے تو ہمارے بازو میں فتنوں کے سد باب کی طاقت ہی کہاں۔ مگر یہ سچ ہے کہ زبان و قلم کے استعمال سے گریز ہمارے ایمان کو شک کے دائرے میں لاسکتا ہے۔ اور یہ ہماری بربادی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوسکتا ہے۔

زور ہی کیا تھا، جفائے باغباں دیکھا کئے

طریقت کی آڑ سے، شریعت پر حملے

ارشاد رسول ہے- **بنی الاسلام علی خمس** قصر اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج، پانچ مضبوط بنیادوں پر جو اسلام کی مہتم بالشان چار منزلہ عمارت کھڑی ہے اس کی ترتیب اس طرح ہے۔

پہلی منزل-شریعت، دوسری منزل-طریقت، تیسری منزل-معرفت، اور چوتھی منزل-حقیقت۔ کسی بھی عمارت میں دیواریں، چھتیں، کھڑکیاں، جنگلے اور دروازے سبھی اہمیت کے حامل ہیں لیکن جو حیثیت بنیاد کی ہوتی ہے وہ کسی کی نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ پہلی منزل دو خوبیوں کی حامل ہوتی ہے۔ اولاً یہ کہ اس میں داخلے کے لئے زینہ وغیرہ کی مشقتوں سے گذرنا نہیں پڑتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ پہلی منزل کے وجود کے بغیر دوسری، تیسری اور چوتھی منزل کا وجود ناممکن ہے۔ علاوہ ازیں پہلی منزل جتنی مستحکم و پائیدار ہوگی بعد کی منزل کے بقا کی ضمانت اسی اعتبار سے دی جائے گی۔

مسلم گھرانے میں پرورش پانے والا بچہ بھی اتنا ضرور جانتا ہے کہ اسلام کی اصل روح کتاب و سنت ہے، شارع علیہ السلام کے قول، فعل اور عمل کے ذریعہ اور آپ پر نازل ہونے والی وحی الٰہی کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلام میں پہلا درجہ ایمان کا ہے، اس کے بعد شرائع، احکام اور ضروریات دین کا ہے اور احکام شریعت میں سب سے اہم فریضہ نماز ہے۔ پھر تزکیۂ نفس اور باطن کی صفائی کا ہے یعنی شریعت

کے بعد طریقت کا ہے، آئینۂ قلب کی صفائی کے بعد تجلیات کے حصول کی منزل ہے۔ یعنی معرفت پھر خود فنا ہو کر مقصود پا جانے کی منزل ہے۔ یعنی مقام حقیقت۔

یہ چاروں مدارج ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں کہ کوئی بھی ترتیب کی رعایت کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اسے آپ ایک موٹی سی مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک کمرہ ہے، اس کے اندر ایک الماری ہے۔ الماری کے اندر ایک مضبوط تجوری ہے اور اس تجوری میں قیمتی زیورات ہیں۔ زیورات کے طالب کو کمرہ میں داخل ہونا پڑے گا تب ہی وہ الماری پائے گا، الماری کا قفل کھولنا پڑے گا اس کے بعد وہ تجوری دیکھے گا، تجوری میں ہاتھ ڈالنا ہوگا تب ہی وہ زیورات حاصل کر سکے گا اگر کوئی یہ کہے کہ کمرے میں داخل نہیں ہوا اور الماری پا گیا وہ جھوٹا ہے۔ یا یہ کہے کہ الماری کا تالا نہیں کھولا اور تجوری تک رسائی ہوگئی وہ بھی لاغی ہے۔ یا یہ دعوی کرے کہ تجوری کو ہاتھ لگائے بغیر زیورات حاصل ہوگئے، وہ بھی کذاب ہے اگر کوئی یہ دعوی کرے الماری تک رسائی ہو جانے کے بعد اب ہمیں کمرہ کی حاجت باقی نہ رہی تو وہ سب سے بڑا عیار ہے۔

کمرہ شریعت ہے، الماری طریقت ہے، تجوری معرفت ہے اور زیورات حقیقت ہیں۔ اب مجھے کہنے دیجئے کہ جو شریعت کے کمرے میں داخل نہ ہوگا، ہرگز طریقت کی الماری نہ پائے گا۔ طریقت کی الماری سے جو بھی ناآشنا ہوگا کبھی معرفت کی تجوری تک رسائی حاصل نہ کر سکے گا۔

تاجداران طریقت کی زبان سے اس دعوی پر دلیل ملاحظہ فرمائیے۔ مخدوم الملک سیدنا شرف الدین احمد یحیی منیری رضی اللہ عنہ جو بالاتفاق سلطان المحققین ہیں

اپنے ایک مکتوب میں تارک سلطنت بلخ حضرت مولانا سید مظفر شمس بلخی رضی اللہ عنہ کو ہدایت فرماتے ہیں کہ- بھائی مظفر! اگر طریقت کے منزل سے گر جانا تو حدود شریعت میں ضرور رہنا، کیونکہ شریعت سے ہٹے ہوئے کا ٹھکانہ کہیں نہیں ہوتا۔

بحرالعلوم حضرت مولانا جلال الدین رومی رضی اللہ عنہ جن کی عظمت شان کے آگے بڑے بڑوں نے اپنی کلغیاں اتار دی ہیں اور جو بحر طریقت کے بھی غواص تھے، مثنوی شریف میں فرماتے ہیں، آج تک آپ کی مثنوی کے فرمودات کو کوئی چیلنج نہیں کر سکا ہے۔

شریعت را مقدم دار اکنوں
طریقت از شریعت نیست بیروں

(یعنی شریعت کی راہ پر پہلے ثابت قدم ہو جاؤ۔ طریقت دائرۂ شریعت سے باہر کی چیز کا نام نہیں ہے۔)

احترام شریعت :- سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب پاک کے متعلق کوئی بھی شاتم یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت میں سے کوئی منزل بھی ان نفوس قدسیہ سے چھوٹ گئی تھی یا یہ کہ عرفان کے جس مقام تک ہماری رسائی ہے ان کی نہ تھی۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی نماز سے کبھی غفلت نہیں برتی اور کسی نے بھی ہرگز یہ نہیں کہا کہ شریعت کی نماز اور ہے، طریقت کی نماز اور۔ یا یہ کہ ہم معرفتی لوگ ہیں ہم کو مولویوں والی نماز کی ضرورت نہیں، معاذ اللہ!

حدیثوں میں آیا ہے کہ صحابہ کرام کسی برے عمل کو کفر نہیں جانتے تھے سوائے ترک نماز کے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم کو کفر سے ممتاز کرنے

والی چیز نماز ہے۔ واضح رہے کہ ترک نماز اور ہے اور انکار نماز اور۔ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے وہ بے چارے تو اپنے آپ کو گنہگار تصور کرتے ہیں، اور انہیں اپنی غلطی کا اقرار ہے۔ مگر جو بدنصیب نماز کا انکار کرتے ہیں وہ بڑی ڈھٹائی سے اپنا نام معرفتی رکھتے ہیں۔ اور نماز کے متوازی ایک دوسرا طریقہ ایجاد کر کے اس کا نام نماز طریقت رکھتے ہیں۔ یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کا مرتکب اسلامی معاشرے میں جینے کے لائق نہیں ہے ۔لیکن افسوس ہے کہ ایسا دجال ہادی و مرشد مانا جا رہا ہے۔

مشرب صوفیاء :- صوفیاء کے سلاسل میں ایک ولی بھی ایسا نہیں گزرا جس نے شریعت پر اتہام تراش کر نماز سے انکار کیا ہو۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ نے اتباع سنت ہی کو معیار ولایت قرار دیا ہے۔ حضرت مخدوم سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے طریق مصطفیٰ سے انحراف ہی کو گمراہی بتایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

(یعنی پیغمبر کی شریعت کے خلاف جس کسی نے بھی راستہ ڈھونڈا وہ ہرگز بخشش ونجات کی منزل تک راہ نہ پائے گا۔)

وہ صوفیا جو مغلوب الحال ہو چکے تھے، جنہوں نے عالم استغراق میں برسوں گذار دیا وہ مرفوع القلم ہیں ان پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا اور نہ ان کی زندگی ہمارے لئے لائحۂ عمل بن سکتی ہے۔ مگر انہوں نے بھی اپنے کو معرفتی کہہ کر نماز اور دیگر احکام شریعت سے انکار نہیں کیا۔ البتہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر رہے۔

علمائے حق نے مجذوب بزرگ اور مکار صوفی کے درمیان فرق کی بڑی عمدہ

نشاندہی فرمائی ہے اس کسوٹی پر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مست فقیر اور مغلوب الحال ولی ہوگا تو وہ کبھی شریعت کے مقابلے پر اپنے اعمال کی تاویل نہ پیش کرے گا اور اگر کوئی اسے خلاف شریعت کام پر ٹوکے گا تو بس وہ خبط اور خاموش نظر آئیگا۔ یا حکم شریعت کے آگے سپر ڈال دے گا۔ جیسا کہ حضرت شیخ بو علی قلندر پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حضرت قاضی ضیاء الدین پانی پتی قینچی لیکر پہونچے اور فرمایا کہ آپ کی مونچھیں بہت نیچے تک لٹک آئی ہیں جو خلاف شرع ہیں میں ان کو سنت کے مطابق کر دیتا ہوں انہوں نے تراش دیں تو آپ ان بالوں کو چومنے لگے۔ لوگوں نے تعجب سے کہا حضور! یہ کیا معاملہ ہے، فرمایا یہ بال اتباع سنت میں تراشے گئے ہیں اس لئے بے شک چومنے کے قابل ہیں۔ ایسی ہی ایک دوسری مثال ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت سرمد شہید مسجد کے دروازے پر برہنہ بیٹھے تھے سلطان اورنگ زیب عالمگیر نماز کیلئے مسجد جاتے ہوئے جب انہیں اس حال میں دیکھا تو خفا ہو کر بولے۔ ایک تو آپ نماز نہیں پڑھتے ہیں اور مسجد کے دروازے پر برہنہ بیٹھے ہیں، حضرت سرمد نے یہ نہیں کہا کہ میں اہل معرفت میں سے ہوں شریعت کی نماز کیوں پڑھوں بلکہ اقرار جرم کے طور پر فرمایا کیا کہوں، شیطان بہت قوی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ملا عبد القوی جو بادشاہ کے ہمراہ تھے چراغ پا ہو گئے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ انہیں کے اکسانے پر بادشاہ نے یہ جملہ کہا تھا۔

لیکن آج خدا کی پناہ! مکار صوفی اور ڈھونگی پیروں کو اسکی بد اعمالی اور بے راہ روی پر شریعت کی لگام دینا چاہو تو ایک ہزار تاویل گڑھے گا۔ اور اپنے کو خدا رسیدہ قرار دے کر شریعت سے آزاد ثابت کرنے میں سارا زور صرف کر دے گا۔ اور اگر وہ عمل صفلی اور تسخیر جانتا ہو گا تو کرتب دکھا دکھا کر جاہلوں سے اپنی بزرگی کا ڈھنڈورا پٹوائے گا۔

شریعت کا حکم - ہر عاقل بالغ مومن مسلم کے لئے واجب العمل ہے۔ کسی کلمہ گو کو مجال انکار نہیں اور کوئی بھی شخص شریعت کی خلاف ورزی کرنے کے بعد قابل اتباع نہیں۔ جو علانیہ نافرمانی کرے گا گناہگار رہوگا، اور صریحاً انکار کرے کافر قرار پائے گا۔

طریقت کے اصول ہر اس شخص کے لئے ہیں جو علم باطن کا متلاشی ہو اور طلب صادق رکھتا ہو شریعت کی پابندی کے بعد ہی اس راہ کے مسافر کا ہر قدم اس کے لئے نفع بخش ہے، متبع شریعت پیر ہی اس راہ کی لذتوں سے آشنا ہو کر دوسروں کو منزل کا پتہ بتا سکتا ہے۔ ہر شخص اس کا مکلّف نہیں مگر تصوف وطریقت کو واہمہ اور سفسطہ قرار دینے والا گمراہ ضرور ہے۔ معرفت کی منزل - یہ خواص اہل اللہ کی منزل ہے۔ جس عاشق کا سوز وگداز، تلاش حق کی کٹھن راہ سے اسے ثابت قدم گزار دے وہی اس مقام تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، سالکین کا اصل مطلوب ومقصود یہی ہے۔ عوام الناس اس راہ کی حقیقتوں کا ادراک نہیں کر سکتے۔

حقیقت کا حال - یہ مقام صدیقین کا ہے، بڑے بڑے اس مقام تک رسائی کے لئے سرگرداں نظر آتے ہیں، شریعت کا جو باغی اپنے کو حقیقت آشنا بتائے وہ حقیقت میں قرب قیامت کے دجالوں میں سے ایک ہے۔ حقیقت وہ منزل جہاں پہونچنے کے بعد بندہ لب نہیں کھول سکتا۔ حضرت مخدوم سعدی فرماتے ہیں ع
کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد ——— یعنی واصل بحق ہونے کے بعد کوئی بھی اپنی کیفیت بیان نہی کر سکا ہے۔ ہم گناہ گاروں کے لئے شریعت ہی حد ہے اور اگر خدا طلب کی توفیق عطا فرمائے تو طریقت بس ہے۔

☆☆☆

دیکھ اپنی سادگی، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

آج سواد اعظم اہل سنت میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو اپنے ہی ہاتھوں اپنا گھیرا تنگ کرنے میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں انہیں قطعاً اس کی کوئی فکر نہیں ہے کہ ہمارے ہی ہم مشرب ہم سے دور کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ انہیں اس کا بھی کوئی ملال نہیں ہے کہ ہماری نفری ٹوٹ کیوں رہی ہے اور دن بدن ہمارے اندر بکھراؤ کیوں آ رہا ہے۔ انہیں اس بات کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ دانشور طبقہ پر ہماری گرفت ڈھیلی کیوں پڑ گئی ہے، ملک کا سیاسی حلقہ ہم سے غیر مانوس کیوں ہو گیا ہے۔ اسکول، کالج اور یونیورسیٹی کے طلباء ہماری دسترس سے باہر کیوں ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ خود ہمارے گھروں کے لڑکے جب ان تعلیمی اداروں کا رخ کرتے ہیں تو ان پر غیروں کی چھاپ گہری کیوں اتر جاتی ہے۔

تعلیمی مراحل میں ہی معتقدات کے پیمانے بدل جانے کے جو خطرناک نتائج سامنے آنے چاہئیں وہ آ رہے ہیں۔ دیدۂ عبرت نگاہ ہو تو دیکھئے۔ مدرسہ بورڈ کی کرسی پر ہم نہیں ہیں۔ سنی وقف بورڈ کے چیئرمین ہم نہیں دیکھے جاتے۔ اردو اکیڈمی کی خالی مسند پر ہم نہیں بٹھائے جاتے۔ بورڈ کے مدارس کے انٹرویو میں ہمارا آدمی آبزرور منتخب نہیں ہوتا۔ گورمنٹ اردو لائبریریوں میں نہ ہم ہیں اور نہ ہماری کتابیں۔ اخبارات نہ ہمارے ہیں اور نہ اخباری دفاتر میں ہم ہیں۔ صدیوں پرانی سنی مسجدیں وقف بورڈ میں چلی گئیں تو انتظامیہ اور امام کوئی اور ہے۔ سنی امراء کے تعمیر کردہ علمی ادارے؛ مدرسہ بورڈ میں دیدئے

گئے ہیں تو اس پر حکمرانی غیروں کی ہے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ مدرسہ عزیزیہ بہار شریف، مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد اور اسی طرح کے درجنوں ادارے اس کا روشن ثبوت ہیں۔

اتنا ہی نہیں، ایسی تمام سنی مسجدیں جن کے تحت میں مارکیٹ اور دوکانیں ہیں اور جواب خود کفیل بن چکی ہیں۔ ان کے لئے دشمن سازش رچ رہے ہیں کہ کسی حیلے سے وقف بورڈ کے حوالے ہو جائیں۔ نیت ظاہر ہے۔ وقف بورڈ میں وہ خود بیٹھے ہیں۔ ڈی سی ان کا آدمی ہے۔ وکلاء ان کے ہم خیال ہیں۔ کورٹ میں عدالت کی کرسی پر وہی دیکھے جا رہے ہیں۔ ایس، ڈی، او ان ہی کا ہم مزاج ہے۔ پولس محکمہ ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ بورڈ میں چلی جانے کے بعد کوئی ہماری یہ آواز سننے کو تیار نہیں ہوگا کہ اس مسجد میں صرف میلاد پڑھنے والے اور میلاد سننے والے ہی نماز پڑھتے ہیں۔

''یہ مسجد بریلوی مسلک کی ہے'' یہ بورڈ لگا کر تبلیغی جماعت کو تو مسجد میں گھسنے سے روکا جا سکتا ہے۔ مگر وقف بورڈ کی کمیٹی کو مسلط ہونے سے نہیں روکا جا سکتا۔ میری نظر میں ایسی کئی مسجدیں ہیں جہاں وقف بورڈ کی کمیٹی چارج لینے کے لئے پہونچ چکی تھی مگر وہاں کے مقتدی مرنے کٹنے پر آمادہ ہو گئے۔ نتیجتاً وہاں کے غیر مسلم ڈی، ایم نے وقف بورڈ کے چیئرمین کو جواب لکھا کہ یہاں کے عوام موجودہ انتظامیہ سے مطمئن ہیں۔ لہٰذا ہم آپ کی کمیٹی کو چارج دلا کر بدامنی پیدا نہیں کر سکتے۔ یہی صورت حال (ڈالٹین گنج) جامع مسجد میں بھی پیش آئی تھی مگر وہاں کا ڈی، سی بنام مسلم بدبودار تبلیغی تھا، اس نے مسجد میں فورس بٹھا کر وقف بورڈ کی کمیٹی کو چارج دلوایا اور گریبان پکڑ کر رضوی امام کو مسجد سے باہر کیا۔ وہ تو بہادر پٹھان تھا جو آخر وقت تک ڈٹا رہا، دوسرا امام ہوتا تو پہلی ہی گھڑی میں بھاگ کھڑا ہوتا۔

اس حادثہ میں ایک سنی جوان کی جان بھی گئی مگر کوئی اس ظالم ڈی، سی سے بدلہ لینے والا سامنے نہیں آیا کمیٹی والوں نے عوام کو قابو میں رکھنے کیلئے ٹکے سیر کے میلادی سنی کو امام مقرر کیا۔ اور جب لوگوں کے جذبات سر پڑ گئے تو چھ۶/ماہ بعد اسے کھسکا کر ایک غالی دیوبندی کو لاکر مصلی امامت پر بیٹھا دیا۔ جو ابتک قابض ہے۔

دیکھا اپنی سادگی، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

بڑی مسجد ڈالین گنج، اقراء مسجد رانچی، بارہ پتھر مسجد ڈہری، مونا مسجد چھپرہ، جامع مسجد گیا، اور شاہی مساجد بہار شریف۔ صحیح العقیدہ سنی مسلمانوں کی ملکیت ہیں ان کی تعمیرات پر اہل سنت کا سرمایہ خرچ ہوا ہے۔ لیکن مذکورہ محکمون کے بل بوتے پر غیروں کا غاصبانہ قبضہ دیرپا ہے۔ یہ تو ہمارے سامنے کی مثالیں ہیں اگر پورے ملک کی فہرست تیار کی جائے تو دفتر درکار ہے۔

کیا اپنوں کے ایمان وعقیدے کی پیمائش اور گرما گرم نعروں کے علاوہ ہمارا اور کوئی کام نہیں رہ گیا ہے۔ ہواؤں کے رخ پھیرنے کے لئے ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کٹتی ہوئی شاخ پر بیٹھ کر میٹھی نیند لینا دانشمندی نہیں ہے۔ شاخ کاٹنے والے کے ہاتھ سے کٹار چھین لینا بقائے دوام کی ضمانت ہے۔ کاش! ہماری جماعت کو ہوش آجاتا اور وہ متحد ہو کر ملکی سطح پر ایسا کوئی لائحہ عمل مرتب کرتے کہ زندگی کے ہر شعبہ حیات میں ہماری بھی نمائندگی ہو پاتی۔

موجودہ دور میں، سواد اعظم اہل سنت ابتلاء وآزمائش کے پرخطر وادی سے گذر رہے ہیں۔ جماعت کے سرکردہ افراد آپسی تنازع کے دلدل میں قدم ڈال چکے ہیں۔ اور

ان کے متبعین عقیدت کی آڑ میں پوری جماعت کو اسی دلدل میں ڈھکیل دینا چاہتے ہیں۔آہ ! آج ہمارے درمیان حضور مفتی اعظم ہند جلوہ بار نہیں ہیں جو درد کا درماں ثابت ہوں۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ عرس اعلی حضرت میں اہل سنت کے اکابر اکٹھا تھے۔ حضور سید العلماء کی موجودگی میں حضرت مجاہد ملت نے مفتی اعظم سے عرض کیا قل کے وقت میں اسٹیج پر نہیں جاؤں گا۔مفتی اعظم نے پوچھا ایسا کیوں؟ عرض کیا، مولانا عبد المصطفی اعظمی اسٹیج پر ہیں۔ میں ان کے ساتھ اسٹیج پر نہیں بیٹھ سکتا۔ بنارس کے جلسہ میں انہوں نے قرآن کو اللہ کی بنائی ہوئی کتاب کہا۔ میں نے اس جملے سے رجوع کرنے کو کہا تو مجھی سے الجھ پڑے۔ سرکار مفتی اعظم نے فوراً اعظمی صاحب کو طلب فرمایا۔ وہ حاضر ہوئے۔ پوچھا گیا، آپ نے قرآن کو اللہ کی بنائی ہوئی کتاب کہا ہے۔انہوں نے عرض کیا حضور ہاں، مفتی اعظم نے فرمایا ایسا کہنا درست نہیں ہے۔آپ توبہ کیجئے۔ انہوں نے اسی وقت توبہ اور رجوع فرمالیا۔آن کی آن میں سارا قصہ ختم۔

کاش! آج بھی کوئی مفتی اعظم جیسا اثر رکھنے والا ہوتا۔اور ہر خرد وکلاں پر اس کی پکڑ ہوتی تو جماعت طوائف الملوکی کی شکار نہ ہوتی اور ہر طرف خودسری کی ہوا نہ بہتی۔المیہ یہ نہیں ہے کہ آج بہتوں کو مرکز کا خواب نظر آرہا ہے المیہ یہ ہے کہ آج کوئی بھی مرکزی شخصیت نہیں ہے۔مرکز تو وہ ہیں جہاں پہونچ کر سارے قضیے ختم ہو جائیں۔اور جماعت کی گتھی سلجھ جائے۔

ہر روز ایک نیا مسئلہ ہماری راہ میں کانٹا نظر آرہا ہے۔ پہلے پورے ہندوستان کے لئے حج ہاؤس بمبئی میں تھا اب بہار کے لئے حج ہاؤس راجدھانی پٹنہ میں ہے۔جھارکھنڈ کے

لئے حج ہاؤس راجدھانی رانچی میں ہے۔ہر ریاست میں ایک حج ہاؤس کا نشانہ ہے۔یہ سارے حج ہاؤس غیروں کے ہاتھ میں ہیں۔حج کمیٹی ان ہی کے گھر میں ہے۔امیر الحجاج وہی بنائے جارہے ہیں حجاج کرام ان ہی کی ٹریننگ میں ارکان حج سیکھ رہے ہیں۔

انہیں زیارت گاہوں کے آداب نہیں بتائے گئے۔حرم نبوی کا احترام نہیں سکھایا گیا۔ بارگاہ نبوی میں حاضری کے سلیقے نہیں سمجھائے گئے۔حجاج جب وہاں پہونچ گئے تو نجدی سوداگروں نے انہیں آگھیرا۔اور اپنی سی کہنے لگے۔حاجیوں میں اکثر جاہل اور کم پڑھے لکھے ہی ہوتے ہیں۔انہوں نے وہی کیا جو سعودی دلالوں نے انہیں بتایا۔آئے دن مشاہدے میں یہ بات آرہی ہے کہ سنی رسم وراہ کے پابند حج کو گئے تھے۔اور واپس ہوئے ہیں تو وہابی مشن کے سرگرم ممبر دیکھے جارہے ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ حج کا شوق جوں جوں بڑھ رہا ہے، بدعقیدگی کا شجر ممنوعہ برگ وبار لا رہا ہے۔کیا اس کے تدارک کے لئے کسی تدبیر کی ضرورت نہیں ہے۔اور گمرہی کے اس دروازے پر پہرا بٹھانے کے لئے ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہئے۔ہائے افسوس کشتی امت کے ان بکھرتے تختوں پر ہماری نگاہ نہیں جاتی۔ہم اسی میں مگن ہیں کہ اونگھتے ہوئے اپنے کئی ساتھیوں کو دریا میں ڈھکیلنے میں کامیاب ہوگئے۔قصور ان کا صرف اتنا تھا کہ سنیت کی کشتی پر سوار ہوتے ہوئے بھی ذرا اونگھ گئے تھے۔

دیکھ اپنی سادگی، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

شاید اس تازہ ترین فتنے سے آپ بے خبر نہیں ہونگے کہ آج کل سعودیہ سے لوٹ کر آنے والے نوجوان غالی قسم کے غیر مقلد بن کر آرہے ہیں۔یہاں آنے کے بعد وہ اپنے

ساتھیوں کو اپنے دوستوں کو یہ کہہ کر اپنا ہمنوا بنا رہے ہیں کہ سعودی عرب بھیج دیں گے روزگار کھڑا کر دیں گے، سرکاری سروس کے لئے رقم ہم ادا کر دیں گے۔ بس تم ہمارے ساتھ آجاؤ۔ نماز میں پیر پھیلاؤ، ہاتھ جھاڑو۔ آمین کا شور برپا کرو، ٹوپی اتار دو۔ دعا چھوڑ دو۔

عیش دنیا کی خاطر دوستوں نے یہ گوارا کر لیا۔ پھر کیا تھا، مسلک اعلی حضرت کا نعرہ خود ہی بھول بیٹھے سلام و قیام سے بھی بدکنے لگے۔ جس امام کی دست بوسی کرتے تھے راہ چلتے ان سے کترا کر گذرنے لگے۔ ابھی ۲۹؍ مارچ ۲۰۰۸ء کو میں کوئیلور ضلع آرہ کے ایک جلسے میں گیا تھا، فاضل جلیل حضرت مولانا داؤد حسین اشرفی مصباحی مرحوم بھی تشریف لائے تھے۔ منتظمین جلسہ نے اپنے شہر کی یہ داستان غم سنائی اور جلسہ کرنے کی یہی غرض وغایت بتائی۔

اللہ تعالی اپنے جوارِ رحمت جگہ عنایت فرمائے مولانا داؤد حسین مصباحی کو۔ وہ ایک درسی عالم ہیں۔ عالمانہ تقریر کرتے ہیں۔ غیر مقلدین کا رد بلیغ فرمایا۔ اور تمام مسائل کو احناف کے دلائل سے واضح فرمایا۔ آخری میں راقم الحروف نے مولانا کے پورے بیان کی نہایت دل پذیر شرح کر ڈالی۔ لیکن یہ ایک رات کی کاروائی تھی اور وہ شب و روز اس دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ لہذا ہمیں کہنے دیجئے کہ دفاعی تدبیر کے لئے یہ عمل کافی نہیں ہے۔ جو لوگ اپنوں کی کردارکشی کو توشۂ آخرت تصور کر رہے ہیں انہیں روز حساب اپنی ان کوتاہیوں کے لئے بھی جواب دہ ہونا پڑے گا۔

جس شخص کا حال یہ ہو کہ بدعقیدہ آکر پہلو میں کھڑا ہو جائے تو وہ صف سے باہر نکل آئے۔ اسے وہابیوں کے پیچھے نماز پڑھ لینے والا کہتے ہوئے خدا کا خوف آڑے نہیں

آیا؟ جس شخص کا مزاج یہ ہو کہ راہ چلتے کوئی بدعقیدہ سامنے آجائے تو وہ رخ پھیر کر تیز گزر جاتا ہو اسے دیوبندیوں کا ہم نشین و ہم جلیس کہتے ہوئے غیرت دامن گیر نہیں ہوئی؟ ہم ایسے اتہام کسی پر لگانے سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں۔ جو گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر تخریب کاری اور اپنوں پر بہتان تراشی کو دین کی بڑی خدمت سمجھتے ہیں انہیں اس طرح کے اقدامات مبارک ہوں۔ میں تو ایسے مخدوش ماحول میں دین وسنیت کا چراغ جلا رہا ہوں، جہاں مجھے قیام حی علی الفلاح اور بعد فجر صلاۃ وسلام جاری کرنے پر نیا دین گڑھنے والا کہا گیا۔ اور مختلف محلوں سے غول بنا بنا کر اسے بند کرانے کے لئے مہینوں لوگ آتے رہے۔ مگر میں اپنی ڈگر پر ثابت قدم رہا۔ اور آج الحمدللہ شہر کی ۱۲؍ مسجدیں ہمارے ماتحت ہیں۔

جمیعۃ العلماء ہند، دیوبندیوں کی ایک پائیدار تنظیم ہے۔ ملک کی تمام ریاستوں میں اس کی شاخیں قائم ہیں اس تنظیم نے مسلمانوں کے کچھ مطالبات بھی حکومت ہند سے منوائے ہیں۔ اور گاہے گاہے مسلم مسائل کے لئے ایوان میں آواز بھی اٹھاتی رہتی ہے لیکن قوم کو فائدہ پہونچانے سے کہیں زیادہ اس تنظیم کے ذمہ داروں نے تنظیم سے ذاتی نفع حاصل کیا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اس تنظیم کے صدر بننے کے بعد پارلیا منٹ پہونچے۔ مولانا اسعد مدنی کو تنظیم کی صدارت پر قبضہ ملا تو پارلیا منٹ کی کرسی ہاتھ لگی اور جناب کے صاحبزادے مولانا محمود مدنی اسی تنظیم کی بیساکھی کے سہارے پارلیامنٹ کے دروازے تک پہونچ گئے۔

بہتوں کو یاد ہوگا، اسی تنظیم کے جھنڈے کے نیچے مولانا اسعد مدنی صاحب نے ''ملک وملت بچاؤ'' تحریک چلائی تھی اور ملک کے مختلف بلاد وامصار سے کروروں روپے

اکٹھا کئے تھے۔مگر اندرا گاندھی کی صرف ایک گھڑکی پر راتوں رات تحریک واپس لے کر چپکی سادھ لی تھی۔ملک وملت بچاؤ کے نام پر وصول کی جانیوالی رقوم کا مصرف آج تک قوم کو معلوم نہ ہوسکا۔کلکتہ وغیرہ کے اخبارات نے اس پر کافی لے دے بھی مچائی تھی۔

گھڑکی یہ تھی کہ مہتمم دارالعلوم دیوبند قاری محمد طیب صاحب کو بے دخل کر کے دارالعلوم پر جو قبضہ تمہیں دلایا گیا ہے وہ واپس بھی ہوسکتا ہے۔بس یہ حربہ تحریک کی واپسی کے لئے کافی ثابت ہوا۔دراصل کروروں روپے تھیلی میں بھر لینے کے بعد اسے ٹھکانے لگانے کی فکر تو تھی ہی اس کے لئے یہ سنہرا موقع ہاتھ آ گیا۔

خداوندا ، یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے ، سلطانی بھی عیاری

آج اسی تنظیم کی کرسی صدارت کے لئے چچا، بھتیجے میں ہاتھا پائی چل رہی ہے۔اور دونوں اپنے اپنے طور پر طاقتوں کا مظاہرہ کرنے پر جٹے ہوئے ہیں۔ایک جامع شاہجہانی دہلی میں دہشت گرد مخالف کانفرنس کر رہا ہے۔تو دوسرا دہلی کے رام لیلا میدان میں دہشت گردی کے خلاف ریلی نکال رہا ہے۔ایک گیا شہر میں اپنی حسب خواہ صوبائی تنظیم قائم کرنے کے لئے میٹنگ طلب کر رہا ہے تو دوسرا راجدھانی پٹنہ میں سیاسی کھلاڑیوں کی بھیڑ لگا کر کانفرنس کر رہا ہے۔جو کام اب تک ایک پلیٹ فارم سے ہو رہا تھا اب دو پلیٹ فارموں سے ہو رہا ہے۔یعنی ہر ایک عوام کے رجحان کا رخ اپنی طرف موڑنے کے لئے سرگرم عمل ہے۔اور تنظیم چلانے کی اہلیت ثابت کرنے کے لئے پوری طرح کوشاں ہے۔لیکن اس صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اس کے لئے

زور آزمائی کا راستہ اپنایا گیا ہے،کردارکشی کی راہ اختیار نہیں کی گئی ہے۔

ہائے افسوس! ہماری جماعت میں اب یہ احساس مر چکا ہے۔دوسروں کو دیکھ کر بھی ہمارا احساس نہیں جاگتا۔ہم کام کے ذریعہ نہیں دوسروں کی کردارکشی کر کے اپنی برتری ثابت کرنا چاہتے ہیں۔اب ہم اپنے دامن کا داغ چھپانے کے لئے دوسروں کا دامن آلودہ کر دینا بڑی کامیابی سمجھنے لگے ہیں۔اوروں کا کام دیکھ کر اپنی کاہلی دور کرنے کا ہم کو کبھی خیال تک نہیں آتا۔حضور حافظ ملت کا یہ فرمان ”ہر مخالفت کا جواب کام ہے“ اگر ہم نشان راہ بنالیں تو ہم کاموں کے سہارے بہت جلد دوسروں کے دوش بدوش کھڑے ہو سکتے ہیں۔اور خدمات کی بنیاد پر سارے زمانے سے اپنی شخصیت کا لوہا منوا سکتے ہیں۔

ع دیکھ اپنی سادگی،اوروں کی عیاری بھی دیکھ

☆

ایک غلط فہمی کا ازالہ

میرا ایک مضمون بعنوان ”بے شک بریلوی کوئی فرقہ نہیں“ کچھ دن پہلے شائع ہوا تھا۔اگر کوئی بضد ہے کہ بریلوی ایک فرقہ ہے تو آج بھی میں اس سے اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں۔ہاں! مسلک اعلیٰ حضرت جو شاہراہ سنیت کا ایک تعبیری نام ہے۔اس سے اتفاق کی بناء پر اگر کوئی مجھے بریلوی کہتا ہے تو اس سے انکار بھی نہیں کہ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ میں دیوبندی، وہابی، غیر مقلد اور صلح کلی نہیں۔اگر چہ میں خود کو فخراً بریلوی نہیں کہتا۔

مسلک ومشرب میں اتحاد ہونے کے باوجود صرف لفظ بریلوی کو تفریق کا سبب بنانا اور جو لوگ اپنے خاندانی اعزاز کی بناء پر یہ لفظ اپنے لئے قبول نہیں کرتے

انہیں اپنے سے الگ رکھنے کی کوشش کرنا، اپنی جماعتی ساکھ کو نقصان پہونچانا ہے۔ اسی معنی کر میں نے لکھا تھا کہ ’’جن لوگوں کے خاندان ہمیشہ سے گمنام رہے وہ لوگ تو اس لفظ پر ناز کرنے لگے‘‘ اس جملے سے میری مراد وہ لوگ تھے جن کے دادا کسان تھے اور پوتا مفتی بن گئے۔ خاندان اعلی حضرت کو مراد لینے کا یہ کوئی محل نہیں ہے۔ اعلی حضرت کے اسلاف تو کیا، اخلاف بھی میرے تصور میں کبھی نہیں آئے۔

لیکن ایک فاضل مضمون نگار کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے لکھ مارا کہ ’’سید صاحب خود ہی فرمائیں کہ انہوں نے کتنی بڑی بات کہدی، بھلا خانوادۂ رضا کس دور میں گمنام رہا‘‘ تعجب ہے کہ زیرک ودانا ہوکر وہ توجیہ القول مالا یرضیٰ بہ القائل کی غلطی کیوں کر بیٹھے موصوف میرے مخلصین میں نہ ہوتے تو میں گمان کرتا کہ انہوں نے بالقصد یہ اعتراض گڑھا ہے۔ اس لئے میں کسی صفائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کیوں کہ بحث وتکرار میری عادت نہیں۔ ان کے خلوص کو نظر میں رکھ کر برائے کشادگی قلب یہ چند سطریں تحریر کی گئیں۔

دشمنوں سے بھی گلہ جاتا رہا
دوست ہم پر وہ کرم فرما گئے

☆☆☆

تنظیم و جماعت کی اہمیت

ہمارے یہاں اجتماعی کاموں کی کوئی قدر نہیں۔کوئی کسی کی بالادستی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے من کا راجہ اور اپنی مرضی کا سلطان ہے۔اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ جب کچھ لوگوں کو تنظیم و جماعت کی ہمہ گیری کا احساس ہوتا ہے اور یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ کام ذاتی پلیٹ فارم سے نہیں ہوسکتا۔اس کے لئے تنظیم و جماعت کا سہارا ضروری ہے تو جماعت کی تشکیل کے لئے ایسے حواریوں کی تلاش شروع کردیتے ہیں۔جو ان کے قدم بقدم چل سکیں اور ان کی ہر بات پر لبیک کہیں۔ کسی بھی مرحلے میں کبھی اختلاف رائے یا ردوانکار نہ کرسکیں تاکہ جناب کی انا اور مزاج خودسری کو کوئی ٹھیس نہ پہونچے۔ میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح کی کارروائیوں کو کچھ بھی نام دیا سکتا ہے مگر اسے ہرگز جماعتی تنظیم کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے۔کیونکہ تنظیم و جماعت ہمیشہ کسی دستور اساسی اور نصب العین کے تحت چلا کرتی ہے۔فرد واحد کی مرضی کے تابع نہیں ہوا کرتی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ حمایت حق کے جذبے کے تحت،یا باطل نظریات کی پاسداری میں کوئی شخص کسی تحریک کو جنم دے تو اسے ضرور یہ حق پہونچتا ہے کہ اپنے گرد اپنی طبیعت کے افراد کو جمع کرے اور ان کی مدد سے اپنی تحریک کو آگے بڑھائے۔ اور اختلاف فکروعمل کی صورت میں کسی کو بھی اپنی تحریک سے علاحدہ کردے۔جیسا کہ

مولوی محمد الیاس کاندھلوی نے تبلیغی جماعت کی تحریک چلائی اور اپنی طبیعت کے لوگوں کو اکٹھا کیا۔جن میں مولانا احتشام الحسن تھانوی بھی شامل تھے۔جب انہوں نے جماعت کے ریا اور مکر کے طریقے سے اختلاف برتا تو فوراً تحریک سے علاحدہ کردیئے گئے۔ تفصیلات کے لئے علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی کتاب تبلیغی جماعت دیکھئے۔

اسی طرح اقامت دین کے نام پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے نام نہاد، جماعت اسلامی،قائم کی اور اپنی طرح آزادی فکر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اشخاص کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی تحریک کا ممبر بنایا۔جن میں مولانا محمد کوثر نیازی بھی صف اول میں تھے۔لیکن جب مودودی صاحب کا بدمست قلم،اسلاف کی سرحدوں کو پھلانگتا ہوا ،اصحاب رسول کے حجاب عظمت تک جا پہونچا تو نیازی صاحب نے اسے لگام دینے کی کوشش کی جس کی پاداش میں وہ تحریک جماعت اسلامی سے نکال دیئے گئے۔ تفصیلات معلوم کرنے کے لئے حضرت علامہ ارشد القادری کی کتاب ''جماعت اسلامی'' کا مطالعہ کیجئے۔

لیکن جب ہم اختراعی فکر کے ساتھ کوئی تحریک لے کر نہیں اٹھے ہیں۔بلکہ سواد اعظم کی کسی اہم ضرورت کو سامنے رکھ کر کسی تنظیم کی تشکیل چاہتے ہیں تو ہم کو قطعاً یہ حق نہیں پہونچتا کہ ہم جماعت کے ارباب حل وعقد کو یکسر نظرانداز کردیں اور ان کے قیمتی مشوروں کی کوئی ضرورت ہی نہ سمجھیں۔یہاں ہم یہ واضح کردینا چاہتے ہیں کہ حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ پر ان کی حیات میں کچھ لوگ یہ الزام عائد کرتے تھے کہ اپنے اداروں میں کسی کو دخیل دیکھنا پسند نہیں کرتے ہیں اور ہر کام ڈکٹیٹرانہ طور پر انجام دیتے ہیں۔ہم جواباً صرف اتنا عرض کریں گے کہ ''رموز مملکت خویش خسرواں دانند'' کے

اصول پر ہر ادارے کا بانی و سربراہ اپنے ادارے کے نفع ونقصان کے پہلو کو خود بہتر جانتا ہے۔اور اپنے صواب دید پر کام کرتا ہے۔جامعہ فیض العلوم جمشید پور سے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی تک اپنے تحت کے تمام اداروں پر وہ اپنی گرفت اسی لئے مضبوط رکھتے تھے۔لیکن جب انہوں نے ادارہ شرعیہ بہار کے قیام کا ارادہ فرمایا تو چونکہ اس کے پیچھے سواد اعظم اہل سنت کے اہم دینی تقاضوں کی تکمیل کا منصوبہ تھا،اس لئے بنگال سے گجرات تک اور اڑیسہ سے آسام تک بشمول حضور مفتی اعظم ہند تمام اکابر و مشاہیر اہل سنت کو مئی ۱۹۶۸ء میں بہار صوبائی سنی کانفرنس کے نام پر سیوان میں جمع فرمایا۔

اسی موقع پر ادارہ کے لئے نام کی تجویز پیش ہوئی اور ایک کم حیثیت بزرگ مولانا قیس محمد خاں شمس آبادی کا منتخب کردہ نام ''ادارۂ شرعیہ'' اتفاق رائے سے منظور کرلیا گیا۔اسی موقع پر قاضی کے حدود وعمل متعین کئے گئے۔اسی موقع پر قضائے قاضی کے نفاذ کی صورتیں اقوال فقہا کی روشنی میں ترتیب دی گئیں۔اسی موقع پر مشاہیر علماء پر مشتمل ایک نگراں بورڈ کا انتخاب عمل میں آیا۔اور بورڈ کے صدر اعلی کے لئے ''امین شریعت'' کا لفظ اتفاق رائے سے پسند کیا گیا۔ان ساری کارروائیوں کو قلم بند کرنے کے بعد اکابرین کے دستخطوں سے مزین کر کے اسے ایک دستاویز کی شکل دی گئی۔چونکہ ادارہ شرعیہ کا دائرہ عمل کل ہند نہیں بلکہ صوبائی رکھا گیا تھا۔اس لئے کلیدی عہدوں پر بہار ہی کے علماء فائز کئے گئے۔حضرت مولانا مفتی شاہ رفاقت حسین صاحب اشرفی ،صدر اعلی اور امین شریعت نامزد ہوئے۔حضرت مولانا مفتی محمد انیس عالم صاحب مجیبی نائب امین شریعت اور نائب صدر منتخب ہوئے اور حضرت علامہ ارشد القادری کو ناظم عمومی کا عہدہ تفویض ہوا۔ بقیہ ممبران منجملہ ہوئے۔گیارہ افراد پر مشتمل علماء بورڈ تشکیل پایا۔

دیکھا آپ نے ،ادارے کا دائرہ عمل اگر چہ بہار تک محدود رکھا گیا تھا۔مگر

مسائل کے حل کے لئے ملک بھر کے تمام ارباب حل وعقد کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی دعوت دی گئی تھی۔اور ان سے متفقہ فیصلہ لیا گیا تھا۔کیونکہ یہ صرف بہار کے مسلمانوں کے مسائل نہیں ۔پوری امت مسلمہ کے مسائل تھے۔اسی کا ثمرہ تھا کہ میں نے اپنے دور اہتمام میں متعدد ڈاک ایسی بھی دیکھی جس پر فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد شریف الحق امجدی اور بحر العلوم حضرت مولانا مفتی عبد المنان اعظمی کے قلم کی یہ تحریر تھی کہ ''آپ کا مسئلہ دار الافتاء سے تعلق نہیں رکھتا،اس کا تعلق دار القضا سے ہے۔اور اس کام کے لئے پورے ملک میں صرف ایک ادارہ ہے۔آپ ادارہ شرعیہ سلطان گنج ،پٹنہ سے رجوع کیجئے''۔

ستمبر ۱۹۷۴ء میں میرا جمشید پور جانا ہوا۔ان دنوں میں جامعہ شرفیہ عماد پور ،رفیع گنج کی خدمات پر مامور تھا۔جمشید پور پہونچنے پر معلوم ہوا کہ حضرت علامہ ارشد القادری صاحب لندن سے چودہ ماہ بعد ہفتہ عشرہ قبل جمشید پور تشریف لا چکے ہیں۔ان سے میرے خوشگوار تعلقات پہلے ہی سے تھے۔خیال ہوا کہ چل کر ملاقات کرلیں۔آزاد نگر سے فیض العلوم دھتکی ڈیہہ پہونچا۔حضرت علامہ باہری کمرے میں منہ پر رومال رکھے لیٹے تھے اور دولڑکے پاؤں دبا رہے تھے۔میں نے نیند میں خلل ڈالنا مناسب نہ جانا اور باہر کچھ دیر ٹھہر کر انتظار کرلینا بہتر سمجھا۔

جونہی دروازے کی طرف واپس ہوا علامہ نے معمولی آہٹ پر پوچھا،کون؟ کمرے میں کسی قدر اندھیرا تھا میں نے کہا،سید رکن الدین اصدق۔میرا نام سنتے ہی ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے۔اور سلام ودعا کے بعد فرمایا،سبحان اللہ! آپ کو اللہ تعالیٰ نے بڑے وقت پر بھیج دیا۔یہ جملے میری حیرانی کا سبب بنے۔میں دل ہی دل میں پریشان تھا کہ آپ کے فرمانے کا مطلب کیا ہے۔آپ نے بھی اس نزاکت کو محسوس کیا۔اور طلباء کو

رخصت کر کے مجھ سے قریب ہو کر فرمایا۔

سید صاحب! آپ یقین مانئے، میری چودہ ماہ کی غیر حاضری میں ظالموں نے ادارۂ شرعیہ پٹنہ کو نزع کی حالت میں پہونچا دیا ہے۔ مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جماعت اسلامی والوں نے یہ پلان تیار کر لیا تھا کہ بند پڑی عمارت کا تالا توڑ کر گھس جانا ہے۔ اور ادارۂ شرعیہ کا بورڈ پھینک کر اپنا بورڈ آویزاں کر دینا ہے۔ کورٹ میں حق ملکیت ثابت کرنے میں ان کو برسوں لگ جائیں گے۔ اب ادارۂ شرعیہ کی لاج آپ کو رکھنا ہے۔ اور اس کا کھویا ہوا وقار آپ کو بحال کرنا ہے۔

اس غیر متوقع گفتگو سے میں گھبرا گیا۔ اور ''گویم مشکل وگرنہ گویم'' کے گرداب میں پھنس گیا۔ بالآخر میں نے یہ عرض کیا کہ میں بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے ایک جمے جمائے ادارہ سے وابستہ ہوں۔ اور پورے علاقے پر میری مضبوط گرفت ہے۔ میں یکبارگی وہاں سے اٹھ کر کیسے آسکتا ہوں۔ میرا جواب سن کر حضرت علامہ نے فرمایا، فیض العلوم کی پرشکوہ عمارت آپ دیکھ رہے ہیں۔ اگر مجھے بے دخل کر کے خدانخواستہ دشمن اس پر قبضہ جمالیں تو ارشد القادری کی ناک کٹ جائے گی کہ وہ اپنے ایک ادارہ کو دشمن کی یلغار سے نہ بچا سکا۔ لیکن ادارۂ شرعیہ پر غیروں کا تسلط ہو گیا اور اللہ نہ کرے وہ ٹوٹ بکھر گیا تو پوری جماعت اہل سنت کی ناک کٹ جائے گی۔ اور جماعت کے ایک ذمہ دار فرد آپ بھی ہیں۔ لہٰذا آپ کو بھی اس کا درد محسوس کرنا پڑے گا۔ ادارۂ شرعیہ بہار میرا ذاتی ادارہ نہیں ہے وہ پوری ملت کی امانت ہے۔

میں نے اس مناظرانہ بحث سے ہار مان کر یہ عذر پیش کیا کہ میرے والد بزرگوار باحیات ہیں۔ اور میں ان سے پوچھے بغیر چھوٹا چھوٹا کام بھی نہیں کرتا ہوں۔ پھر

اتنا بڑا اقدام بغیر اجازت کیوں کر کر سکتا ہوں۔ اس پر علامہ نے فرمایا کہ حضرت کریم الاخلاق ہیں۔ میں ہاتھ جوڑ کر ان کو راضی کر لوں گا۔ ۲۵؍ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو پٹنہ میں علماء بورڈ کی میٹنگ رکھی گئی ہے۔ قائد ملت مولانا شاہ اسرار الحق شاہجہاں پوری اور مجاہد دوراں مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی بھی پہونچ رہے ہیں۔ آپ اس میٹنگ میں صرف شرکت کا مجھ سے وعدہ کر کے یہاں سے اٹھیں۔ میٹنگ میں شرکت کا حتمی وعدہ کر کے دو گھنٹہ بعد میں وہاں سے رخصت ہوا۔

حسب وعدہ ۲۵؍ اکتوبر کو میں پٹنہ پہونچ گیا۔ مذکور الصدر علماء بھی تشریف لے آئے۔ بعد نماز عشاء ادارہ کی چھت پر میٹنگ منعقد ہوئی۔ مولانا شاہ برہان احمد ابوالفیاضی، مولانا سید نور الہدیٰ شمسی، مولانا ضیاء جالوی اور مولانا حسن رضا خاں وغیرہم بھی موجود تھے۔ ۱۲ بجے شب تک رسیدات ورجسٹر کی جانچ پڑتال اور حساب وکتاب کی چھان پھٹک ہوتی رہی۔ بالآخر ناقص کارکردگی کے باعث انتظامیہ کمیٹی کو برخواست کر کے رخصت کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۲ بجے شب تک میٹنگ کی کارروائی جاری رہی۔

۲۶؍ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی صبح کو بعد نماز فجر مجھے بلا کر ادارۂ شرعیہ بہار کی زمام سنبھالنے کی پیش کش کی گئی اور خود مختار مہتمم کا عہدہ میرے لئے تجویز کیا گیا۔ میرا پس و پیش دیکھ کر شاہ اسرار الحق علیہ الرحمہ نے فرمایا، تم سوچ سمجھ لو۔ یہ سنتے ہی حضرت علامہ نے چراغ پا ہو کر کہا۔ خدا کے لئے آپ عزیز دارانہ ہمدردی نہ جتایئے۔ ان کی محبت میرے دل میں آپ سے کم نہیں ہے۔ پھر فرمایا، سید صاحب! حافظ ملت نے آپ کے سینے میں درد سنیت کی جو جوت جگا دی ہے اس سے میں بہت پر امید ہوں۔ حضرت مظفر میاں علیہ الرحمہ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر گرما گرم جملوں میں علامہ کی تائید فرمائی

اب میرے لئے کوئی راہ مفر نہیں تھی۔

۲۷/ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو میرے اختیارات اور ذمہ داریوں کی تفصیلات درج رجسٹر کرنے کے بعد حضرت علامہ نے دستخط کے لئے مجھے رجسٹر پیش کرتے ہوئے فرمایا ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

مجھے فنڈ دے کر نہیں، تیرہ سو روپے کے خسارہ کے ساتھ ادارۂ شرعیہ بہار کا بوجھ میرے سر ڈالا گیا تھا۔ حضرت علامہ نے دم رخصت فرمایا کہ اگر آپ نے ادارۂ شرعیہ بہار کا سالانہ بجٹ پچیس ہزار تک پہونچا دیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ میں بچہ پیدا کر کے کوڑے پر ڈال دیا تھا، آپ نے اٹھا کر اسے پال لیا۔

الحمدللہ! دس سالہ مدت میں پورے ملک کے علماء اور عوام سے میں نے اپنی خدمات کا لوہا منوا کر ادارۂ شرعیہ بہار کا سالانہ بجٹ نوے ہزار تک پہونچا کر اور چالیس ہزار فنڈ چھوڑ کر ۲۵/ دسمبر ۱۹۸۲ء کو ادارۂ شرعیہ پٹنہ سے باہر نکل آیا۔

میں نے آپ بیتی پوری داستان نقل کر دی تا کہ آپ اپنے بڑوں کا دینی درد سمجھیں اور اپنے دل میں جماعت کے لئے احساس درد پیدا کریں۔ اور یقین رکھیں کہ آج کی قربانی کل ہمارے کام آئے گی۔

آج، اگر ہم اپنی نااہلی سے ادارہ کی عظمت کھو دیں اور علماء کا اعتماد ہم پر سے اٹھ جائے تو اس میں ادارہ کے بانیین و محرکین کا کیا قصور ہے۔ ہمیں تو وہ دور بھی یاد ہے کہ فقیہ اجل حضرت مولانا سید شاہ غلام قادر صاحب اصدقی مہتمم مدرسہ اصدقیہ غریب نواز ہزاری باغ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ظل الرحمٰن صاحب ضیائی مہتمم دارالعلوم

خیر یہ نظامیہ سہسرام جیسے متدین علماء نے اپنے فتووں پر ادارہ شرعیہ کی تصدیق چاہی ہے اور دستخط و مہر سے اسے مزین کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ اور یہ صرف اس لئے کہ دارالافتاء میں بیٹھا ہوا مفتی علماء کا معتمد اور ادارہ شرعیہ، سواد اعظم اہل سنت کی عظمتوں کا نشان تھا ادارہ شرعیہ کو ان ہی خطوط پر قائم و باقی رکھنا ہماری جماعتی ذمہ داری ہے۔

(۲) ۱۹۸۵ء میں اگر چہ اکثر اکابرین بساط ارض سے اٹھ چکے تھے اور فعال مشاہیر بھی کم تعداد میں رہ گئے تھے۔ اس وقت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے یہ محسوس فرمایا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بری طرح نااہلی کا شکار ہے اور اس تنظیم کی آڑ میں مفاد پرستی اور سیاسی سودا بازی کی مہم زور پکڑتی جا رہی ہے۔ اگر فوری طور پر کوئی اصلاحی قدم نہ اٹھایا گیا تو خطرہ اس بات کا ہے کہ سواد اعظم اہل سنت کے جینے کی راہ مسدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اس لئے ایک متوازی تنظیم آل انڈیا مسلم پرسنل لا کانفرنس کے قیام کا فیصلہ فرمایا۔ اور اس کے لئے ملک بھر کے باقی ماندہ تمام ارباب حل و عقد سے استصواب رائے فرما کر اس میدان کا شعور رکھنے والے علماء کی شمولیت اس تنظیم میں ضروری سمجھی۔ اور پھر عوام کو اپنے فیصلوں سے آگاہ کرنے کے لئے اسی سیوان میں دو روزہ تاریخ ساز ''مسلم پرسنل لا کانفرنس'' کا اجلاس بلایا۔ شمس العلماء حضرت مولانا نظام الدین صاحب الٰہ آبادی اور قائد ملت حضرت مولانا سید شاہ اسرار الحق شاہجہاں پوری کے ہمراہ میں بھی شریک اجلاس ہوا تھا۔

افسوس! اس موقع پر جوش، میں ہوش کھو دینے والے بعض مقررین کی گفتگو سے کانفرنس کے نتائج پر بہت برا اثر پڑا۔ کانفرنس کے انعقاد سے پہلے پٹنہ کے روزنامہ

اخبارات نے جس وسیع النظری کے ساتھ اس کے پروگرام کی تشہیر اور پبلیسٹی میں نمایاں رول ادا کیا تھا، کانفرنس کے منعقد ہونے کے بعد اس کی کارروائیوں کو مشتہر کرنے سے گریز کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اخبارات نے بعد میں کانفرنس کا خاموش بائیکاٹ کیا تو بے جا نہ ہوگا۔ ایسے موقعوں پر مثبت پہلو سے صرف نظر کرکے منفی رخ اپنانے کا عوام یہ اثر لیتی ہے کہ یہ تنظیم تعمیری ضرورت کے تحت نہیں، بلکہ اپنے تخریبی ذہن کو تسکین دینے کے لئے قائم ہوئی ہے۔ اور بالکل ٹھیک ٹھیک یہی ردعمل یہاں بھی سامنے آیا۔

ہمارے یہاں کسی تنظیم کو مؤثر بنانے کے بجائے اس کا دائرہ اثر تنگ کرنے کا چلن بہت عام ہے۔ دعوت اسلامی پر کچھ لوگ حرف زنی صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ مثبت پہلو اپنانے کے بجائے منفی رویہ کیوں نہیں اختیار کرتی ہے۔ اور اب تو کچھ جارح قسم کے لوگ اس میں شامل ہوکر اس کی مصلحت پسندی کا جامہ ہی اتار دینا چاہتے ہیں۔ اس سے جماعت کا دائرہ پھیلے گا نہیں، بلکہ سمٹ جائے گا۔ جو لوگ صرف اصلاحی تحریک سمجھ کر اس کے قریب آرہے ہیں وہ بدک جائیں گے۔ ہمارے ولی نعمت حضور حافظ ملت فرمایا کرتے تھے کہ ''گفتگو ایسی کی جائے کہ مخالف قریب آئے، ہماری باتیں سنے اور حق قبول کرے''۔ جارحانہ کردار و عمل کے لئے تو بہت سارے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ یہ اصرار کیوں ہے کہ دعوت اسلامی اور سنی دعوت اسلامی کے کیمپ سے ہی تشدد کے گولے داغے جائیں۔ اگر ہماری بھی کوئی تنظیم لوگوں کو مل

بیٹھنے کی دعوت دیتی ہے اور ''الصحبۃ مؤثرۃ'' کے اصول پر چل کر ہدایت کا رنگ ان پر چڑھانا چاہتی ہے تو اس میں برائی کیا ہے۔

دعوت اسلامی اس وقت میرا موضوع نہیں ہے۔ اس طویل بحث کے ذریعہ میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی بہتات ہے جو تنظیم کی مشکلات کا سامنا کرنے کو تیار نہیں ہیں اور دوسروں کو بھی جماعتی شیرازہ بندی میں مشغول دیکھنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں جماعتی ذوق کا فقدان نہیں ہوتا تو۔ ادارۂ شرعیہ بہار اپنے اصلی خطوط پر گامزن ہوتا۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا کانفرنس، اپنے تمام اغراض و مقاصد کے ساتھ متحرک و فعال نظر آتی۔ آل انڈیا مسلم متحدہ محاذ کے جھنڈے کے نیچے سیاسی ذہن رکھنے والے سنی علماء متحد نظر آتے۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کا دائرہ کار پورے ملک کو محیط ہوتا۔ کل ہند جمعیۃ العلماء چند ہاتھوں میں کھلونا بن کر نہ رہ جاتی۔ اور ہماری جماعت کے افراد میں ''خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ'' کا مزاج پیدا نہ ہوتا۔

ہمارے لئے کیا یہ غیرت کی بات نہیں ہے کہ ہر نئے ماہ و سال میں کوئی اپنے چند حواریوں کو ساتھ لیکر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور سواد اعظم کی طرف منسوب کرکے کسی نہ کسی تنظیم کا اعلان کردیتا ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ملت مظلوم کے فلاح کے لئے نہیں، اسے ذاتی مفاد اور اپنے سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے اسلاف نے اپنے معاصرین سے استصواب رائے کے بعد جو تنظیم قائم فرمائیں، اس کا دائرہ پورے ملک کو محیط نہ ہوسکا۔ اس میں چاہے ان کی کوتاہی کو دخل تھا، یا وسائل کی مجبوری تھی مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان بزرگوں نے تنظیم کا پلیٹ فارم اپنے اغراض کیلئے کبھی استعمال نہ فرمایا۔

ایوان حکومت تک رسائل یا جماعتی استحکام کیلئے ہمارے بڑوں نے حکومت

وقت کے ساتھ ضمیر کا سودا ہرگز گوارانہ فرمایا۔جس کی پاداش میں انہیں سیاسی جولان گاہ میں بہتوں سے پیچھے رہنا پڑا۔اور تنظیم و جماعت کو بھی خسارا سے دوچار ہونا پڑا۔حضرت علامہ ارشدالقادری اس راہ کی کٹھنائیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

''کڑوروں افراد پر مشتمل کسی ملک گیر تنظیم کو چلانے کیلئے جن سیاسی وسائل اور وافر سرمایہ کی ضرورت ہے وہ ہمارے یہاں مفقود ہے۔سیاسی وسائل کا مرحلہ تو اس لئے مشکل ہے کہ یہ میدان ضمیر، دیانت اور مذہبی احساسات کی قربانی کا متقاضی ہے۔اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارا جماعتی مزاج اس طرح کی ایمان سوز قربانی کا قطعاً متحمل نہیں ہے۔'' (جام نور کلکتہ،شمارہ نومبر ۱۹۶۸ء)

ہمارے لوگ بھی ایوان حکومت تک پہونچے وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر پہونچے اور وہاں پہونچ کر بھی انہوں نے دنیادار نیتاؤں کی روش نہیں اپنائی۔ حضور حافظ ملت اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''میں مولانا شاہ اسرارالحق کی قدر اس لئے کرتا ہوں کہ انہوں نے پارلیامنٹ میں پہونچ کر بھی کتمان حق نہیں فرمایا اور کبھی باطل سے سمجھوتہ نہیں کیا'' یہ وہ دور تھا جب وزیر اعظم اندرا گاندھی کو برتھ کنٹرول کی سوجھی تھی۔اور اس کی حمایت میں قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے فتویٰ حاصل کرلیا تھا۔اس وقت اس نے اپنے راجیہ سبھا کے ممبر مولانا شاہ اسرارالحق صاحب سے اس فتویٰ کی تائید میں اعلان کا شدید مطالبہ کیا۔مولانا نے تنگ آکر فرمایا۔اندرا جی فتویٰ کی تائید کرنا ہر مولوی کا کام نہیں ہے۔مجھ سے یہ مطالبہ فضول ہے۔میرا یہ منصب ہی نہیں ہے۔ملک کے مرکزی اداروں کے مفتیان کرام کا فتویٰ ہی عوام کیلئے قابل

قبول ہوسکتا ہے۔بلاشبہ مولانا کا یہ حق پسند اور جرأت مندانہ اقدام تھا۔

اندرا گاندھی کو یہ سمجھایا گیا تھا کہ اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ دیوبند کا یہ فتویٰ ہندوستان کے تمام مسلمانوں میں یکساں مقبول ہو تو مولانا شاہ اسرارالحق جو کانگریس پارٹی کے رکن خاص اور ممبر پالیامنٹ ہیں۔ان سے تائیدی اعلان نکلوادیجئے۔مشورہ دینے والے نے ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہا تھا۔یعنی اگر مولانا نے فتویٰ کی تائید میں اعلان کردیا تو اپنی جماعت میں معتوب ہوجائیں گے اور اگر بے باکانہ طور پر انکار کردیا تو عتاب شاہی کے شکار بن جائیں گے۔مگر مولانا نے انتہائی ہوشمندی سے کام لیکر دشمن کے حربے کو ناکام بنادیا۔

آج جام نور دہلی میں اظہار خیالات کے صفحات پر لوگوں کی یہ رائیں دیکھنے کو مل رہی ہیں کہ سیاسی رہنماؤں سے علماء زیادہ بصیرتوں کے مالک ہیں۔لہٰذا انہیں سیاست کے میدان میں قدم بڑھانا چاہئے۔میں اس باب میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ داڑھی ٹوپی کے ساتھ جو بھی میدان سیاست میں کود پڑے،اس کا علماء میں شمار کیا جانا نادانی ہے۔ایسے لوگوں سے عالمانہ بصیرت کی توقع فضول ہے۔ثانیاً یہ کہ خودغرضی،مطلب برآوری،اور مفاد پرستی کا نام سیاست نہیں ہے۔جیسا کہ گذشتہ دنوں پارلیامنٹ کے الیکشن کے موقع پر اٹل جی کی حمایت میں ضمیر فروشی کا ننگا ناچ دیکھنے میں آیا۔اور حالیہ دنوں کے صوبائی الیکشن میں پاسوان اور لالو جی کی حمایت کا ڈرامائی تماشہ دیکھنے کو ملا۔جب مسلم نیتا اور لیڈروں کی سطح سے مولوی نیچے گر جائے تو ایسی گھناؤنی سیاست سے مولویوں کو دور ہی رکھنا بہتر ہے۔ کیونکہ مسلم نیتا مفاد پرستی کی سیاست سے اپنی ذات کو بدنام کرتا ہے۔لیکن مولوی جماعت کے سفید دامن پر بدنما داغ بن کر ابھرتا دکھائی دے رہا ہے۔

آخری التماس۔ملک وملت کے غمخواروں اور سواد اعظم کے علم برداروں

سے آخر میں اتنی گذارش میں ضرور کروں گا کہ جب بھی کسی ملی تنظیم کیلئے وہ قدم بڑھائیں تو جماعت کے ارباب عقول اور صاحبان فکر وشعور کے ساتھ ساتھ جماعت میں اثر ورسوخ رکھنے والی شخصیتوں کو بھی اعتماد میں ضرور لے لیں۔ تاکہ اپنے ہی لوگوں کی طرف سے مخالفانہ رویہ سامنے نہ آئے۔ اس سے جماعت کی سبکی ہوتی ہے اور غیروں کو تضحیک کا موقع ملتا ہے۔ ظاہر ہے جب تنظیم شروع ہی میں مخالفت کی شکار ہو جائیگی تو اس کے بہتر نتائج سامنے نہیں آسکتے۔ عدم مخالفت کی صورت میں اگر ہر طرف سے تعاون کا ہاتھ نہیں بھی بڑھے گا تو کام کرنا چنداں دشوار نہ ہوگا۔ کیونکہ عدم مخالفت بھی ایک طرح کا تعاون ہے۔

اس میں بھی کوئی دورائے نہیں کہ جماعت بندی کیلئے قائدین کی حیثیت سے جو لوگ بھی آگے آئیں گے۔ تنظیم کے کلیدی عہدوں پر فائز ہونے کا حق بھی انہی کو حاصل ہوگا۔ دور دور سے حمایت دینے والے چاہے وہ کوئی بھی ہوں عہدوں کے حقدار نہیں ہوں گے کیونکہ ایسے عہدوں کی تقسیم سے جماعت کی رگوں میں خون نہیں دوڑ سکتا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ ان عہدوں کے صلے میں انہیں عزت، شہرت اور کچھ منفعت بھی حاصل ہوسکتی ہے۔ جس پر کسی کو حرف زنی کا حق ہرگز نہیں پہونچتا۔ اسے ان کی قربانیوں کا ثمرہ قرار دیا جائے گا۔ تشکیل جماعت کی یہ وہ صورتیں ہیں۔ جنہیں اپنا لینے کے بعد بلاخیز طوفانوں سے گذرنے کیلئے صرف عزم صمیم کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ اگر خوش بختی سے یہ سرمایہ بھی ہاتھ آگیا تو اب بڑھتے قدموں کو روکنے میں کوہ ہمالہ کا کلیجہ بھی آب ہو جائے گا۔

عزم صمیم ہو تو، نظر آئے کوہ کاہ

راسخ نہیں عقیدہ، تو تنکا پہاڑ ہے

☆☆☆

خانقاہوں کی زبوں حالی

اسلاف کی سنت ——— اسلاف کی امانت ——— اسلاف کی روایت،

یہ تین وہ مہتم بالشان خوبیاں تھیں جو تمام اہالیان خانقاہ کے نزدیک حرز جاں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جن کے تحفظ کو انہوں نے وجوب کا درجہ دے رکھا تھا۔ اس اجمال کی قدرے تفصیل آپ ذیل کی سطروں میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) اسلاف کی سنت ——— اس ضمن میں جو تفصیلات ملتی ہیں ان میں سب سے اہم چیز موروثی علم ہے یعنی دینی علوم کا حصول۔ یہ علم انبیاء سے اولیاء کو پہونچا اور ان کی اولاد و متبعین کو۔ خانقاہیں پہلے علمی مراکز ہوا کرتی تھیں جہاں سے بڑے بڑے فضلاء پیدا ہوا کرتے تھے۔ خانوادے کے لوگ عصری علوم میں چاہے جو کمال بھی پیدا کریں لیکن پہلے وہ خاندانی علم سے آراستہ ہو کر ہی کسی اور طرف رخ کرتے تھے ——— خاص کر مسند نشینی کے لئے جو منتخب کیا جاتا اسے تمام دینی علوم میں پہلے پوری دستگاہ پیدا کرائی جاتی تھی اور وہ اتنی دقیق نظر کا مالک بن جایا کرتا تھا کہ کوئی بھی متبحر عالم خانقاہ میں بیٹھ کر ان پر تفوق علمی ظاہر کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

(۲) دوسری چیز ——— خاندانی وضع ہے۔ وہ صورت و شکل عامی، اور لباس و پوشاک بازاری اختیار کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ وہ اپنے سراپا میں بزرگوں کے ایسے آئینہ دار اور مظہر نظر آتے تھے کہ خانقاہ کے حریفوں کو انگشت نمائی کی مجال نہیں ہوسکتی تھی۔

(۳) تیسری چیز ——— شرعی حد بندی ہے۔ اپنے بزرگوں کی روش پر کاربند رہنا ان کا مزاج تھا۔ مثلاً صوم وصلاۃ کی حفاظت، خاندانی اوراد و وظائف کی پابندی

اور ذکر و تلاوت سے گہرا شغف ——— ظاہر پرست مولوی، جس کی پیشانی بے نور، جس کا سجدہ بے حضور، وہ ان کے ظاہری کردار عمل کو کبھی چیلنج نہیں کرسکتا تھا۔

چوتھی چیز ——— عقائد حقہ پر ثبات قدمی ہے۔ اپنے بزرگوں کے عقائد و نظریات کو سرتاسر حق مان کر اس پر جمے رہنا ان کا شیوہ تھا۔ کوئی بھی پارٹی یا ایسی جماعت جو انہیں اپنے بزرگوں سے الگ راہ دکھانے والی ہے کبھی ان کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی تھی۔ سیاسی رہنماؤں کی کاسہ لیسی یا اعلیٰ عہدیداروں کی جی حضوری کا کوئی تصور انہیں چھو بھی نہیں سکتا تھا۔

(۲) اسلاف کی امانت ——— اس کی بھی تین صورتیں ہیں ——— (۱) خانقاہ کے سامان و اسباب، (۲) بزرگوں کے آثار و تبرکات، (۳) وقف کی جائداد و املاک ——— سجادہ نشین ان تمام چیزوں کے نگراں، متولی اور محافظ ہوتے ہیں۔ یہ ان کی ملکیت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی مسند نشینی کے دور میں انتظام و انصرام اور ان چیزوں کے مصارف کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور بس، کیونکہ خانقاہ اور خانقاہ کی ضرورتیں ہمیشہ کے لئے ہیں۔ بعد میں آنے والوں کو بھی ان اثاثوں کی ضرورت پیش آئے گی۔

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ اسلاف کی یہ تینوں امانتیں خانقاہ کی الگ الگ ضرورتوں سے متعلق ہیں۔ خانقاہ کا اثاثہ عرس کے انتظامات کے لئے ہے اور کتب خانہ اہل ذوق کے استفادہ کے لئے۔ بزرگوں کے آثار و تبرکات ارادت مندوں کی زیارت کے لئے ہوتے ہیں۔ وقف جائداد کی آمدنی عرس و لنگر کے اخراجات اور خانقاہ سے منسلک افراد کی کفالت کے لئے ہوتی ہے۔

(۳) اسلاف کی روایت ———— اس کے بھی یہ تین زاویئے اپنے پیش نظر رکھئے۔آداب خانقاہ، مراسم عرس وفاتحہ اورہم زمانہ مشائخ کے ساتھ ارتباط۔ جس طرح اگلوں نے روا رکھا۔ بعد والوں نے اسی طرح اسے برتا۔ مثلاً نشست و برخواست میں بزرگوں کی روش پر عمل کی کوشش۔عرس و فاتحہ کے ضابطوں میں بزرگوں کے طریقہ کی پیروی اور ہم مشرب صوفیاء اوران کے وارثین کے ساتھ اپنے بزرگوں کا سابرتاؤ۔

معمولی معمولی باتوں میں بھی بزرگوں کے معمول کا بڑا پاس ولحاظ تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میرے بچپن میں آستانہ چشتی چمن پیر بیگھہ شریف میں عرس کے موقع پر جبکہ کئی متعلق خانقاہوں کے مشائخ اکٹھا تھے۔ یہ بات زیر بحث آئی کہ چاند کے ۲۹-۳۰ کے اختلافات سے نظام عرس میں گڑبڑی پیدا ہوتی ہے لہٰذا بحساب جنتری یا بحساب ۳۰ر طے کرلیا جائے۔اس میں زائرین ومنتظمین دونوں کے لئے آسانی ہے۔

اس تجویز سے اکثر مشائخ نے یہ کہہ کر سخت اختلاف فرمایا کہ ہمارے بزرگوں نے ایسا نہیں کیا ہے۔سیکڑوں سال سے انہوں نے صرف رویت کا لحاظ رکھا ہے۔ہم نے بحساب ۳۰ رعرس کی تاریخ طے کرلی اور رویت ۲۹ رکی ہوگئی تو اصل تاریخ ضائع ہوجائے گی۔پھر تاریخ وصال پرعرس کے کوئی معنی نہیں رہیں گے۔ہمیں ہر دشواری گوارہ ہے مگر اسلاف کا معمول توڑنا منظور نہیں۔

ایک صدی پیشتر تک تقریباً ہر خانقاہ کا یہی نقشہ تھا۔اورانہی پختہ اصولوں پر خانقاہی نظام چل رہا تھا۔اس کے بعد دور انحطاط شروع ہوا اور بتدریج پستی آتی چلی

گئی اوراب تو حال یہ ہے کہ یہ تینوں شعبے سکرات موت کی سختی جھیل رہے ہیں۔

بہار کی خانقاہوں کا حال تو سب کو معلوم ہی ہے ———لیکن گذشتہ دنوں جب میں اتر پردیش، مہاراشٹرا اور کرناٹک کی کئی بڑی کانفرنسوں میں شریک ہوا جہاں مختلف بلاد وامصار کے درجنوں مشائخ وسجادگان اکٹھا تھے تو ان سے مل کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی———ان کا مبلغ علم، ان کی شکل وصورت اوران کے طور طریقے بیان کرنے میں شرم محسوس ہوتی ہے۔

علم ——— اسلاف کا نہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عمل اسلاف جیسا نہیں، صورت وشکل اسلاف کی نہیں، لباس وپوشاک میں اسلاف کا عکس نہیں، اخلاق وکردار میں اسلاف کی جھلک نہیں، وضع داری اسلاف جیسی نہیں ———

علم ——— ہی کے فقدان کے باعث عقائد بھی ٹھوس نہیں---- چونکہ اپنے اسلاف کی تعلیمات کا انہیں علم نہیں ان کے کتابوں کے مطالعہ کی اہلیت نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر ان ہی کے گھر کے بزرگوں کا جام انہیں دیا جائے تو سمجھتے ہیں کہ یہ دارو بریلی کے دواخانے سے لائی گئی ہے۔

اسلاف کی امانت ——— اس کا بھی کچھ یہی حال ہے۔اسباب خانقاہ گھٹتے گئے، ٹوٹتے گئے اور بکتے گئے۔ بدل میں انتظام کی نہ فکر ہے اور نہ صلاحیت۔ اپنی ہی خانگی ضرورتیں پیچ در پیچ اتنی پھیل گئی ہیں کہ خانقاہ کے اثاثہ کی طرف توجہ کی فرصت کہاں۔

کتب خانے بے توجہی کے شکار ہیں ——— الماریاں گرد آلود، کتابیں

دیمک خوردہ، اوراق منتشر اور جلدیں ٹوٹی پڑی ہیں۔ اہل خانقاہ کو جب ان کتابوں کے مضامین پلے ہی نہیں پڑیں گے تو پھر انہیں سنوارنے کی فکر ہی کیوں ہو ——

آثار و تبرکات —— جن چیزوں سے محض عقیدت کا رشتہ ہو، آمدنی کا کوئی راستہ نہ ہو تو پھر دنیا دارانہ ماحول میں اس کی اہمیت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ لہٰذا بزرگوں کی یہ امانتیں بھی غیر محفوظ ہوتی جا رہی ہیں —— اور اسے تو ستم بالائے ستم کہئے کہ خانقاہ کے منفی افکار و نظریات اب خانقاہ کے اندر داخل ہو کر عقیدت کے رشتے کو بھی زیر و زبر کر رہے ہیں —— ابھی کچھ ہی دنوں پہلے کی بات ہے۔ ایک خانقاہ کے سجادہ نشین نے سفر آخرت اختیار کیا تو فاتحہ چہارم میں مریدین اکٹھا ہوئے۔ اس موقع پر بطور تعزیت کچھ مریدین نے پیرزادے سے کہا کہ پیر صاحب تو نہیں رہے۔ اب بابو ہی اس خانقاہ کے امین ہیں —— یہ سن کر فرزند نا فرجام نے جواب دیا کہ سارے خرافات بڈھے کے ساتھ دفن ہو گئے۔ اب یہاں یہ سب کچھ نہیں ہوگا —— الامان والحفیظ۔ ع

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

جائداد و املاک —— یہ تو اچھا ہوا کہ اکثر بزرگوں نے اسے پاس پھٹکنے ہی نہ دیا۔ عسرت و تنگی کو محبوب رکھا۔ فقر و فاقہ کو گلے لگایا مگر اس طوق گراں بار سے ہمیشہ دور رہے —— ہاں، مفاد عامہ کی خاطر جن بزرگوں نے اسے قبول فرمایا ان کے نیک مقاصد ایک عرصہ تک پورے ہوتے رہے۔ اور بعض خانقاہ میں تو اب تک پورے ہو رہے ہیں لیکن اکثر جگہوں پر رفتہ رفتہ اہل خاندان کے دلوں میں لالچ

نے ڈورے ڈالے جس کے نتیجے میں خانہ جنگی اور مقدمہ بازی کا آغاز ہوا اور وقف بورڈ نے اس کی رہی سہی آبرو کی بھی مٹی پلید کر دی۔

اسلاف کی روایت —— خانقاہی آداب و اخلاق دو طرح سے مجروح ہو رہے ہیں —— ایک اس طرح کہ دولت کے غرور سرور نے صاحب خانقاہ کا مزاج ہی بدل دیا ہے۔ خلق و مروت اور عجز و انکسار نام کی کوئی چیز اب وہاں باقی نہیں رہی۔ دوسرے اس طرح کہ علمی بے مائیگی کے ساتھ ساتھ ذہنی پرورش و پرداخت بھی ایسی نہیں ہو سکی کہ صوفیاء کی اس تعلیم پر نظر رہے۔ ع

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

عرس و فاتحہ —— فاتحہ اور عرس کی رسم آج بھی خانقاہوں میں بڑی حد تک قائم و باقی ہے۔ کیونکہ اس میں عقیدت کا عنصر کمزور پڑتا ہے تو ضرورت سامنے آ کر تقاضا کرتی ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ جو جگہیں خانقاہ کے نام پر کلنک کا ٹیکہ ہیں وہاں بھی بنام ''عرس و فاتحہ'' کارڈ چھپتا ہے۔ مگر یہ نہ کہئے کہ ہمارے یہاں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ قوال سے لے کر مشائخ تک، خانقاہ کے صحن سے لے کر مزار کی دہلیز تک ہر جگہ فرق نمایاں ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ —— مرجانے کے بعد باپ کا اولاد پر ایک حق چند حقوق میں یہ بھی باقی رہتا ہے کہ وہ باپ کے احباب کے ساتھ اسی جیسا سلوک کرے —— اس کے بہترین مناظر خانقاہوں میں دیکھنے کو ملتے تھے۔ اور خانقاہوں کے درمیان روابط میں اصلاً یہی جذبہ کار فرما ہوتا تھا —— متعلق خانقاہیں اپنے منبع

فیض اور مرکزی خانقاہ سے نسلاً بعد نسلٍ اسی جذبے کے تحت جڑی ہوتی تھیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ رجحان بھی بڑی تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہوتا جارہا ہے۔ مشائخ کے درمیان آپسی رسہ کشی کا تصور بعید از قیاس تھا۔ مگر اب یہ عام سی بات ہوگئی ہے۔

آخر میں ——— ہم خانقاہ کے ذمہ داروں سے اتنا ضرور عرض کریں گے کہ یہ صحیح ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے نعم البدل تو کیا، بدل بھی نہیں ہو سکتے مگر آپ اپنے وارثین کو خدا کے لئے ان کے نام پر کلنک کا ٹیکہ تو نہ بننے دیجئے کم از کم جسے جانشینی کا منصب تفویض کرنا ہے اسے تو دینی علوم اور خانقاہی تربیت سے آراستہ ہونا چاہئے۔

اب جبکہ جانشینی کے لئے اہل کو ڈھونڈنے اور تلاش کرنے کا دستور نہیں رہا۔ بلکہ یہ عقدہ وراثت کے دروازے سے حل کیا جاتا ہے تو ضروری ہے کہ اولاد میں سے جو ہر قابل دیکھ کر کسی ایک کو ایسے سانچے میں ڈھالا جائے کہ وہ اپنے پیش رو کا پرتو اور نمونہ بن سکے ——— اگر ایسا نہیں کیا گیا تو خانقاہوں کی ساکھ دن بدن اکھڑتی چلی جائے گی اور ہماری زبان پر صرف ''پدرم سلطان بود'' کا نعرہ رہ جائے گا۔

غبار راہ سے کہہ دو، سنبھالے نشان قدم
زمانہ ڈھونڈے گا، ان کو رہبری کے لئے

☆☆☆

سلسلوں کا تعصب وقت کا المیہ

علماء کے درمیان معاصرانہ چشمک، علمی برتری کا خمار، اور دماغ میں پندار علم کا سودا ہر زمانہ میں دیکھا گیا ہے۔ سوائے ان عالمان باعمل کے جنہوں نے ریا و نمودار کی راہ سے بہت دور ہٹ کر عجز و انکسار کی وادئ نور میں قدم رکھ دیا ہے اور خلوص وللّٰہیت اور بے نفسی کے میدان میں صوفیاء کے دوش بدوش کھڑے ہو چکے ہیں۔

لیکن صوفیاء ''**الاولیاء کنفسٍ واحدٍ**'' کے آئینہ دار ہمیشہ سے دیکھے جاتے رہے ہیں۔ اس میں ایک شجرہ کے مشائخ یا ایک سلسلہ کے صوفیاء کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ بلکہ قادری، چشتی، نقشبندی اور سہروردی سبھی سلاسل کے اولیاء ایک جان کے مانند دیکھے گئے ہیں۔ تواریخ و سیر کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے۔ صدیوں پیشتر سے لے کر چوتھائی صدی پہلے تک اس کی ایک دو نہیں، سینکڑوں مثالیں مل جائیں گی۔ ان ہی سلاسل کی اوپر کی شاخوں میں فردوسی، شطاری، اشرفی، ابوالعلائی، عمادی، مجیبی، برکاتی، فخری اور منعمی وغیرہم۔ اور مابعد کی شاخوں میں اصدقی، رضوی، ابوالفیاضی، جہانگیری، بقائی، تیغی، قدیری اور افتخاری وغیرہم درجنوں متعارف سلسلوں کے بزرگوں کے مابین میل و محبت، ہمدردی و یگانگت، باہمی قدر و منزلت اور غایت درجہ پاس و لحاظ کے نادر واقعات دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں۔ یہ صوفیاء اپنے بڑوں ہی کی نہیں، اپنے ہم عصروں

کی تکریم بھی اپنے لئے باعث سعادت تصور کرتے تھے۔ ان کی خانقاہ میں بحیثیت مہمان کوئی بزرگ پہونچ جاتے تو وہ اپنے عقیدت مندوں کے بیچ ان کے اعزاز کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تمام سلسلوں کے وابستگان باہم شیر وشکر تھے۔ اور وہ خانقاہ مخالف تحریکوں کے لئے دیوار مستحکم کی حیثیت رکھتے تھے۔

زعم شیخی کی لعنت سے وہ اس درجہ پاک تھے کہ ایک بزرگ کے پاس مرید ہونے کے لئے ایسا شخص پہونچا جو کسی دوسرے بزرگ کے پڑوس میں رہتا تھا۔ انہوں نے پڑوس والے بزرگ کے فضل وکمال کو بیان کر کے شخص مذکور کو یہ کہہ کر ان کے پاس بھیج دیا کہ مرید ہونے کے بعد ان کی صحبتیں تم کو میسر آتی رہیں گی۔ پیر کی صحبت کے بغیر مرید ہونے کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ اولیاء کے حالات میں آپ کو ایسی صدہا مثالیں مل جائیں گی۔ یہ تو صوفیاء کے یہاں بالکل عام بات ہے کہ مریدوں کو ہدایت کرتے تھے کہ میری صحبت تمہیں میسر نہیں تو فلاں بزرگ کی صحبت تمہارے لئے آسان ہے۔ ان کی خدمت میں آیا جایا کرو۔
اس کی ایک تازہ مثال نذر قارئین کرتا چلوں مجھ سے ایک بار حاجی منے میاں صاحب بریلوی فرنیچر والے پتھر کی مسجد پٹنہ کہنے لگے۔ سید صاحب! میں شروع شروع جب بریلی سے پٹنہ آیا تو یہاں کا ماحول دیکھ کر بہت گھبرایا۔ میں نے اپنے پیر، حضور مفتی اعظم کو لکھ بھیجا کہ یہاں کا کچھ عجیب ماحول ہے۔ کوئی بھی ہم مشرب نظر نہیں آتا۔ حضرت نے جواب تحریر فرمایا۔ دانا پور کچھ دور نہیں ہے۔ وہاں ایک بزرگ حضرت مولانا سید شاہ محمد قائم قتیل دانا پوری ہیں۔ جب جب موقع ملے ان کے پاس چلے جایا کرو۔ ان کی خدمت میں میری صحبت کا فیض پاؤ گے۔ دیکھا آپ نے، یہ پیران عظام ایک صدی نہیں، چوتھائی صدی

پہلے تک **الاولیاء کنفسٍ واحدٍ** کے کیسے مظہر تھے۔

ان کی ژرف نگاہی کا جلوہ دیکھنا ہو تو ذیل کی سطریں توجہ سے پڑھئے ایک بار میں اپنے برادر عزیز سید بدرالدین اصدق مرحوم کے ساتھ سرکار پٹنہ سید شاہ فدا حسین صاحب علیہ الرحمہ کی زیارت کی غرض سے خانقاہ سملی شریف پٹنہ پہونچا۔ خانقاہ کے بر آمدے پر فرش بچھا تھا اور لوگ مؤدب بیٹھے تھے۔ ایک طرف حضرت بھی مسند لگائے جلوہ افروز تھے۔ ہم دونوں بھائی بھی سلام ودست بوسی کے بعد ایک طرف بیٹھ گئے۔ میں تو عالمانہ لباس میں تھا، البتہ بھائی سفید سوٹ پہنے تھے مگر ٹوپی لگا کر خانقاہی آداب سے بیٹھے تھے۔ حضرت نے غور سے دیکھا اس کے بعد دریافت فرمایا، بابو! آپ لوگ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ میں نے عرض کیا، پیر بیگھہ شریف سے۔ پیر بیگھہ شریف سن کر آپ کے چہرے پر بشاشت ظاہر ہوئی۔ پھر بڑی توجہ سے پوچھا، کیا آپ لوگ وہاں کے صاحبزادگان میں ہیں۔ میں نے عرض کیا، جی ہاں! پھر والد بزرگوار کا اسم شریف معلوم فرمایا۔ میں نے عرض کیا، الحاج سید شاہ بشیر الدین اصدق چشتی دامت برکاتہم۔

اس کے بعد، اپنے داہنی طرف مسند کے قریب فرش پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ یہاں تشریف لائیے خانقاہوں میں مستحق سمجھ کر ہی کسی کو اعزاز کی جگہ عطا کی جاتی ہے اس لئے وہاں عذر کرنا گناہ ہے۔ الامر فوق الادب کے تحت میں نے بلا تأمل حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد میرے چھوٹے بھائی کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، آپ کسی رنگ میں بھی ہوں۔ ہیں تو اسی باغ کے پھول، آپ بھی یہاں تشریف لائیے۔ وہ بھی میرے بغل میں آکر بیٹھے، چائے بسکٹ کی تقسیم چل رہی تھی۔ قاسم نعمت نے ہم لوگوں

کی طرف بھی بڑھانا چاہا۔مگر حضرت نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ پھر ایک عزیز کو قریب بلا کر، اشارے سے کچھ حکم دیا۔ چند منٹوں بعد ایک طشت پر چائے سے بھری پیالی رکھ کر بسکٹ کی طشتری کے ساتھ لے کر وہ آ گئے اور ہم دونوں کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے بعد حضرت نے بڑی شفقت سے فرمایا۔ آپ لوگوں کی آمد سے بڑی خوشی ہوئی۔ پیر بیگھہ شریف کے سابق سجادہ نشین حضرت شاہ محمد ہاشم صاحب علیہ الرحمہ سے میرا قلبی لگاؤ تھا۔ عرس اور غیر عرس میں بہت مرتبہ میں پیر بیگھہ شریف حاضر ہوا ہوں۔ حضرت ہاشم بابو صاحب کو بھی پٹنہ پہونچنے کے بعد یہاں آئے بغیر چین نہ تھا۔ اوپر کے بزرگوں کا تو اور کیا پوچھنا حضرت خواجہ شاہ قیام اصدق چشتی اور حضرت شاہ ابوالفیاض قدس سرہٗ کے درمیان مریدوں کا تبادلہ تک ہوا تھا۔

آج جمعہ کا دن تھا، اسی دوران اذان ہوگئی۔ حضرت نے فرمایا، خانقاہ کی مسجد میں آج خطبہ ونماز آپ ہی پڑھائیں گے۔ حالانکہ آپ کے صاحبزادے سید شاہ مظہر حسین صاحب، آپ کے خلیفہ حضرت شاہ غلام محمد صاحب، آپ کے عزیز حضرت مولانا سید شاہ برہان احمد ابوالفیاضی اور آپ کے مرید حضرت مولانا غلام دستگیر صاحب وغیرہم موجود تھے۔ نماز جمعہ کے بعد جلوس چادر کی تیاری شروع ہوئی۔ حضرت نے ہم دونوں بھائیوں کو اپنے پہلو میں کھڑا کیا۔ پھر آستانہ کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں جب ہم پیچھے رہ جاتے تو حضرت ٹھہر کر اپنے قریب کر لیتے پھر آگے بڑھتے۔ جگہ کی کمی کے باعث آستانہ میں کچھ لوگوں سے میں پیچھے رہ گیا تو ان لوگوں کو ہٹا کر مجھے اپنے پہلو میں کھڑا کیا اس کے بعد قل شروع ہوا۔

میں حیران تھا کہ نوے سال کے بوڑھے بزرگ ایک تیس سالہ نوجوان کی اس درجہ تکریم کیوں فرما رہے ہیں جو ایک محترم خانقاہ سے نسبت رکھنے کے سوا خود کسی احترام کا مستحق نہیں۔ اس واقعہ کو بھی کوئی ایک صدی نہیں گذری، صرف تیس سال ہی گذرے ہیں۔ واللہ! یہ وہ لوگ تھے جو اپنے اسلاف کے اخلاق و کردار کی عملی تصویر اور انکی دل ربا اداؤں کے بے داغ نمونہ تھے۔ ان ہی لوگوں کی صالح تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے کہ تمام قدیم خانقاہیں، جن کے رشد و ہدایت کی تاریخ کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔ ان کے وارثین آج بھی خلوص ومحبت کے پیکر، اور حسن معاملت میں اپنے پیش رؤں کے عکس جمیل ہیں۔ ان خانقاہوں کے وابستگان بھی باہم شیر وشکر دیکھے جاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ خلوص کا جذبۂ صادق بھی رکھتے ہیں۔

لیکن آج ——— روح طریقت سے نا آشنا لوگوں میں دھڑلے سے خلافت بٹ رہی ہے۔ مزاج تصوف کی جنہیں خبر نہیں، سلسلوں کی خصوصیات سے جو واقف نہیں، شرائط بیعت، اقسام بیعت اور طریقۂ بیعت کی بھی جن کو معلومات نہیں، ادائے عاشقاں جن کی عادت نہیں، روش بزرگاں جن کا مذاق نہیں۔ احترام سالکاں جن کی طبیعت نہیں، آج ایسے ہی لوگ اپنے ناموں کے ساتھ پیر طریقت لکھنے اور لکھوانے کے لئے آمادۂ پیکار نظر آرہے ہیں۔ اور ڈھٹائی کے ساتھ یہ ہوا پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں کہ ہم کو مانو اور کسی کو مت مانو۔ ہم ہی صحیح اور باقی سب غلط ہیں۔ صرف ایک خانقاہ اور باقی تمام خواہ مخواہ ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ مولوی بن جانے کے بعد بحر طریقت کے سب سے بڑے غواص ہم ہی ہیں۔

اس کے بدترین نتائج یہ سامنے آرہے ہیں کہ خانقاہوں کے باہمی روابط ٹوٹ رہے ہیں۔ مشائخ کے سینوں میں خلش پیدا ہورہی ہے۔مختلف سلسلوں کے وابستگان ایک دوسرے سے متصادم ہورہے ہیں۔ یکتائی و یکجائی کا جذبہ مٹ رہا ہے۔ اخلاص و وفا کی راہوں میں نفرت کی دیوار کھڑی ہورہی ہے۔اور سواد اعظم اہل سنت کی وحدت کا شیرازہ منتشر ہورہا ہے۔

بعض سلسلے وہ ہیں جن کے یہاں پیر بننے کے لئے علم شریعت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ناظرۂ قرآن جن کا صحیح نہیں۔املا نویسی اور اردو خوانی بھی درست نہیں ،مسائل ضروریہ بھی معلوم نہیں،علماء اور اہل علم کی صحبتیں بھی میسّر نہیں،ان کو اونچی ٹوپی پہنا کر اور صوفی کا خطاب دے کر پیر بنایا جارہا ہے اور وہ بے چارے اس غرے میں ہیں کہ ہم کسی سے کم بھی نہیں۔تسبیح لے کر مصلّی پر کچھ دیر بیٹھنے کا معمول بنالیا اور علماء کو انگوٹھے دکھانے لگے کہ تم کیا ہو،سب گن تو میری تسبیح کے ان دانوں میں ہے۔اس طرح کے پیروں کی بہتات ہوتی جارہی ہے۔ایسے لوگ شرعی حدود کو پامال کررہے ہیں۔عوام کو جھانسہ دے کر اسلاف کی روش کا باغی بنارہے ہیں۔ بنئے کی دوکان کی طرح جہاں چاہا خانقاہ کھول کر بیٹھ گئے۔جس سے خانقاہوں کی عظمت مجروح ہورہی ہے۔اور غیروں کو سنت صالحین پر انگشت نمائی کا موقع مل رہا ہے۔

یہ تو وہ لوگ ہیں جو کم از کم تسبیح و مصلّی کے قائل ہیں۔شریعت کا علم نہ سہی مگر شریعت کا حکم تسلیم ہے۔اب تو عوامی سرحدوں پہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے ایسے پیر بھی دیکھے جارہے ہیں،جنہوں نے بابا گیری کا فن اپنالیا ہے اور شریعت کا کھلا انکار کررہے

ہیں۔نماز پڑھنے اور پڑھوانے سے صرف گریز نہیں بلکہ ردوانکار ہے۔عوامی رجحان کے مطابق تعزیہ داری ان کا شعار ہے۔شریعت کا استہزاء اور علماء کی ہجو،ان کے شب وروز کا محبوب مشغلہ ہے۔ایسے ہی بداطوار پیروں کے پیچھے بدانجام قوم دوڑی جارہی ہے۔اس لئے کہ اسے گانے بجانے کی چھوٹ چاہئے۔اور احکام شریعت کی بندھنوں سے چھٹکارا چاہئے۔گزشتہ دنوں جام شہود کے صفحات میں کرناٹک کے ایک ایسے ہی پیر کے ناٹک کی کہانی آپ نے پڑھی ہوگی۔اس کے فیض صحبت کا ادنیٰ کرشمہ تھا کہ نمازی شخص مرید ہونے کے چند ہی دنوں بعد پکا بے نمازی بن جاتا تھا۔یعنی پیری مریدی جو کبھی ہدایت کا سامان تھی اب گمرہی کا ذریعہ بنتی جارہی ہے۔"ہر کہ خود گم است،کرا رہبری کند"

آج کل ——— ایک نئی بیماری بیعت توڑوانے کی چل پڑی ہے۔شرائط بیعت پر پورے اترنے والے مشائخ کے مریدوں کی بیعت بغیر کسی ہچکچاہٹ کے توڑوائی جا رہی ہے۔مفتی اعظم کے عہد کے بعد اسٹیج پر عمامہ پھیلا کر مرید کرنے کی رسم بریلی سے جاری ہوئی اور اب دیکھا دیکھی،شاید اس خیال سے کہ"ساون سے بھادوں دبلا کیوں"بہت سے پیروں نے یہ رسم عام کردی ہے۔یہ راستہ انہیں کچھ زیادہ نفع بخش نظر آیا ہوگا۔حتیٰ کہ جن لوگوں کے یہاں عمامہ کا چلن نہیں ہے وہ مارکیٹ سے رسّی ہی لاکر لوگوں کو باندھ رہے ہیں۔

ایسے موقع پر،جب کپڑا پکڑانے والے دلال کو کوئی شخص کپڑا پکڑنے سے انکار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں مرید ہوچکا ہوں،تو وہ بڑی ڈھٹائی سے کہتا ہے"تو کیا ہوا پھر ہو جاؤ"اس کم نصیب کو کیا معلوم کہ راہ طریقت کے مجددین میں سرکار محبوب الٰہی اور حضرت مخدوم جہاں کے علاوہ دیگر اولیاء محققین نے بھی اپنے ملفوظات

میں فرمایا ہے کہ صحیح العقیدہ پیر سے منحرف ہوکر کسی اور طرف رجوع کرنے والا شخص مرتد فی الطریقت ہے۔فیض کا دروازہ اس پر ہمیشہ کیلئے بند ہوجاتا ہے۔وہ کوئی بھی عمل کرے،کبھی راہ نہ پائے گا۔

کسی پیر کا اگرکوئی شعور مند مرید ہے۔اس نے پختہ ارادت کے سبب صاف صاف کہہ دیا کہ میں دوبارہ مرید نہیں ہوسکتا تو اس کو ایک نئی راہ دکھائی جاتی ہے کہ ’’طالب ہوجاؤ‘‘ طالب ہونے کا مشورہ دینے والا یہ نیم ملاّ لفظ طالب تو جان گیا مگر بیچارہ یہ نہ جان سکا کہ طالب کون ہوسکتا ہے۔کب ہوسکتا ہے،کس غرض سے ہوسکتا ہے۔اور طالب ہونے کا فائدہ کس پیر سے حاصل ہوسکتا ہے۔مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ مال کسی کا بھی ہو،پیشانی پر اس کے لیبل میرا چسپاں رہے۔اور میری منڈی میں ایک نام کا اضافہ ہوجائے۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

کیا یہ جائے افسوس نہیں ہے کہ جہاں سے جوڑنے کا کام ہوتا تھا،وہیں اب توڑنے کا کام شروع ہوگیا ہے۔صوفیائے کرام علیہم الرضوان نے ’’یک جان دو قالب‘‘ کی مثال قائم کی تھی۔اب ان ہی کے سلسلے کی اشاعت کے نام پر تفریق کا مورچہ مضبوط کرنے میں لوگ لگے ہوئے ہیں۔ایک سلسلے والے دوسرے سلسلہ والوں کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔قادری چشتی میں خلیج پیدا کی جارہی ہے۔اور اشرفی،رضوی کو ایک دوسرے کا حریف ٹھہرایا جارہا ہے۔تحقیق کے نام پر تحقیر کے دروازے کھولے جارہے ہیں اور اب ہزار سال بعد سرکار غریب نواز کے

کارناموں کو کسی اور کا مرہون منت بتایا جارہا ہے۔

اگر ایک طرف،مسند نشینان خانقاہ میں جو علوم دینیہ سے ناآشنا ہیں۔وہ بیعت وارشاد کو اپنی جدی جاگیر سمجھ رہے ہیں۔تو دوسری طرف،صلاح وتقویٰ سے بے لباس مولوی جنہیں بازاری نرخ پر خلافت مل گئی ہے۔بیعت وارشاد کو بازیچۂ طفلاں بنا کر رکھ دیا ہے۔نقال باباؤں اور مکار صوفیوں نے الگ طریقت کی صورت مسخ کر کے رکھ دی ہے۔جس کے بدترین نتائج یہ سامنے آرہے ہیں کہ تعلیم یافتہ طبقہ اس راہ سے برگشتہ ہورہا ہے۔وہابیت اپنا جال مضبوط کررہی ہے۔مسلمانوں میں بد عقیدگی عام ہورہی ہے فرزندان اسلام مغربیت کے اسیر ہورہے ہیں۔اور بے دینوں کا مشن زور پکڑ رہا ہے۔اگر روحانی قدروں کا اس طرح گلا نہ گھونٹا جاتا،اور بزرگوں کی تعلیمات کو سر عام رسوا نہ کیا جاتا تو کل کی طرح آج بھی ہر تحریک پر صوفی ازم ہی غالب رہتی اور باطل نظریات کو پنپنے کا ہرگز موقع نہ مل پاتا۔لوگ کشاں کشاں خانقاہ کی دہلیز پہ چلے آتے۔اور کوئی بھی ان کا راستہ روکنے میں کامیاب نہ ہوتا۔

یہ تو ہمیں تسلیم ہے کہ آج تمام سلسلوں سے رشد وہدایت کی روح تقریباً رخصت ہوچکی ہے۔پیری مریدی رسماً جاری ہے۔بیعت سلوک کا تو اب تصور ہی فضول ہے۔بیعت تو یہ بھی کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔اس لئے کہ بیعت کرنے میں دین کی طلب کی جگہ اب دنیا کی غرض شامل ہوگئی ہے۔یعنی اصل کی سطح سے گر کر اب ہم نقل کی ڈگر پر کھڑے ہوچکے ہیں۔

لیکن ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ اچھوں کی نقل بھی اچھی ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ نقل کی راہ سے اصل تک پہونچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ بشرطیکہ اس نقل کی محرک محبت ہو۔ اور ہر نقل کو ہم اس کی اصلی صورت پر قائم رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ دنیا ہماری نقل کو نقل کہنے سے بھی انکار کردے۔ خانقاہی رسوم وآداب جو انتہائی خلوص اور کمال احتیاط کے ساتھ ہمارے اسلاف انجام دیتے تھے اور جس کے پیچھے سر بسر للّٰہیت کار فرما ہوتی تھی۔ آج اس کی مثالی صورتیں قدیم خانقاہوں میں دیکھنے کو مل جاتی ہیں تو طبیعت مسرور ہو جاتی ہے۔

ہم اگر—— اسلاف کا سا اخلاق نہیں لا سکتے، تو کم از کم آزار خلق کے راستوں سے تو بچیں۔

ہم اگر—— اگلوں کا سا تقویٰ اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے، تو کم از کم فریب کی راہوں سے تو گریز کریں۔

ہم اگر—— بزرگوں کا سا تواضع اختیار نہیں کر سکتے، تو کم از کم خودستائی کا سودا تو ذہن ودماغ سے نکال پھینکیں۔

ہم اگر—— دوسرے مشائخ کی عظمت اپنی مجلسوں میں بیان نہیں کر سکتے، تو کم از کم ان کے شکوہ کا دروازہ تو اپنے مریدوں پر بند کر دیں۔

ہم اگر—— اپنے شب وروز کا محاسبۂ عمل نہیں کر سکتے، تو کم از کم دوسروں کو ہدف ملامت بنانے سے تو پرہیز کریں۔

ان میں پہلی تمام صورتیں میدان طریقت کی تھیں اور دوسرے تمام چہرے

راہ شریعت کے ہیں۔ مخدوم جہاں حضرت شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری رضی اللہ عنہ اپنے خلیفہ اجل حضرت مولانا مظفر شمس بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔ ’’بھائی مظفر! اگر تم منزل طریقت سے گر جاؤ، تو زینۂ شریعت پر ضرور قائم رہنا۔ کیونکہ حدود شریعت سے باہر ہو جانے والا کہیں کا بھی نہیں ہوتا ہے۔‘‘

ہمارے یہ معروضات ہیں جن پر گرامی مرتبت ارباب خانقاہ اور علم برداران شیوخ ودرگاہ نے اپنی تھوڑی سی توجہ مرکوز کردی، اور اصلاح حال کا خیال، خاطر شریف میں لے آئے تو انشاء اللہ بگڑتے حالات جلد سنور سکتے ہیں۔ ٹوٹتے رشتے پھر سے جڑ سکتے ہیں۔ مجروح دلوں کے زخم مندمل ہو سکتے ہیں۔ اخلاص ووفا کی راہیں پھر آباد ہو سکتی ہیں۔ سواد اعظم اہل سنت وجماعت کے بکھرتے شیرازے مجتمع ہو کر خانقاہ کش تحریکوں کا قلع قمع کر سکتے ہیں۔

عقائد واعمال جن کے پراگندہ ہیں، میں ان سے اتحاد پیدا کرنے کا داعی نہیں ہوں۔ میں اپنوں کی جناب میں عرض گذار ہوں کہ صرف تعداد بڑھانے کا خمار دماغ سے دور کر کے اپنے زندہ رہنے کی سبیل پیدا کیجئے۔ میں نے جب ملک کے منتخب علماء کے مریدوں کو غیروں کے کیمپ میں ہاتھ باندھے کھڑا دیکھا تو مجھ پر بجلی گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس طرح کی تعداد بڑھانے کا آخر کیا حاصل۔ میں اپنی اس تلخ نوائی کے لئے اپنے بڑوں کی بارگاہ میں معذرت خواہ ہوں۔

کہتے ہیں جس کو زخم محبت کچھ اور ہے
کہنے کو یوں تو گل کا بھی سینہ فگار ہے

☆☆☆

بگڑتے حالات، بدلتے تقاضے

ایسا کچھ کر کے چلو یاں، کہ بہت یاد رہو

عالمی منظر نامے پر نگاہ ڈالئے اگر آپ کے سینے میں دین کا درد رکھنے والا دھڑکتا ہوا دل ہے تو اس کرب سے آپ کی آنکھیں نم ہو جائیں گی کہ آج اہل باطل اپنے فاسد نظریات کی اشاعت کے لئے ہر طرف سرگرم عمل ہیں۔ اور اہل حق بے حسی کی چادر تان کر سرد مہری کے بستر پر بے خبری کی نیند سو رہے ہیں۔ جس کے سنگین نتائج یہ سامنے آرہے ہیں کہ ہماری نسل ہم سے دن بدن دور ہوتی جارہی ہے۔ وہ خاندانی شناخت بھولتے جارہے ہیں اور حق کی پاسداری کا جذبہ ان کے دلوں سے محو ہوتا جارہا ہے۔

نیا مدرسہ اور نئی مسجد تعمیر کرنے کے بعد ضابطے کے رجسٹر پر آپ شرائط تحریر کرتے ہیں کہ اس مدرسہ اور مسجد کے صدر و سکریٹری اور اراکین و اساتذہ اہل سنت و جماعت بریلوی مسلک کے ہوں گے۔ خدارا آپ مجھے بتائیں کہ آپ کی اولاد آپ کے نعروں کا پالن بھول جائے گی۔ اس کے معتقدات کے پیمانے بدل جائیں گے۔ اور آپ کے نظریات کی عظمت اس کے دل سے نکل جائے گی۔ تو آپ کے ان ضابطوں پر عمل درآمد کون کرائے گا۔ آپ اسے پہیلی نہ سمجھئے، بہار شریف میں ہمارے سامنے اس کی زندہ مثال موجود ہے۔ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں بہار شریف محلّہ بارہ دری کی دردانگیز حقیقت سپرد قلم کر دیتا۔

مثل مشہور ہے کہ ایک مچھلی پورے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے، ایسے ایسے

خاندانوں کے بچے بگڑ رہے ہیں جن کے بگڑنے کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایسے ایسے باپوں کے بیٹے بے راہ ہو رہے ہیں، جن کا باپ زندگی بھر سنیت کا علم بردار رہا تھا۔ ایسے ایسے ہونہار سپوت مسلک اعلیٰ حضرت جن کے مربّیوں کا وظیفہ تھا۔ وہ مسلک و جماعت کا درد بھول چکے ہیں۔ کاش! پہلے ان کی رگ رگ میں سنیت پرو دی جاتی۔ بعد میں وہ انجنیر، ڈاکٹر اور پروفیسر بنتے ـــــ کل تک کسی بھی متصادم نظریہ سے نپٹنے کے لئے رد کی تقریریں اور مناظرہ کی مجلسیں کافی ہوتی تھیں۔ اور ان کے مثبت نتائج بھی سامنے آتے تھے۔ مگر آج جنگ کا میدان بدل چکا ہے۔ رد کی تقریریں سود مند نہیں ہیں۔ مناظرے کا اثر غلط پروپگنڈے کے شور میں دب کر اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ عوام ہار جیت کا فیصلہ نہیں کر پاتے اور حق و باطل کے درمیان فرق معلوم کرنے میں مخمصے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

عہد رواں میں باطل کا بطلان واضح کرنے اور حق کی شاہراہ جاری رکھنے کے صرف دو راستے ہیں۔ ایک وہ قلم جو پُر خار جملوں سے گریز کر کے دلائل کی زبان بولنا جانتا ہو۔ دوسرا وہ حرکت و عمل۔ جو ذاتی منفعت، حرص و طمع اور نفع و ضرر کے تصور سے دور ہٹ کر اٹھنے والے قدم سے رشتہ جوڑتا ہو۔ ہماری یہ دو کوششیں ہر حال میں بار آور ہوں گی اور ہم بہت تھوڑے دنوں میں اس کے ثمرات برائے العین دیکھیں گے ـــــ لیکن آج ہم کن جملوں میں اپنا ماتم کریں کہ ان ہی دونوں راستوں کی قدر ہماری جماعت آج بھولتی جارہی ہے۔ اور ان راستوں پر چلنے والوں کی ناقدری بڑھتی جارہی ہے۔ مفاد پرستی کا عفریت نفسانیت کا تغزیہ پا کر اتنا تنومند ہو کر ہمارے درمیان کھڑا ہو گیا ہے کہ اب اس کا انہدام

ہمارے لئے ایک مشکل مسئلہ بن چکا ہے۔کاش!ہم اپنی دنیا جنت نشان بنانے سے پرے اٹھ کر مسلک اور جماعت کے لئے بھی کچھ سوچتے۔

قادیانی فرقہ :- بنام مذہب وجود میں آنیوالے فرقوں میں جو فرقہ جتنا زیادہ بے راہ ہے۔اور جس قدر ضلالت کے آب وگل میں دھنسا ہوا ہے۔وہ اتنا ہی زیادہ اپنی جماعت کے فروغ کیلئے کوشاں ہے۔ایک بد باطن کو نبی تسلیم کر کے قرآن سے کھلی بغاوت کرنیوالا سب سے مہلک دین فرقہ قادیانی ہے۔ یہ اپنی احمدی جماعت کو عالم اسلام کی نمائندہ جماعت منوانے کے لئے جان توڑ محنت کر رہا ہے۔ یہ اپنی بدعقیدگی کا طوق فرزندان اسلام کی گردنوں میں ڈالنے کیلئے ہمیشہ ہر جتن پر آمادہ رہتا ہے ـــــ ابھی کچھ ہی دنوں پہلے کی بات ہے۔ارریہ میں محمد عالم نام کا ایک ڈی،ایم آیا، جو مذہباً قادیانی تھا۔ اس نے قادیانیت قبول کرنے والوں پر سرکاری مراعات کی برسات کردی۔ یہ قومی فنڈ کا غلط استعمال تھا۔ملت کے غم گساروں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے اسے شہر بدر کرایا۔یہ اپنی اسلام دشمن تحریک قادیانیت کی تشہیر کیلئے وقت اور مال دونوں کی قربانی کے لئے ہمہ وقت کمر بستہ رہتے ہیں۔اس کام کے لئے ان کے یہاں باقاعدہ مالیات کا محکمہ قائم ہے ـــــ قرآن کی تفسیر بالرائے کر کے انہوں نے اسلام کا چہرہ مسخ کر ڈالا ہے۔اپنے ساتھ ساتھ اپنے افراد خاندان کو بھی اپنے پرگندہ خیالات کا پیرو بنانے میں یہ نہایت چست ودرست واقع ہوئے ہیں۔ہم نے قادیانی نامہ میں پڑھا تھا۔ یہ فرمان مرزا صاحب ہی کا ہے"خبردار!تم اپنی بیٹیوں کو غیر احمدی کے نکاح میں نہ دو۔ایسا کرنے

پر تم مسلمہ کو کافرہ بنانے کا جرم کرو گے۔ہاں!غیر احمدی کی لڑکیاں لاؤ اس طرح ایک کافرہ کو مسلمہ بنانے کا تم کو اجر ملے گا"(خطبات قادیان)

معاذ اللہ! کس طرح وہ اپنے علاوہ پورے عالم اسلام کو کافر قرار دینے کی جسارت کر رہا ہے۔جس طرح اہل تشع اپنے بچوں کو کہیں تعلیم دلائیں پہلے ان پر مذہب کا اتنا گہرا رنگ چڑھا دیتے ہیں کہ وہ کسی بھی ماحول میں رہے دوسروں کا اثر قبول نہیں کرسکتا اور کبھی شیعیت سے بیزار نہیں ہوسکتا۔ بالکل اسی طرح قادیانی اپنے لڑکوں پر اپنے مذہب کی ایسی چھاپ لگادیتا ہے کہ وہ کہیں بھی چلا جائے،قادیانی ہی رہے گا بدل نہیں سکتا۔

قادیانی دو قسم کے لوگوں کو اپنا ہدف بناتے ہیں اور انہیں اپنی طرف مائل کر لینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ (۱) ان لوگوں کو جو تعلیم یافتہ ہو کر بھی اسلامیات سے کوسوں دور ہیں۔دینی مسائل کا انہیں علم نہیں۔اپنے اسلاف کے معتقدات انہیں معلوم نہیں اپنی راہ سے وہ بے خبر ہیں۔(۲) ان لوگوں کو جوان پڑھ ہونے کے ساتھ ساتھ تنگدستی کے اسیر ہیں۔مفلسی نے ان کو دینیات پڑھنے کا موقع نہیں دیا۔وہ رسم وروایات کی ڈوری پکڑ کر چل رہے ہیں ـــــ پہلی قسم کے لوگوں سے ذہین،شاطر اور چالاک مبلغین جوان کے ہم پلّہ اور ہم رتبہ ہوتے ہیں۔ان سے راہ ورسم بڑھاتے ہیں اور دوستی کا ماحول بناتے ہیں۔پھر ان سے ذہن میں ہیجان پیدا کردینے والی گفتگو کرتے ہیں۔اس کے بعد ان کی ژولیدہ فکر کو آسودگی بخشنے کے نام پر اپنا زہر آلود لٹریچر ان تک پہونچاتے ہیں جو ہر زبان میں مہیا ہوتے ہیں۔دین سے ناواقفیت کی بنیاد پر یہ لٹریچر انہیں قادیان کی راہ پر لا کھڑا کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے لوگوں کے پاس عموماً مالدار لوگ پہونچتے ہیں۔ وہ پہلے ان کی خستہ حالی پر ہمدردی جتاتے ہیں۔ پھر ان کے ٹوٹے جھونپڑے کو دیکھ کر رنج وملال ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے بعد قادیانی تحریک سے جڑ جانے کا ان کو مشورہ دیتے ہیں۔ اور خوشحال زندگی کا انہیں خواب دیکھاتے ہیں۔ پہلی قسط کے طور پر رکشہ پولروں کو حق مالکانہ ادا کرنے سے بچانے کیلئے نیا رکشہ خرید دیتے ہیں۔ ٹھیلہ چالکوں کو گدی دار کے پھٹکار سے نجات دلانے کیلئے نیا ٹھیلہ مہیّا کر دیتے ہیں۔ ٹوٹی گمٹی میں بیٹھنے والوں کیلئے بڑی اور عمدہ گمٹی بنا دیتے ہیں۔ پھونس کے جھونپڑے کو کھپڑیل اور کھپڑ پوش کو البسڈر کے مکان میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

انجام کار بتانے کی ضرورت نہیں۔ دل جیت لینے کے بعد ایمان لوٹ لینا کیا مشکل ہے۔ اور ان نوازشات کے بعد دوسرے بدحال لوگوں کو ان کے گرد جمع ہونے سے کون روک سکتا ہے۔ یہ کوئی افسانہ نہیں، حقیقت ہے۔ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سے فراغت کے بعد ۱۹۶۷ء میں جب میں رانچی پہونچا تو ان دنوں رانچی کے دیہی علاقوں میں قادیانی فتنے کی ہوا تیز بہہ رہی تھی۔ پھٹکل ٹولی اور سملیا گاؤں کے کچھ لوگوں کو اسی سازش کے تحت قادیانی ممبر بنالیا گیا تھا اور یہ سلسلہ برابر جاری تھا۔

قادیانیوں کے رد میں جلسہ:۔ اس دور میں مدرسہ غریب نواز مکتب کی شکل میں تھا۔ شہر میں مقامی اور کچھ بیرونی سنی آباد تھے۔ اہل سنت کے جلسے ہوا کرتے تھے مگر شہر کی مسجدوں پر دیوبندیوں کا قبضہ تھا۔ مدرسہ حسینیہ عروج پر تھا۔ نگڑی، سسئی وغیرہ مضافات میں بھی ان کے مدرسے چل رہے تھے۔ چنانچہ قادیانی فتنے کے سدّباب کی پہلی کوشش بھی ان ہی کی طرف سے ہوئی۔ مارچ ۱۹۶۸ء کے کسی اتوار کو دن کے وقت

پھٹکل ٹولی کے باغ میں قادیانیوں کے رد میں جلسہ منعقد ہوا۔

کافی بھیڑ اکٹھا ہوئی شہر اور مضافات کے کئی درجن مولوی جمع ہو گئے۔ رانچی میں سنی کوئی عالم تھا نہیں۔ بس بتیس دانتوں کے درمیان ایک زبان کی حیثیت میری تھی۔ ۱۰ر بجے سے قادیانیوں کے رد میں دھواں دھار تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ قادیانی بھی ان کاروائیوں سے بے خبر نہیں تھے۔ رانچی کا نامور بنّو وکیل، قادیانی فتنے کا سربراہ تھا۔ اسے اس پروگرام کی اطلاع مل چکی تھی اور اس نے قادیان سے دو منجھے ہوئے مناظر کو بلوالیا تھا ــــــ ٹھیک ۱۱ر بجے بنّو وکیل میز، کرسی اور لاؤڈ سپیکر کے ساتھ ان دونوں مناظرین کو لیکر جلسہ گاہ میں پہونچ گیا، اور للکار للکار کر چیلنج مناظرہ دینے لگا۔ مولانا سید جمیل اختر جن کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا اور چرب زبان تھے۔ انہوں نے جرأت مندانہ تقریر کا سلسلہ جاری رکھا اور قادیانیوں کی للکار کا کوئی جواب نہیں دیا۔ گھنٹہ بھر خلفشار مچانے کے بعد بوڑیا بستر لپیٹ کر وہ اپنے ہمنواؤں کے ساتھ چلتے بنے اور تقروں کا سلسلہ جاری رہا، اس ہنگامہ آرائی کا قادیانیوں کو اتنا فائدہ ضرور پہونچا کہ سملیا کے مرتدین قادیانیت سے توبہ کر کے واپس نہیں لوٹے۔ اور جلسہ کرنے کا اتنا نتیجہ ضرور نکلا کہ قادیانیوں کے بڑھتے قدم تھم گئے۔

قادیانیوں کا چیلنج قبول نہ کرنے کی دو وجہ تھی۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ جلسہ میں کوئی منجھا ہوا مناظر نہیں تھا۔ جبکہ دوسری طرف قادیان سے دو گھاگھ قسم کے مناظر راتوں رات بلالئے گئے تھے۔ اور وہ پورے حربہ وہتھیار سے لیس ہوکر اچانک جلسہ گاہ میں آدھمکے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مناظرہ کیلئے کچھ اصول وضابطے ہوتے ہیں۔ شرائط

طے کی جاتی ہیں۔فیصل مقرر کئے جاتے ہیں پولس محکمے میں اطلاع اوران کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔ بحث وتکرار شروع کردی جاتی اور بات بڑھ کرنوبت تصادم تک پہونچتی تو قادیانی مارے جاتے،اس کے بعد مسلمانوں کی گرفتاری شروع ہو جاتی۔ اور وہ سنگین مقدموں میں ماخوذ ہو جاتے۔لیکن عوام کوکون سمجھائے ،شہر سے لیکر دیہات تک بس ایک ہی آواز تھی اگر قادیانی کافروبے دین ہیں توان سے یہ مولوی حضرات کیوں ڈر گئے۔ اور ان کا چیلنج مناظرہ قبول کرنے سے کیوں گریز کیا ـــــ جلسہ کے ہفتہ وعشرہ بعد مین روڈ میں شہر کے سرمایہ داروں کی ایک مٹینگ ہوئی۔ اس مٹینگ میں مجھے طلب کرکے ارباب بست وکشاد نے کہا، مولانا! یہ دیوبندی علماءقادیانیوں سے مناظرہ نہیں کرپائیں گے۔آپ سنی علماءکرام سے مناظرہ کے لئے تاریخ لیجئے۔ہم لوگ بتّو وکیل کومناظرہ کرانے پرمجبور کریں گے۔اخراجات کیلئے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ہم چندلوگ مل کرسارابار اٹھالیں گے۔سنی علماء سے رابطہ کرنے کی ذمہ داری قبول کرکے میں مسرورواپس ہوا۔

سب سے پہلے میں نے علامہ ارشدالقادری علیہ الرحمہ سے رابطہ کیا۔انہوں نے حوصلہ افزاءگفتگو کی۔مجاہد دوراں حضرت مولانا سید مظفرحسین کچھوچھوی جمشید پور میں موجود تھے۔ان سے بھی بات کرادی۔وہ مناظرتو تھے نہیں،مگر حالات پرقابو پانے کا داؤ پیچ خوب جانتے تھے۔ ماسوااس کے بلند آہنگ مقرر تھے اورمقرر کا پینترا بھی مناظرے میں کام آتا ہے۔حضرت علامہ نے فرمایا،آپ سلطان المناظرین حضرت مولانا شاہ رفاقت حسین صاحب سے رابطہ کیجئے اور میں اڑیسہ جارہا ہوں وہاں ایک

پروگرام میں مجاہدملت حضرت مولانا شاہ حبیب الرحمٰن صاحب سے ملاقات ہوگی میں ان سے منظوری حاصل کرلوں گا۔قادیانیوں سے مناظرہ کرنے کا فن وہ خوب جانتے ہیں ـــــ ان تمام لوگوں سے منظوری حاصل ہوگئی۔تاریخ کیلئے طے پایا کہ ”بہار صوبائی سنی کانفرس سیوان“ میں تاریخ کا فیصلہ کرلیا جائے گا۔یہ واقعہ ادارہ شرعیہ بہار کے قیام سے پہلے کا ہے۔رانچی ہی سے میں مئی ۱۹۶۸ء میں بہار صوبائی سنی کانفرنس میں سیوان پہونچا تھا۔حضرت علامہ نے حضور مفتی اعظم ہند سے مجھے ملایا۔اور میری خدمات کوسراہتے ہوئے حضرت کومناظرہ سے متعلق تفصیل بتائی۔مفتی اعظم نے مجھے قریب بیٹھا کر فرمایا،سید صاحب! قادیانیوں سے موضوع مناظرہ طے کرتے وقت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات وموت کومناظرے کا موضوع ہرگز طے نہ کیجئے گا۔اگر بالفرض انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی موت ثابت بھی کردی تو ہمارے ایمان کی صحت پراس کا کیا اثر پڑے گا۔اتنا یاد رکھئے کہ قادیانیوں سے مناظرے کا موضوع ہمیشہ ختم نبوت متعین کرنا چاہئے ـــــ حضرت کا ارشاد دل کی ڈائری میں نوٹ کیا اور کانفرنس کے بعد سیوان سے رانچی آگیا۔رانچی پہونچنے کے بعد میری سرگرمی میں تیزی آگئی۔ایک دن میں سولہ سولہ میل سائیکل سے دوڑ لگاتا تھا۔اسی دوران ہندواور کرسچین کے درمیان فساد پھوٹ پڑا۔اور دن بدن اسمیں تیزی آتی گئی۔ یہاں تک کہ دیہات بھی فساد کی لپیٹ میں آگئے۔لہٰذا حکومت کی جانب سے حکم امتناعی نافذ ہوگیا،اور جلسہ وجلوس غیر معینہ مدت کیلئے منسوخ کردیئے گئے۔اور ہرطرح کے پروگرام پر پابندی عاید ہوگئی ـــــ دومہینے میں لوگوں کے جذبات سرد پڑ گئے۔لاکھوں کے خرچ کا موڈ بنا لینے

والے سستی دکھانے لگے۔ دیوبندی ہماری سرگرمیوں سے بے خبر نہیں تھے۔وہ اس پروگرام کو اپنے لئے خطرے کا الارم تصور کررہے تھے۔ان کا سوچنا بھی غلط نہیں تھا۔اگر ہمارے اس پروگرام میں رکاوٹ پیدا نہ ہوئی ہوتی تو رانچی کا پانسہ تو پلٹ ہی چکا تھا۔لہٰذا دیوبندیوں نے ہوا کا رخ بدلنے پر پورا زور صرف کیا۔یہ بھی چرچا کیا کہ ایک فساد کے بعد حکومت دوسرے فساد کو دعوت نہیں دے گی ـــــ حضرت علی مرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ وجہہ کا قول ہے ”**عرفت ربی بفسخ العزائم**“ ارادے ٹوٹ جانے سے مجھے رب کی معرفت حاصل ہوئی۔یعنی میں نے تو بہت چاہا،مگر میرے رب نے نہیں چاہا، اس لئے کامیابی سے دور رہا، بزرگوں کا یہ ارشاد اسی معنی میں ہے۔”کار کن ،تکیہ برجبّار کن“ میں نے بغیر کسی یافت کی امید کے مہینوں جس طرح بھاگ دوڑ کی تھی ،اس کی مثال کم از کم اس زمانے میں تو ممکن نہیں مگر مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ“ ـــــ آپ باور کیجئے ،رانچی کی صورت حال ایسی تو بن ہی چکی تھی کہ اگر ڈورنڈہ کا مدرسہ غریب نواز میرے ہاتھ میں ہوتا۔اور حضرت شاہ عبدالحق چشتی علیہ الرحمہ کی پرخلوص سرپرستی میرے ہمدوش ہوتی تو لاریب آج رانچی کا نقشہ اور ہی کچھ ہوتا،مگر شاید قدرت ہی کو یہ منظور نہ تھا”اے بسا آرزو کہ خاک شدہ“ ۔

کس شام نہ بھیگیں یہ پلکیں ، کس صبح یہ دامن نم نہ ہوا
بجلی بھی تڑپ کر تھمتی ہے، اس دل کا تڑپنا کم نہ ہوا

غیرمقلد وہابی :- اس فرقہ ضالہ کا فتنہ عہد رواں میں اپنے عروج پر ہے۔اس کی فتنہ سامانیوں کی پشت پناہ اس وقت حکومت سعودیہ ہے۔ جو محمد بن عبدالوہاب نجدی

کے گمراہ کن نظریات کی علم بردار ہے۔محمد بن عبدالوہاب ایک ذہین شخص تھا۔لیکن اس کے علم وعقل پر خودنمائی اور انا،کا عنصر غالب تھا۔انگریز اس کی اس کمزوری کو تاڑ گئے ۔ اسے اپنے مشن کیلئے ایک کامیاب شخص جان کر اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اس سے راہ ورسم پیدا کی اور ہم نوالہ وہم پیالہ بن کر اس کی انا کے پودے کی خوب خوب آبیاری کی ـــــ پہلے تو ائمہ مجتہدین کی فہم وذکاء سے اس کی ذہانت وذکاوت کو بالاتر بتا کر اس کی گردن سے ائمہ کرام کی تقلید کا قلادہ اتارا۔یہاں تک کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں اس نافرجام سے جسارت کا ارتکاب کرایا۔اس کے بعد اس کے پراگندہ ذہن میں ایک نئے دین کا پودا لگایا۔چنانچہ سواد اعظم اہل سنت سے کٹ کر وہ ایک نئی راہ کا بانی قرار پایا۔آج اسی بد باطن کی قائم کردہ ڈگر پر حکومت سعودیہ چل رہی ہے۔اور پورے عالم اسلام کو بھی چلتا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔

علم کی دو قسمیں ہیں علم رحمانی اور علم شیطانی۔صوفیاء علیہم الرضوان نے ہمیشہ علم رحمانی کی آرزو کی ہے اور علم شیطانی جو غرور وشرور کا سبب بنتا ہے۔اس سے پناہ چاہی ہے۔ ولی اللہی خاندان کے ایک جید عالم ،مولوی اسمٰعیل دہلوی، علم شیطانی کے اسیر ہوئے اور نجد کے اسی موذی شخص کی حمایت کا جھنڈا اٹھایا۔سید احمد بریلوی کو ساتھ لیکر غیر منقسم ہندوستان میں اس کے فرسودہ خیالات کی گھوم گھوم کر تشہیر کی اور ان دونوں کی متحدہ کوششوں سے بساط ہند پر غیر مقلدین کی جماعت پیدا ہوئی۔

چونکہ ان کا طریقہ عبادت الگ تھا۔اس لئے سواد اعظم اہل سنت کے جوانوں کو ورغلانے میں یہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔اوران کی تعداد دال میں نمک کے برابر

رہی۔ان کی مسجدیں خال خال ہی دیکھی جاتی تھیں۔لیکن جب سے بسلسلۂ ملازمت باہر جانے کا چلن چل پڑا۔ اور ہندو پاک کے مسلم نوجوان سعودی عربیہ اور عرب امارات کی دوڑ لگانے لگے۔غیر مقلدین کے اداس خیمے میں بہار آگئی، وجہ ظاہر ہے، باہر جانیوالے جوانوں میں اسلامی عقاید ونظریات میں پختہ کار افراد کم تھے۔ جو معلومات کے اجالے میں اپنی ڈگر پر جمے رہے۔ بیشتر نوجوانوں کا ذہن کورے کاغذ کے مانند دینیات کے نقوش سے خالی تھا۔ان کی رنگ بازی ان جوانوں کے صاف ذہنوں پر بدعقیدگی کا داغ دھبّہ لگانے میں آسانی سے کامیاب ہوگئی۔

آج ہر مسلم آبادی میں مدارس قائم ہو چکے ہیں۔ جہاں اردو،قرآن ،دینیات اور ایمان وعقائد کی مفت تعلیم دی جاتی ہے مگر لڑکا گلی کوچے میں گولی کھیلے گا ۔اور جب ذرا ہوشیار ہوا۔ گیرج اور کارخانے میں ڈال آئے۔ یہ جوان ہوکر کیسا مسلمان نکلے گا۔ یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے؟ ایسے ہی لوگ باہر جاتے ہیں، وہاں سے وہابیت کا گھونٹ پی کر آتے ہیں اور بدمستی میں شر وفساد پھیلاتے ہیں۔دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو تعلیم کا مزاج رکھتے ہیں۔ بچہ زمین پر چلنے لگا،منہ سے بولنے لگا۔ اسے اٹھایا اور انگلش میڈیم میں پہنچا دیا۔اگر پوچھ دیجئے کہ بچے کو آپ نے دینیات و قرآن پڑھوایا ہے۔ جواب ملتا ہے وقت آئے گا تو پڑھ لیگا۔لیکن وہ وقت کبھی نہیں آتا ۔لڑکا اسکول سے کالج پہنچا، کالج سے یونیورسیٹی پھر وہاں سے برطانیہ اور فرانس پہونچ گیا۔اب وہ سلمان رشدی بنے چاہے تسلیمہ نسرین، جناب تو قبر میں ہونگے۔

ہمارے جوان دوسبب سے گمراہ ہوتے ہیں۔اولاً یہ کہ ان کے دل پر مقامات

مقدسہ کی عظمت چھائی رہتی ہے وہ کم علمی کی بناء پر یہ سمجھتے ہیں کہ اس ارض پاک سے اقصائے عالم میں اسلام پہونچا ہے۔ یہاں کے لوگ غلط کیسے ہوسکتے ہیں۔وہ یہ نہ سمجھ پائے کہ سبائی فتنے یہیں سے پیدا ہوئے۔مروان نے سازش کا جال یہیں بچھایا۔یزید کی حکومت یہیں قائم ہوئی۔اسلامیات سے بے خبری کے نتیجے میں امریکہ اور برطانیہ کے ڈگری رکھنے والوں کا شمار بھی جاہلوں میں ہے۔ان کے سامنے ہندی،انگلش لٹریچر رکھا گیا۔اسے دیکھا اور نجدیوں کی زبان اپنے منہ میں رکھ کر ان ہی کی بولی بولنے لگے۔

جب باغباں نے آگ دی آشیانہ کو مرے
جن پہ تکیہ تھا، وہی پتے ہوا دینے لگے

ثانیاً یہ کہ وہ نوجوان جو بحث وتکرار میں نجدیوں کا ناطقہ بند کرسکتے ہیں۔ان بے چاروں کا غم خاموشی پر مجبور کرتا ہے کیونکہ عربی توپ پہننے والے یہ سعودی مبلغین ان کی ملازمت ہڑپنے کے لئے منہ پھاڑے رہتے ہیں۔ جہاں کسی نے ذرا سی اڑ دکھائی،فوراً شکایت ہائی کمان تک پہونچ گئی اور وہاں سے واپسی کا ٹکٹ کٹ گیا۔اس خوف سے یہ مظلومین چپ کے گوشے میں جابیٹھنے پر مجبور ہیں۔اوران کے کم فہم ساتھی فریب کے شکنجے میں جکڑ دئے جاتے ہیں ——— انجام یہ دیکھا جارہا ہے کہ سعودیہ کی پیٹ بھر روٹی کھانے والا جب وطن لوٹتا ہے تو ان ہی کی بولی بولنے لگتا ہے۔پہلے اس کے اقرباء تذبذب کے شکار رہتے ہیں۔ پھر وہ اپنے دوستوں کو سرمایہ کے زور پر اپنا ہمنوا بناتا ہے۔اس طرح خالص سنی آبادی میں ان کی ایک ٹولی تیار ہوجاتی ہے۔اس کے بعد اس ٹولی کے لئے سعودی ریال سے مسجد بھی بن جاتی ہے۔اور آج ایسے لوگوں

کی کمی نہیں جو مسجد ضرار کو بھی مسجد ہی سمجھتے ہیں۔قریب کا خیال کر کے وہاں پہونچنے لگے ۔اوران کی بکواس کانوں کے راستے دل تک پہونچانے لگے۔اس طرح ایک منظّم مسلم آبادی کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہےاوروہ آبادی دو پاٹ میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

آج تقریباً پورے ہندوستان میں غیر مقلد مولویوں کی ایک ٹیم حکومت سعودیہ کی ایجنٹ بن کر گھوم رہی ہے جس کا کام ہی یہ ہے کہ عرب کے شیوخ اور سعودی محکمہ ٔمالیات کے سامنے اپنی جماعتی سرگرمی کا بجٹ پیش کریں اور وہاں سے رقوم حاصل کر کے یہاں مسجدیں تعمیر کرائیں بنین وبنات کے مدرسے بنوائیں۔وہابی مشن کے فروغ کے لئے ذرائع ووسائل اپنائیں۔اوراسی کے طفیل اپنے لئے بھی شداد کی جنت تیار کرا لیں۔سواداعظم کی زبوں حالی کا اگر دل میں کچھ درد ہے،تو آنکھوں سے خود بینی کی عینک ہٹائے اورزمانے کی نیرنگی کا تماشہ دیکھئے۔

اے چشم اشکبار ، ذرا دیکھ تو سہی
ہوتا ہے جو خراب ، وہ تیرا ہی گھر نہ ہو

بات اگر تقلید سے انکار پر ہی بس ہوتی تو خاموشی کو راہ دی جاسکتی تھی۔مگر شہر ،دیہات،اسکول،کالج اورسرکاری دفاتر ہرجگہ اس فتنے نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا ہے۔اسلاف سے نئی نسل کا رشتۂ عقیدت توڑنے کے لئے ائمہ مسلمین کا استخفاف فقہائے امت کے ساتھ استہزاء اور بالخصوص امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی شان اجتہاد میں طنز وتعریض اورآپ کی علمی عبقریت پر سفیہانہ گفتگو کا عام شیوہ بن گیا ہے ——اللہ غریق رحمت کرے مولانا محمد داؤد مصباحی کو،آہ!اب وہ ہمارے درمیان

نہیں رہے۔تقریر میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ آمین کی دوقسمیں ہیں۔پہلی قسم،آمین بالسّر،یعنی خود سنے،دوسرے تک آواز نہ پہونچے۔یہ احناف کا مسلک ہے۔دوسری قسم،آمین بالجہر،یعنی اس کا آمین کہنا بغل والا بھی سن لے۔اور یہ شوافع کا مسلک ہے ۔لیکن ان موذیوں نے ایک تیسری قسم نکالی ہے آمین بالشّر،یعنی ایسی آواز نکالو کہ سارے مصلیوں کی نماز خراب ہو جائے ——ہمارے مدرسہ اصدقیہ مخدوم شعیب شیخ پورہ کی مسجد میں ہر جمعہ کو تین منچلے آتے اوراگلی صف میں ایک ساتھ مل کر بیٹھتے۔ اورٹانگ پھیلا کر کھڑے ہوتے۔امام سورۂ فاتحہ ختم کرتا تو آواز میں آواز ملاکر سرتان کے ساتھ اس طرح آمین کہتے کہ سبھوں کی نماز خراب ہو جاتی۔مجھے اس کا علم نہ تھا۔ایک جمعہ کو میں اس مسجد میں نماز جمعہ پڑھا رہا تھا۔جب آمین کا شور برپا ہوا تو مجھے سخت کوفت لاحق ہوئی۔دوسرے جمعہ سے میں نے اپنے طلباء کو ہدایت دی کہ وہ اذان کے بعد ہی اگلی صف کو گھیر کر بیٹھ جائیں۔اس طرح سے ان کی جمعیت ٹوٹی اور الگ الگ کھڑے ہونے پر آواز شرارت مدہم ہوگئی ——حدیثوں سے مسائل کا استخراج ائمہ اورفقہاء کا کام ہے نہ کہ سفہاء کا۔مگر آج ہم معزز خاندان کے لڑکوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ حنفی مسلک کی تائید میں حدیثیں نہیں ملتیں۔جبکہ اہل حدیث کا عمل حدیثوں پر ہے۔ان کے مسلک کی تائید میں بکثرت حدیثیں موجود ہیں۔انہیں کون سمجھائے کہ احادیث کے بحر بے کراں میں غوطہ خوری تمہارے بس کی بات نہیں۔ پھر تم نے ان ناکندہ تراش لوگوں کی ہفوات پر یقین کیسے کرلیا ——کچھ اندازہ کیا آپ نے!یہ ہے باطل کے پاس داروں کی سرگرمی کا حاصل۔اوران کی شب وروز کی

محنتوں کا نتیجہ ۔ ورنہ کالج کے طلباء کو ان بحثوں سے کیا سروکار ۔ وہ اپنے سرپرستوں کے طریقہ پر نماز ادا کرلیں، یہی ان کے لئے بہت ہے ۔ دوسری جانب ہماری مساجد کے اماموں کا حال کچھ نہ پوچھئے اگر کسی مقتدی سے ان کی کوئی غرض وابستہ ہے تو دن بھر میں دس مرتبہ اس کے دروازے پر پہونچ کر دستک دیں گے ۔ لیکن اگر کسی مصلی جواں سال کا قدم پھسل رہا ہے۔اورقعر مذلت میں اس کے گر جانے کا اندیشہ سامنے ہے۔تو اس کی ذہن سازی کے لئے مسجد میں دس منٹ بیٹھنے کا ٹائم نہیں ہے۔"الا ما شاء الله"اوراگرمقتدیوں نے گذارش کردی کہ کسی نماز کے بعد کوئی تفسیر یا مسائل کی کتاب پڑھا کیجئے تا کہ ہم لوگ بھی کچھ سیکھیں تو امام صاحب کا جواب ہوتا ہے کہ یہ میری ڈیوٹی نہیں ہے ۔ پہلے آپ کمیٹی سے میری تنخواہ بڑھوائیے۔ پھر مجھ سے مطالبہ کیجئے ۔ **الامان والحفیظ** ۔

اگر اس طرح مینہ برستہ رہے گا
تو کاہے کو جانے کا رستہ رہے گا

مقلد وہابی:- اس فرقے کو حضرت شاہ امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرکش مریدوں نے پروان چڑھایا۔ایک نے دیوبند میں دارالعلوم قائم کر کے مولویوں کی ٹیم بنالی ۔جس نے مسلم آبادیوں میں پہونچ کر مدارس ومساجد کے پلیٹ فارم سے نہایت خاموشی کے ساتھ طلباء اور نوجوانوں میں عقاید باطلہ کا بیج بویا دوسرے نے گنگوہ میں صابری چشتی خانقاہ تعمیر کر کے مسلمانوں کو عقیدت کے اندھیرے میں رکھا اوران پر اپنے نظریات فاسدہ کی ملمع کاری کی پیرومرشد کی زجروتوبیخ بھی انہیں حیلہ سازی سے نہ روک سکی اور یہ پیری

کے پیرہن میں بدستور اپنا کام کرتے رہے پھر ان مریدون کے ذریعہ بدعقیدگی کی بد بو دور دور تک پھیلائی جاتی رہی ——— یہ لوگ اس وقت عوام کی پہچان میں آئے جب تقریباً ہر شہر میں انکے دفاعی مورچے قائم ہو چکے تھے۔اور یہ بات تو مشاہدے میں آچکی ہے کہ جو جس کا طرف دار ہو گیا وہ ہو گیا۔حنفیت کے خول میں چھپے ہونے کے سبب علماء کی نشاندہی کے باوجود عوام نے ان کو پہچاننے میں دھوکا کھایا۔ پانی سر سے اونچا ہو جانے کے بعد مناظروں کا بھی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ ہر فریق نے اپنی اپنی فتح کے دعوے کئے ۔اگر ہزار میں سے دس پلٹ بھی آئے تو اس سے کیا بنتا بگڑتا ہے۔

اگر کسی مناظرے میں نمایاں کامیابی کے سبب ہوا اپنے موافق بن بھی گئی تو اپنے ارکان جماعت کی خود فراموشی نے اس حسین موقع کو کھودیا۔ مجھے پچپن سال پہلے کی یہ بات آج بھی خوب یاد ہے کہ ۱۹۵۸ء میں حکیم سید ظفیر الحسن صاحب مرحوم نے اپنے بدریہ دواخانہ کوتوالی گیا میں ابا حضور سے فرمایا تھا کہ حضرت مولانا حشمت علی خان صاحب کا جب گیا میں مولانا منظور نعمانی سے مناظرہ ہوا تھا تو شہر کا یہ ماحول بن گیا تھا کہ کوئی خود کو دیوبندی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اپنے کو دیوبندی بتاتے ہوئے وہ شرم محسوس کرتا تھا۔"لیکن آج اسی شہر گیا کا کیا حال ہے۔ یہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

وجہ ظاہر ہے۔قائدین جماعت پر اپنی اکثریت کا زعم چھایا رہا۔انہوں نے سمجھ لیا کہ جو ہمارا ہے وہ ہمارا ہی رہے گا۔ ان پر کسی محنت کی ضرورت ہی کیا ہے۔علماء پر اپنی حق پرستی کا خمار طاری رہا۔ یہ خوش فہمی ان کے درپیش رہی کہ باطل کا حق پر کبھی غلبہ نہیں ہوسکتا۔حرکت وعمل کے بغیر ہی ہماری کھیتی ہمیشہ لہلہاتی رہے گی۔ مشائخ اس

گمان میں گم رہے کہ جھاڑ پھونک، گنڈہ تعویذ کیلئے خانقاہ کی دوڑ لگانے والے کوئی اور دروازہ نہیں جھانک سکتے۔ ہمارے درباریوں کو ہمارے آستاں کے سوا کسی اور دہلیز کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ کاش! ہم شاعر قوم حضرت اقبالؔ مرحوم کا یہ فرمان یاد رکھتے۔

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ سے غافل نہ بیٹھیں، آشیانوں میں

تبلیغی جماعت:- ہمارے عہد طالب علمی تک گیا شہر کی صرف پانچ مسجدوں میں دیوبندی امام تھے۔ شہر اور دیہات ہر جگہ میلاد و فاتحہ اور سلام وقیام کا خول پہن کر دیوبندی مولوی امامت کی جگہ ڈھونڈتے تھے۔ اور پکڑ میں آجانے کے بعد مار بھگائے جاتے تھے۔ اس نزاکت کو اسی جماعت کے ایک عیار مولوی نے سمجھا۔ اور اس کی کاٹ کیلئے ایک نئی راہ تلاش کی۔ اس نے ایسا فارمولہ تیار کیا کہ میرا کام ہو جائے اور ہم پہچان میں بھی نہ آئیں۔ چنانچہ اس نے دہلی کی ایک گمنام مسجد میں بیٹھ کر ایک جماعت تشکیل دی۔ جس کا بینر کلمہ ونماز کو بنایا۔ اور اس کے درپردہ اپنے فکر واعتقاد کا پھیلانا مقصود رکھا۔ بھلا کلمہ ونماز سے کس مسلمان کو انکار ہو سکتا ہے۔ فریب کی یہ راہ ان کے حق میں مفید ثابت ہوئی اور یہ مقصد میں صدفی صد کامیاب ہوئے۔

ارشاد رسول ہے ”**الصبحۃ موثرۃ**“ صحبت بہر صورت اثر انداز ہوتی ہے۔ نکوکاروں کی معیّت آدمی کو نیکی کی راہ چلاتی ہے۔ اور بدکاروں کی سنگت انسان کو بدی کا خوگر بناتی ہے۔ انہوں نے اپنی جماعت کے دستور میں تین دن، سات دن، دس دن، اور چالیس دن کے چلے کو اسی لئے لازم قرار دیا کہ اس چلت پھرت کے دوران

یہ وہی کرنے لگیں گے جو ہم چاہتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے کبھی ایک جملہ میں کبھی دو جملوں میں اشارۃً کچھ کہہ دیا۔ تاکہ کوئی نہ جانے کہ یہ ہمیں الگ راستہ بتا رہے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بھولے بھالے سنی ان کے دام تزویر میں اس طرح گرفتار ہوئے کہ اپنے ہی علماء کو منہ چڑانے لگے کہ ہمارے علماء تو خواہ مخواہ ان سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ بیچارے تو اچھی بات بتاتے ہیں۔ کلمہ درست کراتے ہیں۔ نماز کی عادت ڈلواتے ہیں۔ کسی عقیدہ و مسلک سے ان کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ افسوس! یہ سادہ لوح مسلمان ان کی چلت پھرت کے راز کو جاننے کی کوشش نہیں کی اور گمراہ ہوئے ——— اس جماعت کے سرمایہ کاری کے نظام پر اس وقت ہمیں کچھ لکھنا نہیں ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے امیر جماعت ماہ بماہ تنخواہ پاتے ہیں اور بطور ایجنٹ جماعت کا جال لیکر مسلم آبادیوں میں پھرتے ہیں۔ اس کا اتنا ثبوت کافی ہے کہ ان کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں اور گھر شاہانہ طریقے پر چل رہا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ جماعت کے بیشتر افراد جو مرکز کے بھیدوں سے آگاہ نہیں ہیں وہ بلا معاوضہ اپنا خرچ کرکے جاڑا، گرمی، برسات ہر موسم میں شہر شہر، نگر نگر اور گاؤں گاؤں دین کے نام پر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ جس کے لازمی نتائج یہ دیکھنے میں آرہے ہیں کہ آج بھی ہمارے نوجوان یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ بظاہر تو ان کے اندر کوئی برائی دیکھنے کو نہیں ملتی پھر ان کی مخالفت کیوں کی جاتی ہے ——— ملک کے طول وعرض پہ جن کی نگاہ ہے وہ دیکھ رہے ہیں کہ کل تک جو جماعت لومڑی کی طرح ڈری سہمی رہتی تھی اور چاپلوسی کی راہ سے کام کر رہی تھی۔ آج وہ بھیڑیا بن کر سنی آبادیوں پر اپنا خونی پنجہ گاڑنے کی کوششوں میں مصروف نظر آرہی ہے۔ سنی مسجدوں میں زبردستی گھس جانا، سنی

امام پر بے بنیاد الزام لگانا، کمزور سنی آبادی پر دباؤ بنانا۔ اہل سنت کے معمولات کا استہزا کرنا، بزرگان سلف اور اولیاء کی شان میں ہتک آمیز جملے بولنا اور اہل سنت کی دل آزاری کی ہر راہ اپنانا ان کا محبوب مشغلہ بن چکا ہے۔

مہاراونڈہ، تحصیل سراؤں، ضلع الہ آباد۔ یہ شہر الہ آباد شہر سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں سے میرے مرید محمد نسیم قریشی اصدقی ابھی ۱۸ر ستمبر کو بہار شریف پہونچے تو یہ دردناک کہانی سنائی کہ یہاں ہمارا محلّہ پچاس گھر سنی مسلمان پر مشتمل ہے۔ باقی پانچ سو گھروں کا تعلق تبلیغی جماعت سے ہے۔ یہ لوگ ہم لوگوں کو میلاد شریف کرنے نہیں دیتے۔ سلام پڑھنے سے روکتے ہیں۔ محلے میں مسجد بنانے نہیں دیتے، اس کے لئے گولی بارود تک کا استعمال کرتے ہیں۔ اس سال رمضان المبارک میں ہمارے محلّہ کے ایک مرد شیر نے پورے ماہ اپنے گھر میں تراویح کا اہتمام کیا اور ہر طرح کی دھمکی کو قبول کر کے صلوٰۃ وسلام پڑھوایا، دیکھا آپ نے اس غنڈہ گردی کی یہی ایک مثال نہیں ہے۔ میری دیکھی ہوئی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ پھر بھی یاران زمانہ ساز کو یہ کہتے ہوئے غیرت نہیں آتی کہ یہ معصوموں کی جماعت ہے —— حدتو یہ ہے کہ اب یہ لوگ قتل وقتال کی راہ پر بھی چل پڑے ہیں۔ ان کی راہ میں حائل ہونیوالے سنی جوانوں کے قتل کا ایک ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے۔ اخبار و رسائل کی اس دنیا میں یہ بات کسی سے چھپی ڈھکی نہیں ہے۔ ایسے سفاکوں کو معصوموں کی ایک بے ضرر جماعت قرار دینے والے کل محشر میں خدا کو کیا جواب دیں گے۔ مجھے نہیں معلوم۔ اخبار نویسوں کو یہ لکھنا تو خوب یاد رہتا ہے کہ فلاں مسجد سے فلاں پروفیسر

صاحب کو فلاں انجینئر صاحب کو اور فلاں سماجی کارکن کو باہر کر دیا گیا اور انہیں دعوت وتبلیغ کا موقع نہیں دیا گیا۔ مگر یہ لکھنے میں ان کے قلم کو کیوں سانپ سونگھ جاتا ہے کہ اس مسجد میں ہر جمعہ کو اسلامیات پر امام صاحب کی تقریر ہوتی ہے۔ ہر روز عصر ومغرب کے بعد دینی مسائل بیان کئے جاتے ہیں۔ پھر مسلکی اختلاف کے باوجود اس مسجد میں گھس کر تبلیغی جماعت کو خلفشار مچانے کی کیا ضرورت در پیش آئی۔

دامن کو لئے ہاتھ میں کہتا ہے یہ، قاتل
کب تک اسے دھویا کروں، لالی نہیں جاتی

وائے برحال ما:- ہماری غم نصیب آنکھیں، اغیار کی سیمابی کیفیت کو دیکھنے کے بعد اپنی جماعت کے اندر مفاد پرستی کا تماشہ دیکھتی ہیں تو پلکیں بھیگ جاتی ہیں۔ زمانے کے بدلتے حالات کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے باوجود ہمارے پیشہ ور مقررین اور مطلب پرست علماء ہوش کے ناخن نہیں لے رہے ہیں۔ تقریروں میں تعلّی اور طنز ومزاج کے چند بول زور پکڑتی ہوئی کسی تحریک کا راستہ نہیں روک سکتے۔ کسی بھی متحرک و فعال جماعت کے پیروں میں صرف نعروں کے بل پر بیڑی نہیں ڈالی جاسکتی۔ مثل مشہور ہے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ تانبا سے لوہا کاٹنے کا کام نہیں لیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے رات بھر کے جلسے دوسروں کی سال بھر کی جان توڑ محنتوں کا جواب نہیں ہو سکتے۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے دفاعی کوشش میں بازی مار لی ہے وہ خوش فہمی کی جنت میں رہتے ہیں۔ غالبؔ کی زبان میں۔ ع —— دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔

ہمارے سرمایہ دار دن کے اجالے میں دیکھ رہے ہیں کہ آج بدعقیدگی کا جھنڈا ڈھونے والی جماعتیں، اوراسلام کی صورت مسخ کرکے پیش کرنے والی تحریکیں ریال و ڈالر کے بل بوتے پر کامیابی کی دہلیز تک پہونچ رہی ہیں۔لیکن انہیں کبھی خیال نہیں آتا کہ ملت مظلومہ کو زندہ رکھنے کے لئے ہماری جماعت کو بھی پیسوں کی ضرورت ہے۔ ان کے پاس چادر وگاگر، باباؤں کی قبروں کے گنبد ومینار اور ناٹک باز شاعروں کو چھوٹ دینے کیلئے پیسے ہیں۔ جرائد ورسائل، دینی کتب کی اشاعت اور جماعتی فنڈ کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ کیوں کہ اس میں ہاتھ اٹھا کر نعرے نہیں لگیں گے۔ان کی واہ واہی کی دھوم نہیں مچے گی ـــــ سعودیہ کا ریال، کویت کا دینار، امریکہ کا ڈالر اور برطانیہ کے سکے جن کی جیبوں میں ڈالے جارہے ہیں۔ان کا تبلیغی مشن نقطۂ عروج پر ہے۔ہمیں تو کہیں سے کوئی امید نہیں ہے۔ہم کو اپنے جینے کی راہ خود تلاش کرنی ہے۔ ہماری تگ ودو اگر صرف کام ودہن تک محدود رہی تو ہمارا مستقبل کیوں کر محفوظ رہ سکے گا۔ اور ہماری نئی نسل ہمارے صالح عقاید ونظریات کا پالن آخر کس طرح کر پائے گی۔ کیا آنیوالی نسل کا تحفظ ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔؟ ہاں! اس میں ہرگز دورائے نہیں کہ اغیار جتنی محنت ومشقت کررہے ہیں ہم اپنی جماعت کیلئے اس کا عشر وعشیر بھی کوشش کریں تو ہماری صداقت ہم کو ان سے تیز گام کردے گی لیکن ؎

سب باندھ چکے کب کے سر شاخ نشیمن
ہم ہیں کہ گلستاں کی ہوا، دیکھ رہے ہیں

متحرک جماعتیں:- ذی علم، متدیّن اور مخلص علماء کرام کی جماعتی استحکام کے

لئے جو کوششیں بھی جاری ہیں۔ چاہے وہ اداروں کی شکل میں ہوں، یا رسالوں کی صورت میں، گرانقدر تصنیفات کے ذریعہ ہوں، یا طلباء کی ذہن سازی کرکے، ان کے دیرپا اور دوررس نتائج سے انکار نہیں کیا جاسکتا، جماعت کی رگوں میں خون فراہم کرنے کا فریضہ وہ ہرگام پر انجام دیرہے ہیں۔ جماعت کا ہر فرد ان کا زیر بار احسان ہے اور رہے گا، مولائے کریم بکرم حبیبہ النبی علیہ التحیہ والتسلیم ان کا دریائے فیض ہمیشہ جاری رکھے۔ اور ان کے وجود مسعود کا سایہ دراز فرمائے ـــــ لیکن بھولے بھالے عوام کی اصلاح وہدایت اور ان کے مذہبی عقاید کے تحفظ کے لئے دعوت اسلامی اور سنی دعوت اسلامی کی جو مشقت بردوش خدمات ہیں۔ ان کی افادیت اور نفع رسانی سے انکار کرنا دن کے اجالے میں سورج کے وجود کا انکار ہے۔ وہ ہر نفع وضرر سے بے پرواہ ہوکر کتنی بے لوث قربانی دے رہے ہیں اس کا اقرار اگر کسی کی زبان نہیں کرتی تو دل ضرور اعتراف کرتا ہے۔ کون ہے جو انکار کردے کہ تبلیغی جماعت کی فتنہ سامانیوں کی کاٹ جس طور پر ان دونوں جماعتوں نے کی ہے۔ ہماری کوئی دوسری تنظیم نہیں کرسکی تھی۔ تبلیغی جماعت کی ریشہ دوانوں کی تفصیل آپ نے پڑھ لی۔ اور اپنی جماعت کے چمتکاروں کی گل کاریاں بھی آپ نے معلوم کرلیں۔ اب ہمیں بتایا جائے کہ ایسے نازک حالات میں کوئی بھی سنی جماعت اگر کچھ کررہی ہے تو وہ دعاؤں کی مستحق ہے یا گالیوں کی۔ سواد اعظم کے بہی خواہوں پر اس کی نصرت لازم ہے۔ یا اس سے نفرت۔ سنیت کا درد ہمارے سینوں میں ہے تو ہمیں ان کی معاونت کرنی چاہئے، نہ کہ ان سے اظہار بیزاری۔ نفس سرکش کی حمایت میں اٹھنے والے یہ وہ قدم ہیں جن کی تائید وتحسین کی امید پوری ملت سے نہیں کی جاسکتی ہے۔

رہنے دے جامِ جم ، مجھے انجام جم سنا
کھل جائے جس سے آنکھ، وہ افسانہ چاہیے

گزشتہ دنوں گجرات ، گوااور کرناٹک کے دورے کے دوران یہ تلخ حقائق میرے سامنے آئے کہ دعوت اسلامی اور سنی دعوت اسلامی کی ناکہ بندی کی جارہی ہے۔ان کے اوپر سنی مسجدوں کے دروازے بند کئے جارہے ہیں۔غلط پروپگنڈوں کے ذریعے ان کے خلاف نفرت پھیلائی جارہی ہے۔ان کا جرم کیا ہے؟ بس یہی کہ یہ لوگ ہمارا من چاہا نعرہ نہیں لگاتے۔ یہ لوگ میری زبان اپنے منہ میں رکھ کر نہیں بولتے۔ بہار، بنگال اور جھارکھنڈ میں بھی اس قسم کا عمل جاری ہے۔مگر میرے تجربات شاہد ہیں اس کا نقصان جماعت کے رضا کاروں کو کم اور شدت پسندوں کو زیادہ پہونچ رہا ہے ـــــ لئیم کی تعریف یہ ہے ’’نہ خود خورد، نہ کسے دہد‘‘ کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو نہ خود کچھ کرنا چاہتے ہیں اور نہ دوسروں کو کچھ کرتا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں ۔نعروں کے بل پر جماعتیں زندہ نہیں رہتیں۔ زندگی کی بقائے دوام کے لئے حرکت وعمل ضروری ہے۔ ہمارے اسلاف کی فعال زندگی اور ان کی پرنور صبح وشام ہماری آنکھوں میں کاجل بن کر ہمیں یہ راہ دکھا رہی ہے کہ خدمت ہی سے انسان عزیز ہوتا ہے۔جن کی خدمات تھیں دنیا نے ان کو تسلیم کیا۔زمانے نے ان کے آگے گردنیں جھکائیں۔اپنوں نے ان کی راہوں میں عقیدت کی آنکھیں بچھائیں۔اور غیروں نے بھی ان کی عظمت کا لوہا مانا ہے۔اعلیٰ حضرت کی ذات ہمارے لئے روشن مثال ہے۔

کاش! یہ اونچی ٹوپی لگا کر مولوی بننے والے اس راز کو بھی پاسکتے۔شاعر قوم حضرت اقبال مرحوم نے بڑی سچی بات کہی ہے۔

قوم کیا ہے قوموں کی امامت کیا ہے
کیا جانیں ، بیچارے یہ دو رکعت کے امام

ملت کے نوجوانوں کے نام:- ملک کے کئی مقامات پر کچھ مرجھائے ہوئے رضا کاروں نے شدت پسندوں کی جارحانہ روش کی بجھے بجھے لہجے میں مجھ سے شکایت کی۔ میں نے ان سے کہا کہ تعمیر میں اٹھنے والے قدم ہمیشہ بڑھتے رہے ہیں۔اور تخریب کاری دور کھڑی منہ تکتی رہ گئی ہے پھر آپ لوگوں میں یہ مایوسی کیسی ہواؤں کے دوش پر چراغ جلانے والے گھبراتے نہیں،طوفانوں کا رخ موڑ دیتے ہیں جو لوگ سواد اعظم اہلسنت کے مستقبل سے آنکھیں موند کر صرف اپنے من پسند نعروں کا پالن چاہتے ہیں۔وہ اپنی اوچھی حرکتوں سے کبھی باز نہیں آئیں گے۔ جب یہ ایک باطل جماعت کو اپنے گھروں میں گھسنے سے نہیں روک سکے۔تو صداقت کی راہ میں تمہارے اٹھتے قدم کو کیوں کر روک پائیں گے۔بس کام کی ڈگر پر قدم جما کر چلتے رہو۔حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کا یہ ارشاد کہ ہر مخالفت کا جواب کام ہے۔ ہمارے لئے حوصلہ افزاء درس ہے ۔لسان القوم جناب ڈاکٹر اقبال نے بڑے پتے کی بات کہی ہے ۔

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پردم ہے اگر تو، تو نہیں خطرۂ افتاد

انتباہ :- ہاں اتنا ضرور یادرہے کہ تمہارے مخالفین جس طرح شخصیت پرستی کے دلدل میں دھستے جارہے ہیں خبردارتم بھی اسی شخصیت پرستی کے بھنور میں اپنی کشتی نہ ڈبو دینا۔قادری، چشتی، سہروردی، نقشبندی، صابری، نظامی، فخری، فردوسی۔اشرفی، رضوی، آبادانی، اصدقی۔جہانگیری، منعمی، شہبازی، اور تیغی وغیرھم تمام سلاسل کے وابستگان تم سے جڑے رہے۔اور ان تمامی خانقاہ نشینوں کی دعائیں اگر تمہارے راکب بدوش رہیں تو تمہارا راستہ کوئی روک نہیں سکتا۔برگ گلاب پر چیونٹیوں کا قافلہ دریا پار اتر سکتا ہے تو پھر کشتئ اتحاد پر سوار ہوکر تم کیوں نہیں ۔

سفینہ برگ گل بنا لیگا ،قافلہ مور ناتوں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش ،مگر یہ دریا سے پار ہوگا

ایک تشویشناک حقیقت : آج کے فارغ التحصیل علماء میں بیشتر خالص دنیا دارانہ ذہن لیکر مدارس سے باہر آرہے ہیں۔ وہ دین وملت کی خدمت کے جذبے سے یکسر خالی دیکھے جارہے ہیں۔ان میں کچھ تو وہ ہیں جو کالج و یونیورسیٹی کا رخ کر کے اپنی زندگی کا ڈھانچہ احساس کمتری کے شکار ہوکر تبدیل کر لیتے ہیں اور اسلامی شناخت کو اپنی ذات تک بھی محفوظ نہیں کر پاتے ہیں۔ باقی جو بچ گئے ان کا حال یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے سرکاری اسکولوں میں جگہ تلاش کرتے ہیں۔ ناکامی کے بعد بورڈ کے مدارس کی طرف دوڑ لگاتے ہیں۔ یہاں بھی مایوسی ہوئی تو پارا ٹیچر کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ یہاں بھی مراد بر نہ آئی تو کسی کمپنی میں چپراسی کی جگہ ڈھونڈ ھتے ہیں۔ یہاں سے بھی خالی ہاتھ لوٹے تو آخر میں مدارس نظامیہ اور مساجد اہل سنت کا مجبوراً

رخ کرتے ہیں ـــــــ مزاج صابر اور طبیعت قانع نہیں۔ ان کی نظر بس دنیاداروں کی جنت بداماں زندگی پر ہوتی ہے۔اوران کی ہمسری کیلئے وہ پریشان رہتے ہیں۔نتیجہ ظاہر ہے، جائز و ناجائز آمدنی کی تمیز بھی جاتی رہتی ہے۔ میں نے ایک قد آور مولوی کو سپاہی کی نوکری کیلئے جان توڑ محنت کرتے دیکھا۔سپاہی میں بحال ہوکر ان کی زندگی کیسی گذرے گی۔شاید یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ایسے لوگوں سے یہ امید کرنا فضول ہے کہ وہ کبھی اس نہج پر بھی غور کریں گے کہ ہم نے جس راہ کی تعلیم حاصل کی ہے۔اس کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ ہمارے اوپر کچھ منصبی فرائض بھی ہیں۔جس قوم نے ہمارے لئے مفت تعلیم کا نظم کیا،اس کے کچھ حقوق بھی ہیں ـــــــ میرے کہنے کا مقصود یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنی راہ سے دین وسنیت کی خدمت کر ہی نہیں سکتے ہیں مگر اس کی مثال الشاذ کالمعدوم ہے۔ کیونکہ جو جذبہ انہیں اس طرف کھینچ لے گیا ہے وہ رگ احساس کو مردہ کر دیتا ہے۔صنعت وتجارت کی راہ میں مشغول ہوجانے والے علماء وحفاظ کے دین وسنیت کی خدمت سے غافل نہ ہونے کی مثال بھی میرے سامنے موجود ہے۔لیکن یہاں پہونچنے پر معاملہ صرف توفیق الٰہی پر منحصر ہوجاتا ہے۔

خدا اگر توفیق نہ دے، سب کے بس کی بات نہیں
فیضان محبت عام سہی، عرفان محبت عام نہیں

آخری بات :- فخراً نہیں، تحدیث نعمت کے طور پر عرض کررہا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ گیا ہوں پہلے اسے عملاً برت کر دکھایا ہے۔ ہائی اسکول میں فارسی اردو ٹیچر کی بحالی

کو میں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ میرے دینی خدمات کے دائرے میں رخنہ پیدا ہوگا۔ بورڈ کے مدرسہ میں فاضل کے پوسٹ کو علماء کے مطالبہ پر میں نے نظر انداز کر دیا، اور ادارہ شرعیہ بہار کا بار گراں اٹھالیا۔ طبیہ کالج پٹنہ کی سند طب کو خاطر میں نہ لا کر میں نے کبھی طبابت کے پیشہ کی طرف رخ نہ کیا۔ کسی ادارے میں خود کو کبھی میں نے ملازم نہ جانا۔ اور کوئی کام میں عار کبھی میرے آڑے نہ آیا۔ اپنی اضافی خدمات پر کسی معاوضہ کا میں کبھی طلب گار نہ ہوا۔

بہار شریف میں، مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف کی داغ بیل ڈالی تو خود کو بانی و ناظم نہ گردانا چندہ بھی کیا، بچوں کو درس بھی دیا، ضرورت پڑنے پر جھاڑو بھی اٹھائی اور مٹی بھی ڈھوئی۔ مدرسہ کے فنڈ سے کبھی کوئی تنخواہ نہ لی اور اپنی وصول کردہ رقم پر کبھی کوئی کمیشن وصول نہ کیا۔ تقریری میدان میں آئے ہوئے چالیس سال ہو گئے۔ خطابت کیلئے ملک کی تقریباً ہر ریاست تک پہونچا۔ مگر مطالبہ اور ڈیمانڈ تو درکنار الحمد اللہ! لفاف پر بھی نظر کبھی نہ رہی۔ بایں ہمہ آج تک میرا کوئی کام رکا بھی نہیں۔ للہ الحمد! یہ خودستائی نہیں ہے۔ نئی نسل کو یہ ترغیب دینا مقصود ہے کہ ؎

ع —— ایسا کچھ کر کے چلو یاں، کہ بہت یاد رہو

دیدۂ عبرت نگاہ :- علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ ادارہ شرعیہ بہار کے ناظم عمومی تھے۔ پٹنہ آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میرے عہد اہتمام میں ایک بار ادارۂ شرعیہ تشریف لائے تو ایک مولانا کہیں سے ملاقات کو آئے۔ علامہ نے کسی جگہ ان کو امامت کی خدمت پر مامور کیا تھا۔ جب حضرت علامہ نے خیریت دریافت فرمائی تو وہ وہاں کی شکایات

بیان کرنے لگے۔ علامہ نے فرمایا، یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ آپ وہاں جم کر رہئے۔ پورے علاقہ میں سنیت کا کام ہوگا —— مولانا صاحب نے روکھے پن سے جواب دیا۔ حضور! پیٹ بھی تو ہے۔ بال بچے بھی تو ہیں۔ تنخواہ ناکافی ہے۔ حضرت علامہ یہ سن کر چیں بہ جبیں ہو گئے۔ فرمایا، مجھے پیٹ نہیں ہے۔ میرے بال بچے نہیں ہیں۔ میں دن رات دین کے کاموں میں لگا رہتا ہوں اور میرا کوئی کام نہیں رکتا ہے۔ اس بول میں سچائی تھی۔ ایسی سچائی جس پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا ہے۔

حضرت علامہ کے رحلت کی خبر ملی تو میں گرتا پڑتا جمشید پور پہونچا۔ دیکھا تو سارا شہر ٹوپی والے سروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ فیض العلوم پہونچا۔ تو برادرم مولوی غلام ربانی دوڑ کر لپٹ گئے اور بولے سید صاحب! مجھے ساری زندگی ابا سے کمائی کی شکایت رہی۔ لیکن آج میں نے اپنے باپ کی کمائی دیکھ لی۔ جنازہ رکھا تھا۔ آخری دیدار کرنے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ میں بھی صف میں شامل ہو گیا۔ جب دیدار کی گھڑی آئی تو میں نے احساس کے کانوں سے سنا، آپ کی خاموش زبان کہہ رہی تھی۔

ع —— ایسا کچھ کر کے چلو یاں، کہ بہت یاد رہو

☆☆☆

طلباء اور مولوی

آج بے عملی کے شکار کیوں؟

سال کے دس ماہ مدرسہ کی چہار دیواری کے اندر جن طلباء سے ڈنڈوں کے سائے میں نمازوں کی پابندی کرائی جاتی ہے وہ تعطیل کلاں کے دو ماہ گھر رہنے کے دوران نمازوں سے بالکل غافل کیوں دیکھے جاتے ہیں۔ میں نے جب اس پر غور کیا تو وجہ یہ سمجھ میں آئی کہ وہ اپنے پیش رو فارغین جو عوام کی زبان پر مولانا کہے جارہے ہیں انہیں نمازوں سے بے پرواہ دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ نمازوں کی پابندی مدرسے کا ایک ضابطہ ہے۔ مدرسہ کے حدود سے باہر آجانے کے بعد یہ پابندی لازم نہیں ہے۔ اگر یہ اتنی ہی ضروری ہوتی تو یہ مولانا لوگ بھی نماز پڑھتے ہوئے دیکھے جاتے۔ اب ذہن میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ مولویوں کے مزاج میں یہ بگاڑ کیوں پیدا ہوئی۔ تو اسباب پر نظر ڈالنے کے بعد پتہ چلا کہ بے علم و عمل مقررین جن کو احساس کمتری کے سبب یہ اپنے سے برتر سمجھتے ہیں۔ اور عوام کی واہ واہی کو دیکھ کر ان سے مرعوب رہتے ہیں۔ انہیں بار بار یہ کہتے سنا کہ عقیدہ عقیدہ، ایمان ایمان۔ ایمان نہیں تو کچھ بھی نہیں، نماز و روزہ سب بیکار سب برباد۔ ایمان درست ہے تو عمل کے بغیر بھی بیڑا پار ہے۔ یہ سنتے سنتے دل سخت ہو گیا اور بے عملی کی گرد قلب پر جم گئی۔

یہ تو صحیح ہے کہ ایمان کے بغیر اعمال حسنہ متصور نہیں۔ مگر یہ رجحان کیوں کر پیدا ہوا کہ ایمان کے بعد اعمال کی چنداں ضرورت نہیں۔ نہ آیات کریمہ سے اس پر دلیل لائی جاسکتی ہے۔ نہ احادیث مبارکہ اس کی شہادت پیش کرتی ہے۔ نہ اقوال فقہاء اس کا ثبوت

فراہم کرتے ہیں اور نہ بزرگوں کے ارشادات عالیہ اس خیال باطل کی تائید کرتے ہیں۔ بلکہ تقاضائے ایمان تو یہ ہے کہ انسان جس قدر راسخ الاعتقاد ہوگا، اسی قدر وہ خیر و شر میں تمیز پیدا کر کے راہ مستقیم پر ثابت قدم ہوگا۔ جیسا کہ گروہ صوفیاء کو دیکھا گیا ہے کہ فرائض و واجبات تو کیا، سنن و مستحبات تک کے ترک کو وہ گناہ سمجھتے ہیں۔ اس باب میں ہم پہلے آیات کریمہ پیش کریں گے، جس نے ہماری جماعت کے عوام و خواص تک کو بے عملی کے گرداب میں پھنسا دیا ہے۔ اور صلوٰۃ و صوم کے ترک کا عام مزاج بن گیا ہے۔

(۱) **والعصر ان الانسان لفی خسر ط الا الذین آمنوا و عملوا الصالحات ط**
اس زمانۂ محبوب کی قسم! بے شک آدمی ضرور نقصان میں ہے۔ مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔ یہاں ٹوٹے اور گھاٹے سے استثناء کیلئے ایمان کی شرط کے ساتھ عمل صالح کی قید بھی لگائی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا دعویٰ اتباع رسول کے بغیر فضول ہے۔ عاقبت بخیر کے طلب گاروں کو عبادت کے بغیر چارۂ کار نہیں۔

(۲) **ان الذین آمنوا و عملو الصالحات کانت لهم جنّٰت الفردوس نزلا ط** پ۱۶۔ بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے فردوس کے باغ ان کی مہمانی ہے۔ یہاں بھی جنت الفردوس جو سب سے بلند اور عرش الٰہی کے نیچے واقع ہے اس کی بشارت ایمان و عمل کی قید کے ساتھ دی گئی ہے۔ اعمال اگر ایمان کے بغیر اکارت ہیں تو دعوائے ایمانی بھی ادائے رسول سے کھلی بغاوت کی صورت میں لغو اور مہمل ہے۔

(۳)فمن کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملاً صالحاً و لا یشرک بعبادۃ ربہ احداً ط(پ۱۶ کہف)۔تو جسے اپنے رب سے ملنے کی امید ہوا سے چاہئے کہ نیک کام کرے۔اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔ دیدار الٰہی وہ عظیم نعمت ہے کہ صوفیاء بس اسی کے طلب گار رہتے ہیں۔ وہ آسائش جنت کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتے۔اس نعمت کے حصول کے لئے بھی عمل صالح کا ہی راستہ اپنانا ضروری ہے۔اور وہ عمل ایسا خالصاً مخلصاً لوجہ اللہ ہو کہ اس میں ریا ونمود کا شائبہ تک نہ پایا جائے ورنہ اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہ جائے گا۔

(۴)وعد اللہ الذین آمنوا و عملوا الصالحات منھم مغفرۃ و اجراً عظیماً ط(پ۲۶ الفتح)۔اللہ نے وعدہ کیا ان سے جو ان میں ایمان اور اچھے کاموں والے ہیں بخشش اور بڑے ثواب کا۔ایمان باللہ و بالرسول کا تقاضا **اطیعو اللہ و اطیعوا لرسول** ہے۔جو شخص دعویٰ کی زبان دراز رکھتا ہے اور اپنے دعویٰ پر دلیل پیش کرنے کی بساط نہیں رکھتا وہ دنیوی عدالت ہی سے نہیں، عدالت الٰہی سے بھی خارج کیا جائے گا۔اس دن اس کے جھوٹے نعرے کا سارا بھرم کھل جائے گا۔

(۵) یا ایھا الذین آمنوا لا تلھکم اموالکم و لا اولادکم عن ذکر اللہ ط(پ۲۸ المنافقون)۔اے ایمان والو! تمہارے مال نہ تمہاری اولاد، کوئی چیز تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کرے۔خزائن العرفان میں **عن ذکر اللہ** کی تفسیر نماز پنجگانہ اور ذکر و تلاوت سے کی گئی ہے۔اولاد واموال اگر عبادت الٰہی سے باز رکھے تو یہ ہلاکت و بربادی ہے۔اور اگر بلا مشغولیت محض کاہلی اور لاپرواہی بندہ کو بندگی سے دور رکھے تو اس میں دونوں جہان کا خسران ہے۔

(۶)یا ایھاالذین آمنوا التقوا اللہ و النتظر نفس ما قدّمت لغدٍ ط(پ۲۸ الحشر)۔اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر جان دیکھے کہ کل کے لئے کیا آگے بھیجا۔خزائن العرفان کی صراحت کے مطابق کل سے مراد روز قیامت، اور آگے بھیجنے سے مراد اعمال صالحات، جن پر اخروی کامیابی اور بخشش ونجات کا دارومدار ہے۔یہاں بحث یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تحت قدرت کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔علماء فرماتے ہیں کہ ایک آلودۂ معصیت جس کی پوری زندگی کبائر میں ڈوبی ہوئی ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اسے جنت میں بھیج دے تو یہ اس کا فضل ہے۔اور ایک عابد شب زندہ دار جس کی ساری زندگی عبادت میں گذری اللہ تعالیٰ اسے بے روک ٹوک جہنم میں ڈال دے تو اس کا عدل ہے۔

یہاں گفتگو **ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین** کے اصول پر قانون قدرت پر چل رہی ہے جس میں کہیں گنجائش نہیں ہے کہ ایمان درست ہے تو بس بیڑا پار ہے۔وہ ایمان درست ہی کیونکر ہوسکتا ہے جس میں جوش بندگی نہ ہو۔سرور عبادت نہ ہو۔جذبۂ اتباع محبوب حق نہ ہو۔چھ آیات مبارکہ پر بس کیا گیا، ورنہ اس معنیٰ میں سینکڑوں آیات قرآنیہ سامنے لائی جاسکتی تھیں۔

احادیث مبارکہ

(۱)عن سلمان قال سمعت رسو ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من غدا الی صلوٰۃ الصبح غدا برایۃ الایمان و من غدا الی السوق غدا برایۃ ابلیس (بخاری)

حضرت سلمان فارسی نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔وہ فرماتے تھے کہ جو شخص نماز فجر کے لئے مسجد گیا وہ ایمان کا جھنڈا لے کر گیا۔اور

جو صبح اٹھ کر سیدھے بازار گیا، وہ شیطان کا جھنڈا ساتھ لے گیا۔ اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ نماز نشان ایمان ہے۔ اب ابلیسی جھنڈا ڈھونے والے خود ہی بتائیں گے کہ ان کا بیڑا پار ہے یا بیڑا غرق ہے۔

(۲)عن عبد الله بن عمرو بن العاص عن النبی صلی الله علیه وسلم انهٔ ذکر الصلوٰة یوماً فقال من حافظ علیها کانت لهٔ نوراً و برهاناً و نجاة یوم القیامة(مسلم)

حضرت عبداللہ جو بیٹے حضرت عمرو بن عاص کے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز نماز کا ذکر کیا تو فرمایا، جو شخص نماز کی پابندی کرے گا تو نماز اس کے لئے قیامت کے دن ایک روشنی، ایمان کی دلیل اور بخشش کا سامان بنے گی۔

دنیا کی عدالتوں میں دعویٰ بلا دلیل لے کر جانے والے عدالت بدر کئے جاتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ احکم الحاکمین کی عدالت عظمیٰ میں مدعیان بلا دلیل کے حق میں کیا فیصلہ ہوگا۔ اور بیڑا پار کے دعویداروں کا بیڑا کس پار ہوگا یہ تو بیڑا پار والے ہی بتائیں گے۔

(۳) ان النبی صلی الله علیه وسلم قال یا علی ثلث لا تؤخرها الصلوٰة اذا آتت ،والجنازة اذا حضرت ،والایّم اذا وجدت لها کفواً (رواہ الترمذی)

مولیٰ علی نے بیان کیا کہ مجھ سے سرکار دوعالم نے فرمایا، اے علی! تین کاموں میں کبھی دیر نہ کرنا۔ ایک نماز، جب اس کا وقت آجائے۔ دوسرے جنازہ، جب اس کی تیاری ہوجائے۔ تیسرے بیوہ کا نکاح، جب اس کا کوئی کفومل جائے۔

حدیث پاک کی اس مقفیٰ عبارت میں جو تین احکام بیان کئے گئے۔ ان میں نماز کا حکم مقدم کیا گیا۔ اسی سے اس ام الفرائض کی اہمیت ظاہر ہے۔ جنازہ میں جلدی کرنے کا حکم اس لئے صادر ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ ایک زمانہ وہ بھی آئے گا کہ امریکہ فون کر دیا گیا ہے اور سعودیہ فون ہو گیا ہے اس چکر میں جنازہ تین دن روک کر رکھا جائے گا۔ بیوہ کے عقد کی تاکید اس لئے کی گئی کہ غیب داں پیغمبر کو معلوم تھا کہ سماجی طور پر عار تصور کر کے جوان بیوہ کے عقد میں کبھی نیہر اور کبھی سسرال والوں کی طرف سے رکاوٹیں کھڑی کی جائیں گی۔

ان ہی تین حدیثوں پر اکتفا اس لئے کیا گیا کہ میرا مدعا ان ہی سے حاصل ہے۔ ورنہ اس معنی میں سینکڑوں حدیثیں جن میں سخت وعیدیں بھی ہیں نقل کی جا سکتی تھیں۔ اب آئندہ سطروں میں آپ ان محققین صوفیاء کے ارشادات عالیہ پڑھئے جن کی روشن زندگی ہزاروں کی ہدایت کا سامان بنی۔ اور سینکڑوں سال کے بعد آج بھی ان کے روحانی فیضان کا آفتاب نصف النہار پر ہے۔

ارشادات صوفیاء

سلطان المحققین مخدوم جہاں حضرت شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری رضی اللہ عنہ مکتوبات صدی جو آپ کے علمی شہ پاروں کا بے بہا خزانہ ہے۔ صداقت ایمان کے بیان میں فرماتے ہیں۔ اے کاش! اس کی حلاوت سے ہماری روح بھی آشنا ہو پاتی۔

(۱) اگر ایمان میں اس درجہ کی صداقت نہ ہو کہ مشاہدہ ہو سکے تو کم سے کم ایمان میں اتنا صدق تو ہو کہ اگر ہم خدا کو نہیں دیکھتے تو خدا ہم کو دیکھ رہا ہے۔ اس وقت کم سے کم

اس کی اتنی تعظیم تو کرے جتنی مخلوق کی کرتا ہے۔ پس اس وقت جبکہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ مخلوق اس کے کاموں کو دیکھے تو وہ یہ بھی نہ چاہے گا کہ خالق اس کے کاموں کو دیکھے۔ اور وہ جو ہم نے کہا، معاملہ فہموں کی زبان ہے۔ لیکن ارباب حقیقت کے نزدیک یہ بھی کفر ہے کہ خداوند تعالیٰ سے اتنی ہی شرم کرے، جتنی مخلوق کی کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے نزدیک خلق اور خالق دونوں برابر ہیں۔ اور نعوذ باللہ جس شخص کا اعتقاد ایسا ہو وہ کافر ہے۔

(ترجمہ مکتوبات صدی، ص ۲۸۹)

کیا یہ سچ نہیں کہ ترک نماز میں ہم ڈھیٹ ہو چکے ہیں۔ لیکن ہمارے گھر چند مہمان نازل ہو گئے اور انہوں نے وقت ہونے پر نماز کی تیاری شروع کر دی تو وضو کر کے مجبوراً ان کے ساتھ ہمیں بھی شریک نماز ہو جانا پڑتا ہے۔ اب مخدوم جہاں کے ارشادات کی روشنی میں ہمیں بتایا جائے کہ یہ کیسا ایمان ہے جس نے بندے کے برابر بھی رب تعالیٰ کے پاس ولحاظ کی توفیق نہیں بخشی۔ ایمان تو ایسا پھُس پھُسا اور دعویٰ یہ کہ بس بیڑا پار ہے۔

حضرت مولانا صدرالدین فردوسی حضور مخدوم جہاں کے غلامان خاص میں تھے۔ اور اس پایہ کے عالم ربانی تھے کہ حضرت مخدوم اپنے مرید خاص حضرت شمس الدین فردوسی کو لکھتے ہیں کہ یہ تمہاری خوش وقتی ہے کہ تمہیں مولانا صدرالدین کی صحبت میسر ہے۔ اس صحبت کو غنیمت جانو۔ جن کے علم اور فیض صحبت پر خود حضرت مخدوم کو اعتماد تھا۔ انہیں اپنے ایک مکتوب میں کس طرح ہدایت فرما رہے ہیں۔ اسے ذرا چشم بصیرت سے پڑھئے، لکھتے ہیں۔

(۲) علوم تو بہت ہیں اور ہم لوگوں کی عمر تھوڑی۔ یہ مختصر سی عمر تمام علم کے حصول کے لئے کافی نہیں۔ فرض تو بس اس مقدار میں ہے جس سے عمل کی درستگی ہو

سکے۔ قیامت کے دن عمل کی پرشش ہوگی۔ اس علم کی نہیں جو بہت زیادہ گدھے کا بوجھ ہو۔ ایک عزیز نے کہا ہے ۔

چوں علمت ہست با علمت عمل کن
پس از علم و عمل اسرار حل کن
ترا با علم دیں یک ذرہ کردار
بسے بہہ زانکہ علم دیں بخروار

یعنی جب تمہارے پاس علم ہے تو اپنے علم کے ساتھ عمل کرو۔ اور پھر اس علم و عمل کے بعد رموز و اسرار معلوم کرو۔ تمہیں اس علم دین کے ساتھ عمل کا ایک ذرہ اس علم دین سے جو ڈھیروں ہو کہیں زیادہ بہتر ہے۔

یہ بیان علماء آخرت کے بارے میں ہے، علماء دنیا کس شمار میں ہیں۔ ان سے ایسے بھاگو جیسے شیر اور سانپ سے بھاگتے ہو۔ یہ حکایت تم نے سنی ہے کہ ایک بزرگ نے شیطان کو بیکار بیٹھا ہوا دیکھا۔ انہوں نے کہا بڑے تعجب کی بات ہے۔ تو اور بیکار؟ اس نے کہا، جی ہاں! علماء دنیا پیدا ہو گئے ہیں۔ اب میرے لئے کوئی کام نہیں رہا۔ اے بھائی! دین کی راہ ایسی آسان نہیں جیسا ک اکثر و بیشتر لوگ سمجھتے ہیں۔ دین حق کی راہ تو وہ ہے جس میں نوازش کے ساتھ قہر ملا ہوا ہے۔ دین کی راہ میں جس طرح ممبر رکھے گئے ہیں، اسی طرح دار بھی نصب کئے گئے ہیں۔ (مکتوبات صدی، ص ۲۲۵)

حضرت مخدوم جہاں کی یہ تحریر اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ حصول علم کی فرضیت اصلاح عمل کے لئے ہے۔ آج علم کے ذریعہ عرفان الٰہی حاصل نہ ہو، دل میں

خوف ورجا پیدا نہ ہو، سیرت نبوی کے سانچے میں ڈھل جانے کا جذبہ بیدار نہ ہو، وہ علم غیر نافع ہے جس کا دوسرا نام علم شیطانی ہے۔ جو غرور وشرور کا سبب بنتا ہے۔ البتہ جو علم مسائل شرعیہ پر دسترس پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ سینہ کو انوار الٰہی کا گنجینہ بنا دے۔ قلب میں مشاہدے کی قوت پیدا کردے۔ طریقت کی راہ آسان کردے اور معرفت کے اسرار منکشف کردے یہ علم رحمانی ہے۔ اور یہی شرف آدم کا باعث بنا۔ یہ علم عجز وانکسار پیدا کرتا ہے۔ ریا ونمود کی خطرناک وادی پر روک کھڑی کرتا ہے۔ بندے کو رب کا طاعت گذار بناتا ہے۔ رسول کردگار کی پیروی کا راز سمجھاتا ہے۔ اور **انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء** کا تاج پہنا کر **العلماء ورثۃ الانبیاء** کی مسند پر جلوہ افروز کرتا ہے۔

بزرگان سلف سے مذکور ہے اور حضرت مخدوم جہاں نے بھی ذکر فرمایا ہے کہ سلطان التارکین سیدنا ابراہیم ادھم جو تارک سلطنت بلخ بھی تھے۔ اور متقدمین اولیاء کے سرخیل تھے۔ ایک طالب صادق نے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کیا، میں آپ سے علم طریقت کی باتیں سننے کا آرزومند ہوں۔ آپ نے فرمایا، بیٹے! میں تو خود ہی ایک مدت سے اپنے رنج والم اور سخت غم واندوہ میں مبتلا ہوں۔

شخص مذکور نے حیرت سے پوچھا، حضور ایسا کیوں؟ فرمایا، اس لئے کہ جب فرشتہ نے ماں کے پیٹ میں میری شکل مکمل کر لی تو اس نے رب تعالیٰ سے پوچھا، الٰہی اس بندہ کو سعید لکھوں یا شقی؟ نہیں معلوم اس وقت جواب کیا آیا۔ جب ملک الموت کہیں گے یارب! اس بندے کی جان سعادت پر قبض کروں یا شقاوت پر۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اس وقت کیا جواب آئے گا۔ اور قیامت کے دن جب فرشتہ رب تعالیٰ سے پوچھے گا، خدایا! اس بندہ کو بہشت کی طرف لے جاؤں یا دوزخ کی سمت۔

آہ! مجھے نہیں معلوم کہ اسے کس بات کا حکم دیا جائے گا۔

آپ کی اس دردانگیز گفتگو سے اہل مجلس کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ اور حق یہ ہے کہ اس سے بہتر طریقت کی کوئی اور بات ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ جن کے زہد وورع کا پھریرا عرش کے پرے اڑ رہا تھا اور جن کی شان فقر کی دہلیز پر ملائکہ قدس سجدہ ریز تھے۔ ان کی زبان عجز کا کلام ایسا جگرخراش جو سالکین طریقت کا پتّہ پانی کر رہا تھا۔ اب اگر ہم سرتاپا آلودۂ معصیت ہونے کے بعد بھی سینہ تان کر یہ کہیں کہ ہم کامل الایمان ہیں ہمارا بیڑا پار ہے۔ اس نعرے میں کتنی صداقت ہے۔ یہ ہمارے بتانے کی چیز نہیں۔ ہر شخص کا ضمیر اسے خود بتادے گا۔

معیاری مدارس کے ذی علم اساتذہ کو چھوڑ کر عام مدرسوں کے عام مدرسین کا حال یہ ہے کہ بازار میں ٹوپی ہاتھ میں ہے۔ اور کتنی نمازوں کا وقت آیا اور گیا۔ ایسی صورت میں طلباء کیا سیکھیں گے؟ مخصوص مساجد کے متدین ائمہ کو چھوڑ کر عام مسجدوں کے امام مسجد میں ہیں تو ڈیوٹی کی نماز کہیں اور چلے گئے تو شاید کسی وقت۔ عوام اس کا کیا اثر لیں گے۔ مقررین جبہ ودستار کے ساتھ جس کی حیثیت سپاہی اور سنتری کی وردی۔ پاٹی اور وکیل کے سیاہ کوٹ سے زیادہ کچھ نہیں ۔ اسے آپ اسٹیج کا یونیفارم کہہ لیجئے۔ عشاء کی نماز پڑھے بغیر اسٹیج پر پہونچے۔ اور اسٹیج سے اترنے کے بعد فجر کی اذان ہو رہی ہے اور ادھر مقررین کی گاڑی روانہ ہو رہی ہے۔ قوم میں کیا تأثر جائے گا اس کی پرواہ نہیں۔ روش تو ہماری یہ ہے اور نعرہ ہے، ایمان ایمان، ایمان ہے تو بیڑا پار ہے۔ یہ بھی تقدیر خفتہ کا کرشمہ ہی ہے کہ بیڑا غرق کو ہم بیڑا پار کہہ رہے ہیں۔

وائے ناکامی، متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

☆☆☆

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

آج بھی ہمارے مقررین اسٹیجوں پر گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ ہم ملک میں اسی فی صد ہیں۔ ہمارے منچلے ہر طرف یہ شور مچاتے پھر رہے ہیں کہ ''جدھر دیکھو علاقہ رضا کا ہے'' مگر ملکی حالات پر جس کی نظر ہے۔ اور جو ہندوستان کا شرق و غرب دیکھ رہا ہے۔ اس کے حساس دل سے پوچھو کہ آج ہماری جماعت کس درجہ رو بہ زوال ہے۔ ہمارے خیمے اجڑ رہے ہیں۔ ہماری مسجدیں چھن رہی ہیں۔ ہمارے جوان ہمارے حصار کو توڑ کر دوسروں کی چھاؤنیوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ہماری نفری ٹوٹ رہی ہے۔ ہماری آبادیاں سمٹ رہی ہیں۔

سرکاری محکموں پر غیروں کا قبضہ ہے۔ حج ہاؤس میں دوسرے لوگ بیٹھے ہیں۔ وقف بورڈ کا نظام ہمارے دشمنوں کے ہاتھ میں ہے۔ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ پر کسی اور کی اجارہ داری ہے۔ اردو اکیڈمیوں کی مراعات دوسروں تک پہونچ رہی ہیں۔ اسمبلی اور پارلیامنٹ کی کرسیوں پر ہمارا حریف براجمان ہے۔ قدرتی آفات کے موقعوں پر ریلیف کا فائدہ دوسرے لوگ اٹھا رہے ہیں۔ ملک کی اکثر ریاستوں کے بیشتر شہروں پر چیرمین کی کرسی دوسرے لوگ سنبھالے ہوئے ہیں اور وہ اپنی پارٹی کو سہارا دے رہے ہیں۔

عید کے بعد سے اب تک ملک کی نو ریاستوں سے میرا گذر ہو چکا ہے۔ جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا ہے اس پر آنکھیں کم اور دل زیادہ رو رہا ہے۔ دوران سفر بہت

سارے واعظین کو میں نے یہ کہتے سنا کہ جلسے اب بہت کم ہو گئے ہیں۔ آمدنی میں فرق پڑا تو جلسوں کی کمی نظر آ گئی۔ مگر یہ جلسے کیوں بند ہوئے اور کہاں کہاں بند ہوئے یہ جاننے سے قاصر ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ گاؤں اور محلے کے مالدار اور باثر افراد آپ کے خیمے سے نکل گئے اور کمزور طبقہ کو سرمایہ کی کمی نے حرکت و عمل سے باز رکھا۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ یہ جلسے اب تجارت اور دھندا بن چکے ہیں۔ ہر مقرر اور شاعر اے سی فرسٹ کلاس اور کار سے آنیکی بات کرتا ہے۔ دس سے بیس ہزار تک فیس بندھ چکی ہے جلسہ کرانے والوں کو بھی خاصی بچت اور خاطر خواہ منافع مطلوب ہوتا ہے۔ اور ان دونوں چکوں کے درمیان عوام پستے ہیں۔ اور اگر یہ گراں کاروبار قبول بھی کر لیا گیا تو نعتوں کے دوران ہلّڑ اور تقریروں کے نام پر نعرہ بازی میں رات گذر جاتی ہے۔

جلسہ گاہ سے لوٹنے والا کوئی بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ اسے کیا پیغام دے کر چلایا گیا ہے۔ اور وہ کیا کچھ سیکھ کر وہاں سے آیا ہے۔ بس یہی کہ فلاں بہت اچھا بولا اور فلاں نے بہت اچھا گایا۔ نعرے لگائے جا رہے ہیں، طوفان اٹھائے جا رہے ہیں۔ نہ نئی نسل کی ذہن سازی کی جا رہی ہے۔ نہ جماعت کے فرزندوں میں فکری بیداری پیدا کرنے کی کہیں کوئی کوشش ہو رہی ہے۔ انجام کار یہ ہے کہ ہمارے سامنے نیاز مند بیٹھنے والا جوان کل دوسرے کے خیمے میں رضا کار بن کر کھڑا نظر آتا ہے۔

یہ مفروضات نہیں ہیں۔ روشن صداقتوں کی دکھ بھری کہانی ہے۔ دن کے اجالے میں ایسے حادثات آئے دن رونما ہو رہے ہیں۔ اس کی ہزاروں مثالیں خود میری زنبیل میں موجود ہیں۔ مگر فرد کی نہیں ملت کی بات سنئے۔ ضلع گیا میں ہزاروں گھر

پر مشتمل ایک گاؤں میں پچاس برس پہلے ہر طرف سنیت کا چراغ روشن تھا۔ وہاں تبلیغیت کی وبا پہونچی اور دھیرے دھیرے پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ گاؤں کی مسجد پر اسی کا تسلط ہوگیا۔

دوسری طرف نئی آبادی میں پھر ایک مسجد کی تعمیر ہوئی۔ اکثریت کے سبب یہ مسجد بھی اس وبا سے محفوظ نہ رہی۔ آج یہ بستی ڈیڑھ ہزار گھر پر مشتمل ہے۔ چند افراد کی کوششوں سے گاؤں کے ایک کنارے پر چھوٹی سی ایک نامکمل مسجد ابھی قائم ہوئی ہے۔ لوگوں کی ملامتوں کا نشانہ بن کر کچھ افراد جان توڑ محنت کر کے اسے آباد کئے ہوئے ہیں۔ اسی ایک بستی پر منحصر نہیں ہے۔ پورے علاقے کا ہر مسلم گاؤں اسی آزار میں مبتلا ہے۔ اور ہر طرف ان کی یلغار سے سنیت کمر شکستہ ہے۔

بہ طور ثبوت صرف ایک علاقہ کی یہ نشاندہی کی گئی ورنہ بہار و جھارکھنڈ کے سینکڑوں علاقے اسی کسمپرسی کے شکار ہیں۔ ان علاقوں کا رخ ہمارے علماء نہیں کرتے۔ اگر کبھی کسی علاقے سے لوگوں نے ہمت بھی کی تو پیشہ ور مقررین سے سودا طے نہیں ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ان علاقوں میں باطل کا دفاع بھی ممکن نہیں رہا۔ جو لوگ محفوظ علاقوں میں جیتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ انفس و آفاق پر سنیت کا جھنڈا گاڑنے کیلئے نعرہ بازی ہی واحد حربہ ہے۔

ہمارے اسلاف کا سینہ درد سنیت سے لبریز تھا۔ وہ عوام کا سرمایہ بے جا صرف کرنے سے گریز کرتے تھے۔ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ سے میری موجودگی میں ایک عقیدتمند نے عرض کیا، حضور! سفر میں خادم ساتھ رکھا کریں۔ آپ نے انہیں جواب

دیا۔ جب میں تنہا سفر کر لیتا ہوں تو بیچارے جلسہ کرنے والوں پر دو آدمیوں کے سفر خرچ کا بوجھ کیوں ڈالوں۔ دیکھا آپ نے! اخلاص کی اس سے بہتر کوئی مثال مل سکتی ہے؟ حضور مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ایک مجلس میں کسی نے پوچھا! حضور! ہوائی جہاز کا سفر کیسا ہے؟ فرمایا، اچھی سواری ہے، نماز قضا نہیں ہوتی ہے۔ کچھ سمجھا آپ نے! اچھا کہنے میں بھی دین کا پہلو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ آرام دہ ہے۔ جلد سفر طے ہوتا ہے۔ فرما رہے ہیں کہ نماز قضا نہیں ہوتی ہے۔ کیا خیر کے تصور کا اس سے بہتر نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اللہ رحم فرمائے اب تو سفر کے دوران نماز ادا کرنے والے بھی خال خال ہی ملتے ہیں ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

میرے عہد اہتمام میں ایک بار حضور امین شریعت علیہ الرحمہ کا اچانک ادارہ شرعیہ آنا ہوا۔ بغیر اطلاع اچانک تشریف آوری پر میں نے تعجب کا اظہار کیا تو فرمایا، میرے علاقے میں ایک جلسہ ہے۔ دو ماہ پہلے ان بیچاروں نے دعوت دی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں گجرات کے دور دراز علاقے میں پھنس جاؤں گا اور جلسہ کی تاریخ آ جائے گی۔ جلسہ کی شرکت کیلئے احمد آباد سے بھاگ کر بذریعہ ہوائی جہاز آنا پڑا۔ چونکہ وعدہ کر چکا تھا اور ان لوگوں کی دل جوئی ضروری تھی۔

پھر فرمایا کہ جلسہ کرنے والے بیچارے ہوائی جہاز کے کرایہ کے متحمل تو ہو نہیں سکتے مگر ان کی حوصلہ افزائی کیلئے آنا ضروری تھا۔ میرا علاقہ ہے اپنا بھی تو کچھ فرض بنتا

ہے۔اس کے بعد مجھے ساتھ لیکر وہاں تک کا سفر فرمایا۔ یہ تھے ہمارے اکابر، جن کے سینے میں ملت اور جماعت کا درد کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا تھا۔ان کی ایثار بردوش زندگی کو ہم نشان راہ بنالیں تو آج بھی ہمارا سفینہ بھنور سے باہر آسکتا ہے۔

آج لوگ اپنا احتساب تو بھول بیٹھے ہیں۔ دوسروں کا جیب و گریباں جھانکتے پھر رہے ہیں۔جلسہ وجلوس جن کا محض پیشہ بن کر رہ گیا ہے وہ اس شخص سے ''حسام الحرمین'' پر تصدیق چاہتے ہیں۔جس کی دینی خدمات کا اعتراف اکابرین نے کیا ہے اور آج بھی جماعت کی بے لوث خدمات میں جس کی زندگی کا ہر لمحہ گذر رہا ہے۔ ذرا یہ طرفہ تماشا تو دیکھئے کہ ان کی شکم پروری کو کچھ نہ کہئے۔ان کی بے راہ روی پر کچھ نہ بولئے۔اس سے مسلک اعلیٰ حضرت پر آنچ آتی رہے۔سواد اعظم اہل سنت کا شیرازہ منتشر ہوتا رہے اور یہ مسلک اعلیٰ حضرت کا سودا کر کے عیش اڑاتے رہیں۔اور آپ اگر ملت کے غم میں کچھ بولے تو بس سنیت سے خارج۔

کہتے ہیں جس کو زخم محبت کچھ اور ہے
کہنے کو یوں تو گل کا بھی سینہ فگار ہے

اعلیٰ حضرت کا نام بیچنے والوں کے سامنے کاش! اعلیٰ حضرت کی عملی زندگی ہوتی۔مکاتیب اعلیٰ حضرت پڑھو۔اپنی قلمی خدمات پر معاوضہ تو کیا طلب کرتے۔اس کی کاپیاں تیار کرا کرا اپنے خرچ سے لوگوں تک بھیجتے اور مراسلت کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک وہ لوگ آپ کی رائے سے متفق نہ ہوجاتے یا آپ ان کی طرف سے بالکل مایوس نہ ہوجاتے۔ بعضوں کے پاس وفود بھی بھیجتے جن کے

اخراجات کا بار خود ہی اٹھاتے۔ مفاسد ندوہ سے خبردار کرنے کے سلسلے میں ایسی کوششوں کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

احقاق حق کی راہ میں اعلیٰ حضرت کا جہاں اخلاص عمل نظر آتا ہے وہاں آپ کا ایثار بھی دیکھا جاسکتا ہے۔کاش! جماعت کی رگوں میں خون فراہم کرنے کیلئے اعلیٰ حضرت کی قربانیوں کا عشر وعشیر جذبۂ ایثار بھی ہماری زندگی میں دیکھا جا سکتا۔مقام حیرت تو یہ ہے کہ ان شکم پروروں کے خلاف اگر کچھ بولا جائے یا لکھا جائے تو فوراً مخالف اعلی حضرت کا شور مچانا شروع کر دیتے ہیں گویا ان کے گورکھدھندوں ہی کا نام مسلک اعلیٰ حضرت ہے۔ خدا کی پناہ! عوام کالانعام اور جاہل سیٹھوں کو لوٹنے کا یہ حربہ جب تک چل رہا ہے چل رہا ہے۔کیونکہ طلب زر کے یہ حیلے بہت دنوں تک نہیں چل سکتے اور دنیا کمانے کی یہ راہیں ہمیشہ ہموار نہیں رہ سکتیں۔ایک دن تو فریب کا پردہ فاش ہونا ہی ہے۔ڈاکٹر اقبال مرحوم نے سچ کہا ہے۔

یہی شیخ حرم ہے، جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذر و دلق اُویس و چادر زہرا

☆☆☆